عظمت کے مینار

ضیاء تسنیم بلگرامی

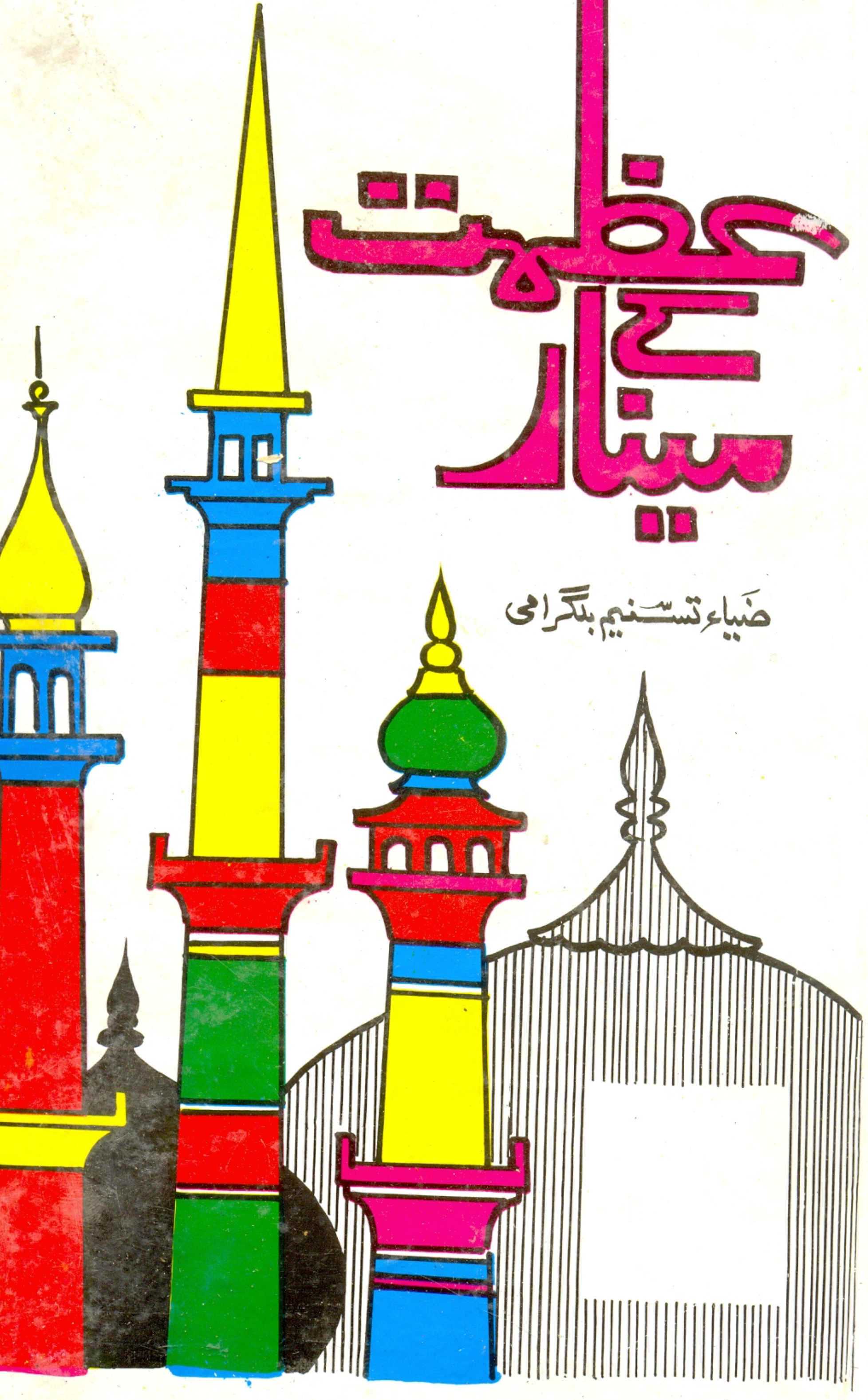

بزرگانِ دین کے اثر انگیز واقعاتِ زندگی

عظمت کے مینار

ضیاء تسنیم بلگرامی

ناشر

کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس نمبر ۲۳ کراچی نمبر ۱

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

باراوّل ———— ۱۹۸۹ء
قیمت ———— ۱۵۰/روپے

مطبوعہ

یوسف پرنٹرز۔ فاضل فلیٹس ناظم آباد نمبر ۲ کراچی نمبر ۱۸

ملنے کا پتہ

کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس نمبر 23
سعید مینشن بلموریا اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ۔ کراچی ۔ ۱

فہرست

سری سقطی	۵
عثمان ہارونی	۳۹
رابعہ بصری	۶۰
عبدالواحد بن زید	۹۲
بہاؤالدین نقشبند	۱۲۷
ابوالحسن نوری	۱۵۵
مظہر جان جاناں	۱۹۰
توکل شاہ انبالوی	۲۲۴
جنید بغدادی	۲۶۰
عبداللہ بن مبارک	۲۹۵
خواجہ بہاری	۳۲۹
دو بھائی دو ولی	۳۴۷
شیخ مادھولال حسین لاہوری	۳۶۳
شیخ حمید بنگالی	۳۸۷
خواجہ محمد صادق	۴۰۷

تلواروں سے ملک فتح کیے جا سکتے ہیں، دل نہیں
مگر جو دلوں کو فتح کر لیتے ہیں وہی فاتح زمانہ کہلاتے ہیں

دلوں کو فتح کرنے والے بزرگانِ دین کے ایمان افروز حالاتِ زندگی پر مشتمل کتاب

قیمت ۱۵۰/- روپے

پُر اسرار بندے

ڈاک خرچ ۱۸/- روپے

اس کتاب میں شامل چند مضامین کی جھلکیاں

- فرانس کی ایک خاتون خوش اطوار جو نن بننا چاہتی تھیں لیکن ولیہ کے درجے پر فائز ہوئیں
- حضرت میاں میرؒ سندھ کی سرزمین سے طلوع ہونے والا آفتاب جس نے پنجاب میں محبت کی شمعیں روشن کیں
- افریقہ کا ایک وحشی سردار جو زہد و عبدیت کے اعلیٰ درجات پر فائز ہوا۔
- زبیر بن عبداللہؒ جنہوں نے اندلس سے قرطبہ تک ہزاروں عیسائیوں کو شرفِ اسلام کیا۔
- عبدالرحمٰن ہاشمیؒ جن کی تبلیغ و کرامات سے المانا (ترکی) کی پوری ریاست مسلمان ہوگئی۔
- علی بن عونؒ ۔ الجزائر میں ایمان کی روشنی پھیلانے والے باکرامت بزرگ۔
- سعید بن سلامؒ ۔ تاریک برِ اعظم افریقہ میں روشنی بن کر طلوع ہونے والے بزرگ کے کارنامے۔
- حضرت مصعب بن حنیفؒ ۔ چین میں اسلام پھیلانے والے اولین بزرگوں میں سے ایک بزرگ کے ایمان افروز واقعات۔

ایمان میں تازگی پیدا کرنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے

اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں یا براہِ راست خط لکھیں

کتابیات پبلی کیشنز ◎ پوسٹ بکس ۲۳ کراچی ۷۴۲۰۰

سری سقطی

بغداد کے بازار میں ایک شخص کی خوردہ فروشی کی دکان تھی۔ اس دکان میں بساط خانے کے سامان کے علاوہ کھانے پینے کی چیزیں بھی مل جاتی تھیں۔ انہوں نے دکان کے پچھلے حصّے میں ایک پردہ ڈال رکھا تھا۔ یہ اکثروبیشتر اس حصے میں رہتے۔ گاہک آتے اور آواز دیتے "اے بھائی سری! کہاں چلے گئے ہ؟"

بھائی سری کی طرف سے کوئی جواب نہ ملتا۔ گاہک دوبارہ زور سے مخاطب کرتا "بھائی سری! اندر موجود بھی ہو یا نہیں ہ جواب کیوں نہیں دیتے ہ؟"

اندر سے پھر کوئی جواب نہ آتا۔ گاہک ہمت کرکے دکان میں داخل ہو جاتا اور پردے کے پیچھے جھانک کر دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ بھائی سری نماز نفل ادا فرما رہے ہیں۔ وہ انہیں ایک بار پھر مخاطب کرتا "ارے بھائی اگر تم یوں ہی نمازیں پڑھتے رہو گے تو میں خوب جانتا ہوں کہ دکانداری کر چکے!"

آپ نے یوں بے نیازی اختیار کیے رکھی، گویا گاہک کی کوئی بات سُن ہی نہیں رہے۔ گاہک عاجز آکر چلا جاتا۔

نمازِ فجر ادا کر کے آپ نے دکانداری سنبھال لی۔ ابھی دکان پر بیٹھے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک شخص دکان میں داخل ہوا۔ اس نے متجسّس نظروں سے دکان کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد انہیں مخاطب کیا "سری آپ ہی کا نام ہے؟"

آپ نے جواب دیا "ہاں سرّی میرا ہی نام ہے۔ یوں میری کنیت ابوالحسن ہے۔ کہو، مجھ سے کیا کام ہے؟"

انہوں نے کہا۔ "جناب والا! میں کوہ لگام سے حاضر ہوا ہوں، وہاں ایک عرصے سے ایک بزرگ تشریف فرما ہیں۔ انہوں نے مجھے آپ کے پاس خاص طور پر سلام کہنے کے لیے روانہ کیا ہے۔"

آپ نے کراہیت سے جوابدیا۔ "مخلوق سے منقطع ہو کر عبادت کرنا مُردوں کا کام ہے۔ میرے نزدیک زندہ وہ لوگ ہیں جو مخلوق سے وابستہ رہ کر یادِ الٰہی میں لگے رہتے ہیں۔"

اجنبی اپنا سا منہ لے کر واپس چلا گیا۔

یہ سرّی سقطی بغداد کے مشہور ترین بزرگ صوفی حضرت معروف کرخیؒ کے شاگرد و مرید تھے۔ جنید بغدادی ان کے بھانجے تھے۔ یہ سقطی اس لیے کہلائے کہ ان کا پیشہ خوردہ فروشی تھا اور عربی میں خوردہ فروش کو سقطی کہتے ہیں۔

بغداد کے بازاروں کا ایک مشہور دلّال آپ کی دکان میں داخل ہوا اور عرض کیا۔ "ابوالحسن! کیا تم باداموں کا سودا کرنا پسند کرو گے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں، میں تجارت کرتا ہوں۔ اس تجارت میں پھل کا کاروبار کروں یا خشک میووں کا کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

دلال نے کہا: "میرے کہنے سے آپ ساٹھ دینار میں باداموں کا ذخیرہ خرید لیجئے اور جب میں کہوں بیچ دیجئے گا۔ پھر دیکھیے گا کہ آپ آناً فاناً کتنا سرمایہ کما لیں گے۔"

آپ نے اُسی وقت ساٹھ دیناروں میں باداموں کا ذخیرہ خرید لیا۔

دوسرے ہی دن بادام کے دم چڑھ گئے اور ساٹھ دینار پر ایک سو ساٹھ دینار ملنے کی امید بندھی۔ دلال بھاگا بھاگا آپ کے پاس دوبارہ آیا اور خوشی سے دیوانہ وار آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ بولا: "قربان جائیے ان ہاتھوں کے، انہی سے تو آپ نے ساٹھ دینار میں باداموں کی خریدکی تھی۔ اب بفضل خدا آپ کے باداموں کا ذخیرہ ایک سو ساٹھ دینار میں بخوبی بک جائے گا، اگر آپ اجازت دیں تو میں اس ذخیرے کو کھڑے کھڑے بکوا دوں اور اگر کچھ زیادہ نفع کمانے کا ارادہ ہے تو دو چار دن اور صبر کرنا پڑے گا۔ کہیے کیا ارادے ہیں؟"

آپ نے سرد مہری سے جواب دیا: "میں نے یہ بادام اس لیئے ہرگز نہیں خریدے تھے کہ ان پر مجھے دوگنا یا تین گنا نفع کمانا ہے۔ اگر میں ایسا کروں گا تو کل قیامت میں خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ رسول اللہ ﷺ کے روبرو کیا منہ لے کر جاؤں گا؟"

دلال کا چہرہ اتر گیا۔ ان باداموں کے نفع میں اس کی دلّالی بھی شامل تھی اپنے نفع کی رقم کو مرتا ہوا دیکھ کر وہ بلبلا گیا، بولا: "تب پھر آپ تجارت کر چکے ابوالحسن! نفع کمانے کو نہ تو اللہ نے منع کیا ہے اور نہ رسول اللہ ﷺ ہی مانع آئیں گے۔ پھر یہ ڈر خوف کیسا ہے؟"

"واہ یہ کیا بات ہوئی" سری نے کہا۔ "ساٹھ دینار پر ایک سو ساٹھ دینار کمانا نفع ہرگز نہیں، یہ تو ایک قسم کی لوٹ ہے، ڈکیتی ہے، ڈاکہ زنی ہے اور

میں اس جرم کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔"

دلال نے پوچھا "اچھا جناب، اب آپ یہ بتائیے کہ آپ نے نفع کی کیا شرح رکھی ہے ؟"

آپ نے جواب دیا " دس دینار پر آدھا دینار، ساٹھ دینار پر تین دینار۔"

دلال جھنجلا گیا، چڑ کر بولا " تو جناب کر چکے کاروبار۔ میں تو آپ کو نہایت سمجھدار اور ہوشیار سمجھتا تھا لیکن آپ تو پیدل ہی نکلے۔ نفع کی یہ شرح تو چند ہی دنوں میں آپ کو کاسۂ گدائی تھما دے گی۔"

" کچھ بھی ہو، مجھے اس کی کوئی پروا نہیں لیکن یہ طے ہے کہ میں اتنی بڑی بددیانتی کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ میں لوگوں کی جیبوں پر ڈاکہ نہیں ڈال سکتا۔"

دلال غصّے میں اٹھ کھڑا ہو گیا " بس جناب! آج سے میرا آپ کا لین دین بند، نہ تو میں آپ کو آئندہ کوئی کاروباری مشورہ دوں گا اور نہ ہی کسی قسم کا تعاون کروں گا، آج سے تعلقات ختم۔"

آپ نے نہایت نرمی سے کہا " خدایا تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے ایک ایسے شخص سے بچا لیا ہے جس کا کام نفع اندوزی کے نام پر ڈاکہ زنی تھا۔"

دلال بڑبڑاتا ہوا دکان سے چلا گیا اور کچھ دُور جا کر ایک بار پھر گھوما اور زور سے کہا " ابوالحسن! تم نے میری بےعزتی کی ہے، میں اس کا بدلہ لوں گا میں ہرگز ہرگز معاف نہ کروں گا چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔"

آپ نے اسی صبر و تحمل سے فرمایا " دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تر است۔"

اس ناخوشگوار واقعے کو کئی دن گزر گئے لیکن کوئی خاص واقعہ رونما نہ ہوا۔

تقریباً ایک ہفتے بعد دلال نے آپ کی دکان سے متصل دُکان میں آگ لگادی۔ اس نے یہ سوچا تھا کہ اس طرح آپ کی دُکان بھی جل جائے گی اور اس کی دشمنی کی طرف سرّی کا خیال بھی نہیں جائے گا۔ یہ آگ آندھی کی طرح پورے بازار میں پھیل گئی اور آگ کے شعلے میلوں دور سے دکھائی دینے لگے۔ اس وقت ہوا بھی تیز تھی لوگ پانی سے لبریز برتنوں سے آگ پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن آگ ان کے قابو میں نہیں آرہی تھی اس ہنگامہ آتشزدگی میں دلال بھاگا بھاگا آپ کے گھر پہنچا اور منہ لٹکا کر افسوس سے کہا۔" ابوالحسن! افسوس کہ آج کی آتشزدگی میں نصف بازار پھُنک گیا۔ اس میں آپ کی دکان بھی جل کر خاکستر ہوگئی جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔"

آپ نے اپنے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اُوپر اٹھا دیے اور فرمایا۔ "خدایا! میں تیرا بے حد شکرگزار ہوں کہ تو نے میرا متاعِ دنیا سے پیچھا چھڑا دیا۔"

اس وقت کچھ اور لوگ بھی آپ کے پاس پہنچے۔ انہوں نے کہا۔"سرّی! ہم بازار کے آتش زدہ حصّے سے آرہے ہیں، آپ جانتے ہیں کہ وہاں ایک کیسا محیّر العقول واقعہ پیش آگیا ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔" مجھے علمِ غیب نہیں آتا، وہاں کون سا ایسا واقعہ پیش آگیا ہے جس نے تم سب کو حیران و پریشان کر دیا ہے؟"

آئے ہوئے لوگوں میں سے ایک نے کہا۔" اجی حضرت! نصف بازار پھُنک گیا۔ جلنے والی دکانوں کے بیچوں بیچ آپ کی دکان تھی۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ آپ کی دکان کی جگہ راکھ اور خاک کے سوا کچھ بھی نہ ملتا لیکن حیرت کی بات

تو یہ ہے کہ آپ کی دکان بالکل محفوظ ہے اور آگ تو آگ، ایسا لگتا ہے کہ آگ کا دھواں تک وہاں نہیں پہنچا۔ اب ہم سب اس کو کیا کہیں؟"

آپ آبدیدہ ہو گئے۔ فرمایا "لوگو! یہ مقام خوشی ہرگز نہیں، میرے لئے تو اس سے زیادہ دُکھ پہنچانے والا کوئی اور لمحہ ہو ہی نہیں سکتا۔"

ان لوگوں نے بیک آواز پوچھا "حضرت! یہ کیا فرما رہے ہیں؟ ہم سب آپ کا مطلب نہیں سمجھے۔"

آپ نے جواب دیا "بھائی! میرے غمزدہ ہونے کی وجہ بالکل واضح اور فطری ہے، کتنے افسوس کی بات ہے کہ میں اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کے مقابلے میں محفوظ رہا، جبکہ وہ اس آتشزدگی میں بالکل تباہ و برباد ہو چکے ہیں، لوگو! اب تو میں ان سے آنکھیں تک نہیں ملا سکتا۔"

لوگوں نے سوچا یہ کیا بات ہوئی، کہیں ابوالحسن ماؤف العقل تو نہیں ہو گئے۔

یہ لوگ انہی خیالوں میں الجھے ہوئے تھے کہ آپ نے بآواز بلند ارشاد فرمایا "مسلمان بھائیوں کے ساتھ نقصان میں موافقت کرنا واجبات میں سے ہے۔"

اس کے بعد آپ نے دکان کا سارا مال راہِ خدا میں لٹا دیا۔

آپ کی بزرگی اور عظمت کا چرچا گلی گلی، کوچہ کوچہ ہونے لگا۔ جہاں بھی چار ایک جا ہوتے، سری سقطی کی عظمت اور بزرگی کا ذکر چھڑ جاتا۔ صبح، دوپہر شام آپ کے در پر حاضری دی جانے لگی۔ آپ ان سے بہت کم باتیں کرتے ایک دن کسی مرید نے دریافت کیا "حضرت! یہ تو بتائیے کہ آپ نے یہ بلند مرتبہ کس طرح حاصل کر لیا؟"

آپ نے جواب دیا "عرصہ گزرا کہ میری دکان کے سامنے ایک بار مشہور

صوفی بزرگ حبیب راعی گزرے۔ میں نے انہیں کچھ دیا جس پر انہوں نے خوش ہو کر مجھے دعا دی۔ اللہ تمہیں جزائے خیر دے۔"

اتنا کہہ کر آپ نے سکوت اختیار کیا، لوگ سمجھے کہ آپ کو جو کچھ فرمانا تھا، فرما چکے لیکن خلافِ امید آپ نے بولنا شروع کر دیا..... "حبیب راعی کے بعد دوسرے دن معروف کرخی نے بچّے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔"ابوالحسن! اسے کپڑے دلا دو۔" میں نے کہا۔" یہ کون سی بڑی بات ہے ابھی لیجئے۔" اس کے بعد میں نے بچے کو اس کی پسند کے کپڑے دلا دیے اس وقت معروف کرخی نے مجھے دُعا دی۔ فرمایا۔"ابوالحسن! میری دُعا ہے کہ اللہ اموالِ دنیا کو تیرے لیے دشمن کر دے۔" پھر پیر و مرشد حضرت معروف کرخی نے فرمایا کہ ان بدبختوں سے اس طرح دور رہو جس طرح نیولے سے سانپ اور روشنی سے تاریکی بھاگتی ہے۔ اس دن سے میرا اندر روشنی سے منوّر ہے۔"

* * * * *

سرّی سقطی کے مریدوں میں ایک ایسی عورت بھی شامل تھی جس کے استغنا اور توکل کا خاص شہرہ تھا۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا جسے اس نے ایک معلّم کے پاس پڑھنے بٹھا دیا تھا۔ ایک دن یہ معلّم گھبرایا ہوا سری سقطی کے پاس آیا اور رُک رُک کر سراسیمہ لہجے میں کہنے لگا۔"حضرت! میں آپ سے کچھ عرض کرنے آیا ہوں، خدا کے لیے میری مدد فرمائیں۔"

آپ نے دریافت کیا۔"کیا ہوا؟ کھل کر عرض کرو۔"

معلم نے کہا۔"میں نے آپ کی مرید عورت کے بیٹے کو دریا کے کنارے پن چکی پر بھیجا تھا، وہ لڑکا معلوم نہیں کیوں دریا میں اُتر گیا اور شاید فن پیراکی سے نابلد تھا پانی میں ڈوب گیا۔"

اتنا کہہ کر معلم اور زیادہ سوگوار ہوگیا۔ آپ نے پوچھا ”تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟“

معلم نے جواب دیا ”حضرت! مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ یہ دلدوز خبر میں اس لڑکے کی ماں تک پہنچاؤں، اس لیے آپ سے گذارش ہے کہ یہ نازک فریضہ آپ انجام دے دیجئے۔“

آپ سوچ میں پڑ گئے۔ کچھ سکوت کے بعد فرمایا ”میں اس جگہ کو دیکھنا چاہتا ہوں جہاں وہ لڑکا ڈوب گیا۔“

معلم نے کہا ”میں آپ کو اسی وقت وہاں لیے چلتا ہوں۔“

اور اس نے اسی وقت دریا کے اس حصّے کی نشاندہی کردی جہاں لڑکا ڈوبا تھا۔ آپ نے دریافت کیا ”اس کی لاش کہاں ہے؟“

معلم نے جواب دیا ”حضرت! یہ ستم بالائے ستم ہے کہ اس کی لاش کا بھی کوئی پتہ نہیں۔“

آپ نے فکرمندی سے کہا ”بہتر ہے، اب تم گھر جاؤ، میں اس عورت کے پاس جا رہا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ اسے میں یہ اندوہناک خبر اس طرح سناؤں کہ اس کے دل کو قرار آ جائے۔“

معلم اپنے گھر چلا گیا۔ آپ سیدھے عورت کے پاس پہنچے۔ عورت نے انہیں خلافِ معمول اپنے گھر آیا ہوا دیکھ کر بے پایاں خوشی کا اظہار کیا۔ بولی ”زہے نصیب کہ حضور نے اس ناچیز کے گھر میں قدم رنجہ فرما کے اپنی خوش نصیبی پر فخر کرنے کا مجھے ایک موقع عطا فرما دیا۔“

آپ نے کہا ”اے بی بی! آج میں تیرے گھر اس لیے آیا ہوں کہ صبر کے فضائل اور صابرین کے مناقب بیان کروں۔“

عورت نے کہا "ارشاد! میں آپ کا ایک ایک لفظ سراپا ہوش وگوش سنوں گی۔"

آپ دیر تک صبر اور صابرین کے فضائل اور مناقب بیان فرماتے رہے آخر میں عورت نے کہا "اب حضرت ایک بات کی وضاحت بھی فرما دیجئے۔"

آپ نے پوچھا "کس بات کی وضاحت؟"

عورت نے کہا "یہ صبر و رضا پہ بیان فرمانے کی آخر ضرورت کیا پیش آگئی ہے؟"

آپ نے کہا "کیا تو یہ اقرار کرے گی کہ ہر اس مصیبت پر تو صبر و رضا کا دامن پکڑے رہے گی جو من جانب اللہ نازل کی گئی ہو؟"

عورت نے جواب دیا "جو امر من جانب اللہ ہو میں اسے مصیبت ہی تسلیم نہ کروں گی۔ پھر صبر و رضا کی تلقین کے کیا معنی ہیں۔"

آپ نے کہا "تیرے توکّل و استغنا کی بابت جتنا مشہور ہے تو اس میں اس سے کہیں زیادہ ہے۔"

اس کے بعد آپ نے لڑکے کے ڈوب کر ہلاک ہونے کی خبر اُسے سنا دی۔

عورت نے یقین نہ کرنے کے انداز میں سوال کیا "یعنی میرا بیٹا پانی میں ڈوب کر ہلاک ہو گیا ہے؟"

"آپ نے جواب دیا" ہاں تیرا بیٹا دریا میں ڈوب کر ہلاک ہو گیا اور افسوس کہ اس کی لاش تک لوگوں کو نہ مل سکی۔"

عورت نے مطمئن انداز میں کہا "ذرا مجھے وہ جگہ تو دکھلا دیجئے جہاں میرا بیٹا بقول آپ کے ڈوب کر ہلاک ہو گیا اور اس کی لاش تک کا پتہ نہ چل سکا۔"

آپ اس عورت کو لے کر اس جگہ پہنچ گئے جہاں معلّم لے گیا تھا۔ آپ نے ڈوبنے کی جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس جگہ کی نشاندہی کی ہے دیکھنے والوں نے۔"

عورت نے ادھر منہ کر کے آواز دی۔ "بیٹے محمد! تم کہاں ہو؟"

جواب میں بیٹے کی آواز سنائی دی۔ "ماں! میں حاضر ہوں۔"

عورت پانی میں اتر گئی۔ پانی میں ایک ہاتھ نمودار ہوا۔ عورت نے ہاتھ پکڑ لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پانی کے اندر سے بیٹے کو زندہ سلامت نکال لائی۔

سّری سقطی حیرت سے دیکھتے رہے۔ اس واقعے نے اتنی شہرت پکڑی کہ جنید بغدادی سری سقطی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سوال کیا۔ "ماموں جان! یہ کیا معاملہ تھا؟ میں اس سے کیا سمجھوں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "جنید! یہ عورت خود کو احکامِ الٰہیہ کے حُلیے سے آراستہ و پیراستہ رکھتی ہے اس کی برکت کا اس طرح ظہور ہونے لگا ہے کہ اس عورت سے متعلق جو کچھ بھی ہونے والا ہوتا ہے خدا اسے پہلے ہی مطلع کر دیتا ہے۔ اس لیے جب اسے میں نے لڑکے کے ڈوب جانے کی خبر پہنچائی تو اس نے اس پر اس لیے یقین نہیں کیا کہ اسے اللہ نے یہ خبر نہیں پہنچائی تھی چنانچہ بندوں کی پہنچائی ہوئی خبر جھوٹی ٹھہری۔ یہ اس کے توکّل و استغنا اور صبر و رضا کا بہترین انعام تھا جو اسے مل گیا۔

* * * * *

آپ مدینہ منوّرہ تشریف لے گئے۔ وہاں مسجد نبوی میں آپ کے گرد ارادت مندوں کا مجمع لگ گیا۔ ان لوگوں نے درخواست کی کہ آپ وعظ فرمائیں آپ نے وعظ شروع فرمایا۔ دورانِ وعظ ایک نوجوان مسجد میں داخل ہوا۔ وہ

نہایت قیمتی لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ساتھ چند دوست بھی تھے۔ آپ اس وقت وعظ میں فرما رہے تھے۔ "لوگو! بڑے تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ یہاں ضعیف قوی کی نافرمانی کرتا ہے۔"

اس فقرے نے نوجوان کے چہرے کا رنگ زرد کر دیا۔ وہ اسی وقت اٹھ کر چلا گیا۔

دوسرے دن وہ پھر آیا اور سلام کر کے آپ کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ آپ نے پوچھا۔ "مجھ سے کوئی کام ہے؟"

نوجوان نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "میں آپ سے ابھی بات کرتا ہوں، ذرا دو رکعت نفل ادا کر لوں۔"

اس نے دو رکعت نفلیں پڑھیں اور اس کے بعد آپ کے پاس دوبارہ آبیٹھا۔ اس نے کہا۔ "سری! میں نے کل آپ سے یہ سُنا تھا کہ یہاں ضعیف قوی کی نافرمانی کرتا ہے۔ میں اس کا مطلب نہیں سمجھا، ذرا وضاحت فرما دیجئے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "اللہ تعالیٰ سے زیادہ قوی اور بندے سے زیادہ کمزور اور کون ہو سکتا ہے لیکن تم غور کرو کہ یہ کمزور بندہ اپنے قوی آقا کی کیسی نافرمانی کرتا رہتا ہے۔"

اس نوجوان کا حال ایک بار پھر بہت بُرا ہو گیا۔ وہ اسی وقت اٹھ کر چلا گیا اور تیسرے دن اس حال میں داخل ہوا کہ اس کے جسم پر نہایت معمولی کپڑے تھے اور دوستوں میں سے ایک بھی اس کے ساتھ نہ تھا۔ اس نے آتے ہی سوال کیا۔ "سری! خدا کے لیے بتائیے کہ اپنے آقا تک کس راہ سے رسائی حاصل کروں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اگر تم عبادت کرنا چاہتے ہو تو اس کا سیدھا سچا طریقہ

یہ ہے کہ عبادت کرو۔ دن کو روزے رکھو اور رات کو نمازیں پڑھو لیکن اگر تم محض اللہ کو چاہتے ہو تو پھر اس کے سوا ہر چیز چھوڑ دو۔ مسجدوں۔ ویران مقامات یا قبرستان میں سکونت اختیار کرو۔"

وہ نوجوان اسی وقت کھڑا ہوا اور جاتے ہوئے کہا۔" سرّی! خدا کی قسم میں وہی راہ اختیار کروں گا جو مشکل ہے۔"

آپ اس کی صورت دیکھتے رہ گئے۔ چند دنوں بعد چند لڑکے آپ کے پاس آئے اور پوچھا۔" حضرت! یہاں حاکم شہر یزید کے کاتب احمد تو نہیں آئے تھے؟"

آپ نے جواب دیا۔" میں احمد کاتب سے واقف نہیں ہوں لیکن اس حلیے اور لباس میں ایک نوجوان آیا ضرور تھا۔"

لڑکوں نے پوچھا۔" وہ یہاں کیوں آئے تھے؟"

آپ نے پوری تفصیل بتا دی اور کہا۔" اس کے بعد وہ یہاں سے چلا گیا اور میں نہیں جانتا کہ کہاں گیا؟"

لڑکوں نے آزردہ لہجے میں کہا۔" جناب والا! ہم آپ کو خدا کی قسم دیے جاتے ہیں کہ وہ اب جب بھی آپ کو ملیں ہمیں اس پتے پر مطلع ضرور فرمائیں۔"

آپ نے لڑکوں سے ان کا پتہ سمجھا اور وعدہ کیا کہ وہ ضرور انہیں مطلع کر دیں گے۔

اس واقعے کو ایک سال گزر گیا۔ ایک روز عشاء کی نماز کے بعد آپ گھر میں بیٹھے تھے کہ کسی نے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ اس وقت آپ تنہا تھے آپ نے کہا۔" کون ہے؟ اندر آجاؤ!"

تھوڑی دیر بعد ایک نوجوان اندر داخل ہوا، آپ نے اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ یہ وہی نوجوان تھا۔ اس نے آپ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور کہا "سری! دعا کیجئے، جس طرح خدا نے مجھے دنیا کی غلامی سے نجات دلا دی ہے اسی طرح وہ مجھے دوزخ کی آگ سے محفوظ رکھے۔"

آپ نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک ارادت مند سے کہا "جاؤ! اس نوجوان کے گھر والوں کو مطلع کر دو کہ تمہارا آدمی آگیا ہے۔ وہ اسی وقت آکر اس سے مل لیں۔"

ارادت مند چلا گیا اور کچھ دیر بعد جب واپس آیا تو اس نوجوان کے بیوی بچے اس کے ساتھ ہی آگئے تھے۔ گود کا بچہ چند زیور بھی پہنے تھا۔ بیوی نے بچے کو شوہر کی گود میں ڈال دیا اور کہا "میاں تم نے تو مجھے جیتے جی بیوہ کر دیا اور ان بچوں کو یتیم کر دیا، اب آگئے ہو تو میں چاہتی ہوں کہ کوئی فیصلہ ہی ہو جائے۔"

نوجوان نے بیوی کو جواب دینے کے بجائے سری کی طرف دیکھا۔ شکایتاً کہا "سری! تم نے مجھ سے بے وفائی کی ہے تمہیں ایسا نہیں کرنا تھا۔"

آپ نے جواب دیا "مجھے اطلاع دینے کی قسم دی گئی تھی اس لیے میں اس امر کا پابند تھا۔"

اس نوجوان نے اپنی بیوی کو مخاطب کیا "اے نیک بخت! تو ہمیشہ میرے دل سے قریب رہی ہے اور تیرے یہ بچے مجھے جان سے زیادہ عزیز رہے ہیں لیکن میں بھی کیا کروں، اس سری نے ہی مجھ سے یہ کہا تھا کہ اگر تو اللہ کو راضی رکھنا چاہتا ہے تو اس کے سوا ہر شے سے قطع تعلق کر لے۔ میں نے ان کے کہنے پر عمل کیا اور اب جہاں پہنچ چکا ہوں وہاں سے واپسی ناممکن ہے۔"

بیوی نے جل کر کہا "اگر ایسا ہے تو یہ گود کا بچہ بھی اپنے ساتھ ہی لے جاؤ۔

بچوں کی پرورش کی ذمہ داری مجھ پر ہی نہیں تم پر بھی عائد ہوتی ہے۔"

بیوی کا خیال تھا شوہر یہ ذمہ داری کسی طرح بھی نہیں قبول کرے گا لیکن خلاف توقع شوہر نے یہ پیش کش بخوشی قبول کرلی۔ کہا۔" بہتر ہے، میں اس بچے کو اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا۔"

اس کے بعد اس نے بچے کے زیور اتار کر بیوی کے حوالے کردیئے اور اپنے کمبل میں سے ذرا سا ٹکڑا پھاڑ کر بچے کے جسم پر ڈال کر گود میں اٹھالیا، بیوی سے کہا" یہ زیور گھر لے جاؤ اور انہیں بیچ کر بھوکے ننگوں کو کھلا پلا دینا۔ یہ بچہ میرے ساتھ چلا جائے گا۔"

بیوی نے بچے کو بھی ہاتھ سے جاتے دیکھا تو مچل گئی۔ تڑپ کر بولی" قسم خدا کی، میں اپنے بچے کو اس حلیے میں تو دیکھ ہی نہیں سکتی۔"

یہ کہتے ہوئے بچے کو چھین لیا۔ شوہر نے کہا" عجیب بات ہے کہ تو نے ہی تو اس بچے کو میرے حوالے کردیا تھا اور اب تو نے ہی اسے چھین بھی لیا، آخر تو چاہتی کیا ہے؟"

" میں چاہتی ہوں کہ تم جہاں بھی جانا چاہتے ہو، چلے جاؤ، لیکن میرا ایک بچہ بھی تمہارے ساتھ نہیں جائے گا۔"

شوہر نے کہا" میں نے تو ایسی کوئی خواہش نہیں کی تھی۔ جب تو نے مجھے میری ذمہ داری یاد دلائی تو میں اسے قبول کرنے پر آمادہ ہوگیا۔"

اس تلخی میں کافی رات گزر گئی۔ نوجوان نے سَرّی کو مخاطب کیا" جناب! اس جھگڑے نے تو مجھے خدا کی یاد تک سے غافل کردیا" پھر بیوی سے کہا" اب تم بچوں کو لے کر گھر جاؤ اور مجھے اللہ کی بارگاہ میں جھک جانے کا موقع دو۔"

بیوی نے جواب دیا" میں تو ابھی یہاں سے نہیں جاؤں گی۔"

نوجوان اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بولا "اچھا اگر تم نہیں جانا چاہتیں تو نہ جاؤ، میں خود ہی چلا جاتا ہوں۔"

اس کے بعد وہ چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی بیوی بچوں نے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ سَری نے انہیں بڑی تسلیاں دیں۔ عورت نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا "سری! تمہیں اس خدا کی قسم ہے جس کی یاد اور محبت نے میرے شوہر کو تارکِ دنیا بنا دیا۔ میرا شوہر جب بھی تم سے ملنے آئے تو مجھے مطلع ضرور کر دینا۔"

آپ نے کہا "مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے کہ تم قسم دے کر مجھے مجبور کر دیتی ہو اور تمہارا شوہر اس رویے کو بالکل پسند نہیں کرتا، ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہئے، میں الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔"

عورت نے کہا "بہر حال میں تو یہ جانتی ہوں کہ تمہیں میری قسم کا پاس ضرور کرنا ہے۔"

آپ نے جواب دیا "اچھا، اس وقت تو تو چلی جا۔ میں تجھے مطلع کرنے کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔"

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

اس واقعے کو گزرے ایک عرصہ بیت گیا تھا کہ ایک رات آپ کی طبیعت میں کچھ عجیب سا انتشار پیدا ہو گیا۔ سونے کی کوشش کی تو نیند بھی نہ آئی۔ تہجد پڑھنا چاہی تو اس سے بھی محروم رہے۔ یہ کیفیت صبح تک طاری رہی، آخر بمشکل فجر کی نماز ادا کی اور پریشانی میں گھر سے باہر نکل گئے۔ دیر تک اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ آخر جامع مسجد میں داخل ہو گئے۔ وہاں کوئی واعظ بڑے جوش و خروش سے وعظ گوئی میں مشغول تھا۔ آپ یہاں سے اٹھ کر ایک طبیب کے پاس پہنچے۔ طبیب نے آپ کی کیفیت سنی تو اس کی بھی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اس نے

صاف صاف کہہ دیا: "حضرت! آپ کا مرض کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جس کی تشخیص اطبّا نہیں کر سکتے، کسی ایسے شخص سے رجوع فرمائیں جو محبت کو محبوب کی راہ بتاتا ہو۔"

آپ ایک ایسے شخص کے پاس پہنچ گئے، اس نے اضطراب اور بے چینی کا حال سُن کر جواب دیا: "سرّی! مقامِ حیرت ہے کہ جو شخص دوسروں کا علاج کرتا رہا ہو وہ آج مجھ جیسے ناچیز کے پاس آکر اپنا علاج کرانا چاہتا ہے۔"

آپ کے دل کی گدازیت ختم ہو چکی تھی اور پتھر کا ٹکڑا ہو کر رہ گیا تھا۔ آپ نے نہایت کرب سے کہا: "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں، میرا دل کسی طرح پگھل ہی نہیں رہا۔ اگر تادیر یہی حالت قائم رہی تو میں کسی کام کا نہ رہ جاؤں گا۔ میرا دم گھٹ رہا ہے، میری سانس رُکی جا رہی ہے۔"

اس شخص نے جواب دیا: "حضرت! اگر آپ میرا مشورہ قبول فرمائیں تو میں آپ کو یہ رائے دوں گا کہ سیدھے کوتوالی تشریف لے جائیں۔ وہاں لوگوں کو بڑی اذیتیں پہنچائی جاتی ہیں۔ وہاں لوگوں کو سزا پاتے دیکھ کر ضرور آپ کا دل پگھل جائے گا۔"

آپ سیدھے کوتوالی پہنچے۔ وہاں کا عبرتناک منظر بھی آپ کے دل کو گداز نہ بخش سکا۔ اس وقت آپ کا اتنا بُرا حال تھا کہ رونا چاہتے تھے لیکن دل رونے سے انکار کر رہا تھا۔ آپ کے کان میں جیسے اچانک کسی نے سرگوشی کی: "سرّی! قید خانے چل، وہاں کے مبتلائے عذاب تیرے دل کو یقیناً گداز کر دیں گے۔"

آپ قید خانے پہنچ گئے۔ قید خانے میں داخل ہوتے ہی دل بھر آیا اور آپ نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ آپ نے قید خانے میں ایک عورت

دیکھی۔ اس وقت وہ نہایت قیمتی اور خوبصورت اوڑھنی پہن تھی۔ اس کے پاس سے عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں پڑی تھیں۔ اس عورت نے بھی آپ کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں، اس نے آنکھیں بند کر لیں اور دعائیہ انداز میں گڑگڑانے لگی۔

"اے اللہ! میں پناہ مانگتی ہوں کہ بغیر گناہ کے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئی ہیں حالانکہ ان ہاتھوں نے نہ تو کبھی چوری کی ہے اور نہ خیانت کی ہے اور میرے پیر کبھی بھی گناہ کی راہ پر نہیں چلے۔ میں قسم کھا کر یقین دلاتی ہوں کہ اگر میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں تو بھی یہ تیری یاد سے غافل نہ ہوگا۔ یہ تجھ سے کسی حال میں بھی نہ پھرے گا۔"

آپ نے قید خانے کے نگران سے پوچھا "کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ کون ہے؟ کیا اس پر جنون کا دورہ پڑتا ہے؟"

نگران نے جواب دیا "حضرت! یہ ایک لونڈی ہے، اسے یہاں اس کے مالک نے بند کرایا ہے تاکہ اس کی اصلاح ہو جائے۔"

نگران کا جواب اس لونڈی نے بھی سن لیا، آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔ بولی "اللہ تیرا شکر ہے کہ لوگ مجھے دیوانہ کہنے لگے ہیں حالانکہ میں پاگل نہیں ہوں۔"

حضرت سریؒ کی آنکھیں بھر آئیں، ان آنسوؤں کو لونڈی نے بھی دیکھ لیا۔ بولی "سری! میں تمہیں خوب اچھی طرح جانتی ہوں، تم جو رو رہے ہو تو یہ رونا اس کی صفت سن کر آیا ہے اور سوچو کہ اگر کسی طرح تم اس کو پہچان لو تو تمہارا کیا حال ہو جائے گا۔"

کہتے کہتے وہ بے ہوش ہو گئی، کافی دیر بعد جب اسے ہوش آیا تو آپ

نے اسے پکارا "اے لونڈی! مجھے یہ بتا کہ تُو نے مجھے پہچانا کس طرح؟"

لونڈی نے جواب دیا "سرّی جب سے مجھے معرفت حاصل ہوئی ہے میں جاہل نہیں رہی اور جب سے وصل ہوا ہے میں ایک لمحے کے لیے بھی اس سے جُدا نہیں ہوئی۔ اس میدان میں عہدے مناصب رکھنے والے ایکدوسرے کو خوب اچھی طرح پہچانتے ہیں۔"

آپ نے کہا "میں نے تو یہ سُن رکھا ہے کہ تو کسی سے محبت کرتی ہے، تیرے محبوب کا کیا نام ہے؟"

لونڈی نے جواب دیا "وہ ذات جس نے اپنے محبوں کے ساتھ مجھ کو بھی معرفت عطا فرمائی۔ سرّی! کیا تم یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ ذات بالکل دِل کے قریں ہے، وہ ذات حدورجہ سخی ہے، وہی ہر جاندار کا پیدا کرنے والا ہے وہ حکمت والا، سخی، کریم اور بخشنے والا غفور ورحیم ہے۔"

آپ نے پوچھا "اچھا یہ بتا، یہاں تجھ کو قید کس نے کیا؟"

اس نے جواب دیا "حاسدوں نے۔" اس کے بعد وہ چیخ مار کر بیہوش ہوگئی۔ شیخ سرّی سمجھے، لونڈی جاں بحق ہوگئی ہے لیکن کچھ دیر بعد وہ خود بخود ہوش میں آگئی۔ سرّی نے قید خانے کے نگران سے کہا "بھائی! اگر تم مجھے کچھ سمجھتے ہو تو میری خواہش اور درخواست پر تم اسے رہا کر دو۔"

نگران بولا "خواہش یا درخواست مت کہیئے۔ مجھے تو حکم دیجئے، میں آپ کی بات کسی طرح بھی نہیں ٹال سکتا۔ میں اسے اسی وقت رہا کیے دیتا ہوں، بعد میں جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔"

نگراں نے اسے رہا کر دیا۔ عورت رہائی پاکر کھڑی سوچتی رہی۔ پھر سرّی سے پوچھا "اب میں پریشان ہوں کہ کہاں جاؤں؟"

سری نے جواب دیا "جہاں تیرا دل چاہے چلی جا"

لونڈی نے کہا "سری! تم میری بات نہیں سمجھ رہے، اسے چھوڑ کر میں جا بھی کہاں سکتی ہوں، میرے ساتھ یہ ستم ظریفی بھی تو ہے کہ میرے دل کے دوست نے اپنے مملوک کو میرا مالک بنا دیا ہے۔ یہاں سے میں اسی وقت کہیں جا سکتی ہوں جب میرا مالک بھی جانے کی اجازت دے دے گا اگر وہ اس پر راضی نہ ہوا تو میں صبر کر لوں گی۔"

سری اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوئے، بولے "لڑکی! خدا کی قسم، تو بہت زیادہ عقلمند اور صاحب اسرار ہے، میں تجھ سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہوں۔"

سری کی باتیں ابھی جاری ہی تھیں کہ لونڈی کا مالک بھی وہیں پہنچ گیا۔ اس نے قید خانے کے نگران سے پوچھا "میری لونڈی کہاں ہے؟"

نگران نے لونڈی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ رہی، کیا تجھے دکھائی نہیں دے رہی ہے؟"

لونڈی کے مالک نے لونڈی کو ایک نظر دیکھ کر سری کی طرف دیکھا اور تعظیماً ذرا جھک گیا، مصافحہ کیا۔ سری نے لونڈی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اے شخص! تیری تعظیم اور ادب کی میری بہ نسبت یہ لونڈی زیادہ مستحق ہے اور میں حیران ہوں کہ اس کی وہ کون سی بات ہے جس نے شکایت کا موقع پیدا کیا اور تو نے اسے قید خانے میں ڈلوا دیا۔"

مالک نے جواب دیا "اس کی ایک بات بھی ایسی نہیں جس پر آدمی حیرت زدہ نہ ہو۔ یہ نہ تو اچھی طرح کھاتی ہے نہ پیتی ہے۔ رات سونے کے لیے بنی ہے لیکن یہ سوتی ہی نہیں۔ اس کے دل میں پارے جیسی بے قراری محسوس ہوتی ہے کیونکہ

ہر وقت بے چین، مضطرب اور متفکر سی رہتی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پہ رونے لگتی ہے۔ ہر وقت نالہ و فغاں کرنا مشغلہ سا بن گیا ہے اور نالہ و فغاں کا بظاہر کوئی سبب بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ سرّی! ذرا میرے اس دُکھ پر بھی غور کیجئے کہ میں نے اسے بیس ہزار درہم میں خریدا تھا اور یہی میری کل پُونجی تھی، میں نے خریدتے وقت یہ سوچا تھا کہ میں اس سے کئی فائدے اٹھا سکوں گا لیکن، اے بسا آرزو کہ خاک شدی۔"

سرّی نے پوچھا "اس کے حسن و جمال کے علاوہ تجھے اس میں اور کیا خوبیاں نظر آئی تھیں؟"

اس نے جواب دیا "یہ بہترین گانا جانتی ہے اور آواز اس بلا کی پائی ہے کہ سننے والا اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے، میں اس کی آواز کے سوز کا بھی تو کشتہ ہوں۔"

سرّی نے پوچھا "لیکن اس کی یہ حالت کب سے ہے؟"

مالک نے جواب دیا "تقریباً ایک سال سے۔"

"وہ کس طرح؟"

مالک نے جواب دیا "ایک دن یہ عود بجا رہی تھی کہ یک لخت اس کی حالت غیر ہو گئی، اس نے پاگل پن میں عود توڑ کر ایک طرف پھینک دیا اور زار و قطار رونے لگی۔ میرے دل میں گمان گزرا کہ غالباً یہ کسی کی محبت میں مبتلا ہو گئی ہے میں نے اسے اس بدگمانی کا طعنہ بھی دیا لیکن اس نے انکار کیا۔ میں نے خاموشی سے اس کی تحقیقات کی لیکن کوئی ایسی بات نہیں معلوم ہو سکی جس سے میری بدگمانی کو تقویت پہنچتی، آخر عاجز آ کر میں نے اس سے پوچھا کہ سچ سچ بتا یہ معاملہ کیا ہے؟ اس نے دل جلے لہجے میں جواب دیا کیا تو میری باتیں سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے؟

کیا میں تیرے جواب میں سچ سچ جو کچھ کہوں گی تو اس پر یقین کرلے گا؟ میں نے کہا، ایسی بھی کیا بات ہے کہ میں تیری باتیں نہ سمجھ سکوں اور اگر تو سچ بولے گی تو سچ کا یہ قاعدہ ہے کہ یہ دل سے نکلتا ہے اور دل ہی میں گھر کرتا ہے، تجھے جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہہ دے۔ میرے جواب میں اس نے تیز تیز ذرا دل جلے انداز میں کہا، جب میں عود بجا رہی تھی۔ اس وقت خدا خود مجھ سے مخاطب ہو گیا میرا وہ گیت جو عود کے ساتھ میری زبان سے ادا ہو رہا تھا میرے لیے وعظ بن گیا اور اس بُعد کو جو میرے اور خدا کے درمیان پایا جاتا تھا خدا نے اپنے قرب میں بدل دیا اور خدا نے مجھے اپنا خاص بندہ بنالیا۔ جب مجھے خدا نے اپنی مرضی سے اپنی طرف بلا لیا تو میں اس کی اس کرم فرمائی کو کس طرح مسترد کر سکتی تھی۔ ایک طرف میں خدا کی آواز پہ لبیک کہہ رہی تھی دوسری طرف دل میں ڈر رہی تھی کہ آخر ان گناہوں کا کیا ہوگا جو ماضی میں سرزد ہو چکے ہیں لیکن رفتہ رفتہ یہ خوف یوں دُور ہو گیا کہ جس خدا نے مجھے اپنا قرب بخشا ہے وہی میرے گناہوں کو معاف بھی کر دے گا۔"

سرّی اس کی باتیں نہایت توجّہ سے سنتے رہے۔ اس عجیب و غریب لونڈی کی جو باتیں ظاہر ہو رہی تھیں ان سے اس کی عزت اور رفعت بہت زیادہ بڑھتی جا رہی تھی۔ آپ نے اس شخص سے کہا" اے شخص! اگر تو واقعی میرا احترام کرتا ہے تو میں تجھ سے جو کہوں اس پر عمل کر۔"

اس نے کہا" میں آپ کی بات ماننے کو تیار ہوں، فرمائیں!"

سرّی نے جواب دیا" میں چاہتا ہوں تو اس لونڈی کو آزاد کر دے۔"

اس شخص نے حیرت سے سرّی کو نیچے سے اُوپر تک دیکھا اور کہا" حضرت میں پریشان ہو کہ آپ یہ کیا فرما رہے ہیں، آپ کو ایسی درخواست کرتے وقت

یہ تو سوچنا ہی چاہیئے تھا کہ آپ کی یہ بات کس طرح مان لوں گا۔"

سریؒ نے پوچھا "میری بات ماننے میں آخر کون سا امر مانع ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا "حضرت! سیدھی سی بات یہ ہے کہ میں نے اس لونڈی کو بیس ہزار درم میں خریدا تھا۔ اب اتنی قیمتی شے سے میں محض آپ کے کہنے سے تو دستبردار ہونے سے رہا۔"

آپ نے کہا "میں اس کی بیس ہزار درم سے زیادہ قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں، تم اسے آزاد کرنے کی حامی تو بھرو۔"

وہ شخص بے ساختہ ہنسنے لگا، بولا "حضرت! آپ ایسی باتیں خدا کے لیے نہ کیجئے کیونکہ اگر میں زیادہ صاف گوئی سے کام لوں گا تو آپ کی شان میں گستاخی ہو جائے گی۔"

آپ نے فرمایا "اس وقت تم میری درویشانہ حیثیت کو نظر انداز کر کے بات کرو۔"

اس نے کہا "حضرت! صاف بات تو یہ ہے کہ آپ ٹھہرے ایک مرد فقیر، آپ اس کی قیمت آخر ادا کہاں سے کریں گے، ہائے ری غربت اور افلاس سبھی جانتے ہیں کہ اس سے مرد کا اعتبار چلا جاتا ہے۔"

آپ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "مگر تم پھر بھی عجلت سے کام نہ لو، کل تک میرا انتظار کرو، میں اس کی قیمت کا انتظام کرنے جا رہا ہوں، انشاء اللہ کل ملاقات ہو گی۔"

اس کے بعد سریؒ وہاں سے چلے آئے، رات تک بے حد غمگین رہے۔ ان کا دل رو رہا تھا، وہ خدا کی بارگاہ میں گر گئے اور رو رو کر عرض کرنے لگے "اے اللہ! تو خوب جانتا ہے کہ اس وقت میرے پاس ایک درم بھی موجود نہیں

اور میں نے وعدہ اتنا بڑا کر لیا ہے، تو خوب جانتا ہے کہ یہ سودا بھی میں نے تیرے ہی سہارے کر لیا ہے، خداوندا! تجھ پر میرا ظاہر اور باطن عیاں ہے اور مجھے تیری ذات پر جتنا اعتماد اور بھروسا ہے تو خوب جانتا ہے، میں نے تجھ پر اعتماد کیا ہے اس لیے کل مجھے اس لونڈی کے مالک کے سامنے شرمندہ نہ ہونے دے۔"

اس رات وہ ایک پل کے لیے بھی نہ سو سکے، بس گریہ وزاری میں لگے رہے۔ صبح ہوتے ہوتے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، آپ نے دریافت کیا۔ "کون ہے؟"

جواب ملا "آپ کے دوستوں میں سے ایک دوست۔"

"آنے کا مقصد؟" اندر سے آواز آئی۔

جواب ملا "مجھے میرے خدا نے یہاں تک آنے کا حکم دیا ہے۔"

سری نے دروازہ کھول دیا۔ انہوں نے دیکھا اور دروازے پر ایک آقا اپنے ملازموں کے ساتھ کھڑا ہوا ہے، ایک غلام کے ہاتھ میں شمع تھی۔ اس آدمی نے سری سے کہا "سری! مجھے اپنی محفل سے دور کیوں رکھنا چاہتے ہو؟"

سری نے کہا۔ میں نے تو تمہیں نہیں روکا، تم خود ہی دروازے پر رُکے ہوئے ہو، اندر کیوں نہیں آجاتے؟"

وہ شخص اندر داخل ہو گیا، آپ نے دریافت کیا "تم کیوں آئے ہو اور کون ہو؟"

اجنبی نے جواب دیا "میرا نام احمد بن مثنیٰ ہے۔ میں ایک ایسی ذات کے حکم سے یہاں آپ کے پاس آیا ہوں جو بخیل نہیں سخی ہے۔ سری! میں رات

نہایت غافل نیند سو رہا تھا کہ ایک آواز نے مجھے بیدار کر دیا، اس آواز میں دہشت بھی، حکم تھا، مجھے حکم دیا گیا کہ میں اشرفیوں کے پانچ توڑے آپ کو پہنچا دوں، اب یہ اشرفیاں حاضر ہیں قبول فرمائیں۔"

سرّی نے اشرفیاں لے لیں اور اس اجنبی کا شکریہ ادا کیا۔ آپ سیدھے قید خانے پہنچے۔ اس وقت آپ کے ساتھ وہ اجنبی بھی تھا۔ آپ نے اجنبی سے کہا "میں تمہیں یہاں اس لیے لایا ہوں کہ تم یہ بھی دیکھ لو کہ میں ان اشرفیوں کے عوض خریدنا کیا چاہتا ہوں۔"

قید خانے کے نگراں نے سری سقطی کو دیکھتے ہی کہا۔ "سری! مرحبا کہ آپ تشریف لے آئے، رات مجھے ایک غیبی آواز نے حکم دیا ہے کہ میں اس لڑکی کی رہائی میں آپ کی پوری پوری مدد کروں۔"

لڑکی نے ان سب کو دیکھا اور رونے لگی۔ اس نے سرّی سقطی کو خاص طور پر مخاطب کیا۔ "سرّی! تم نے مجھے لوگوں میں خوب اچھی طرح رسوا کر دیا۔"

اس وقت لڑکی کا مالک بھی پہنچ گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ فق تھا اور اس کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ سرّی سقطی نے اسے تسلی دی، کہا "اے شخص! مت رو، میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ اس لڑکی کو تو اس کی پوری قیمت لیے بغیر رہا کر دے۔ حسب وعدہ میں اس کی قیمت لے آیا ہوں، وہ مجھ سے لے کر اسے آزاد کر دے۔"

اس شخص نے جواب دیا۔ "سرّی! نہیں، خدا کی قسم ایسا نہیں ہو سکتا۔"

آپ نے کہا۔ "ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟ میں اس لڑکی کی قیمت میں جو کچھ دے رہا ہوں اس میں دس ہزار درہم کی زائد رقم بھی شامل ہے۔"

لڑکی کے مالک نے اسی دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ "سرّی! خدا کی قسم!

اس لڑکی کی قیمت میں پوری دنیا کی دولت بھی میرے قدموں میں ڈھیر کردیں تب بھی میں قبول نہ کروں گا۔ میں اسے خدا کے لیے آزاد کرنے پر تیار ہوں۔"

سرّی نے حیرت سے پوچھا۔ "لیکن کل تو اس کی قیمت مانگ رہا تھا، آج یہ کیسا انقلاب آگیا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "ہاں کل میں اس کی قیمت طلب کر رہا تھا لیکن رات خواب میں خدا کی طرف سے سخت جھڑکی دی گئی ہے اور تنبیہہ کی گئی ہے کہ اگر میں نے اس لڑکی کو آزاد نہ کیا تو اس کی مجھے بڑی سخت سزا دی جائے گی۔ اب میں اس حکم خداوندی کو کس طرح ٹال سکتا ہوں۔ میں اس لڑکی کو اپنی خوشی سے آزاد کر رہا ہوں تاکہ خدا کی خوشنودی حاصل کرسکوں۔"

جو اجنبی سرّی کے ساتھ آیا تھا زار و قطار رونے لگا۔ سرّی نے پوچھا۔ "آخر تو کیوں رو رہا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں اس لیے ملول ہوں کہ خدا نے جو کام مجھ سے لینا چاہا تھا، شاید اس سے وہ راضی نہیں ہوا۔ اب میں کیا کروں۔ میرے لیے یہ رقم بے کار ہے، میں اسے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔"

سرّی نے کہا۔ "خدا کے حکم کی تم نے تو تعمیل کر ہی دی تھی، اس لیے خدا اس کا تمہیں اجر بھی دے گا، اب اگر تم پسند کرو تو اس رقم کو خدا کے نام پر مستحقین میں تقسیم کردو۔"

اس نے یہ رقم اسی وقت غربا میں تقسیم کردی۔

سرّی نے لڑکی سے کہا۔ "اب تو آزاد ہے، جہاں جانا چاہے چلی جا۔"

لڑکی نے شکر آمیز نظروں سے سرّی کی طرف دیکھا اور ایک گوشے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب واپس آئی تو اس کے جسم کا قیمتی لباس دور ہو چکا تھا،

اس کی جگہ کمبل لپٹا ہوا تھا، وہ روتی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔

سریؒ بھی ان دونوں کے ساتھ واپس ہوئے، اجنبی اتنا ملول اور افسردہ تھا کہ اس صدمے نے اسے راستے ہی میں ہلاک کر دیا۔ لڑکی کا مالک مستقلاً سریؒ کی صحبت میں رہنے لگا۔ اس نے بھی درویشی اختیار کر لی۔ انہوں نے اس لڑکی کو بہت تلاش کیا لیکن اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔"

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

ایک دن ایک بڑھیا آپ کے پاس آئی اور کہا "سریؒ! شونیز نامی جگہ پہ ایک نوجوان تمہیں بہت یاد کر رہا ہے۔ میں ادھر سے گزر رہی تھی کہ اس نے مجھے آواز دی کہ اے ماں! کیا تم سریؒ کے ٹھکانے سے واقف ہو؟ میں نے جواب دیا کہ ہاں جانتی ہوں، بولو کیا کام ہے؟ اس نے کہا، "سری سے کہہ دو تمہیں ایک دیوانہ یاد کر رہا ہے خدا کے لیے جلد ملاقات کر لو!"

سری اسی وقت مقام شونیز روانہ ہو گئے، یہ ایک قبرستان تھا، یہاں ایک شخص کچی اینٹ کا تکیہ لگائے آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ آپ نے جاتے ہی سلام علیک کہا، اس نے آنکھیں کھول دیں۔ آپ نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے اپنے بیوی بچوں کو خدا کی یاد میں چھوڑ دیا تھا۔ آپ نے پوچھا "کیا حال ہے؟"

اس نے جواب دیا "سریؒ! اس وقت میں بہت پریشان ہوں اور یہ فکر مجھے پریشان کیے ہوئے ہے کہ کیا اللہ مجھے معاف کر دے گا۔ کیا میرے گناہوں سے خدا چشم پوشی کر لے گا؟"

آپ نے کہا "وہ غفور الرّحیم ہے، وہ ضرور معاف کر دے گا۔"

اس شخص نے کہا "سریؒ! جب میں حاکم شہر زبید کا کاتب تھا تو میں نے

لوگوں پر بڑے ظلم کیے تھے۔"

آپ نے کہا۔" اللہ کی طرف سے مایوس مت ہو۔"

وہ کہنے لگا۔" میں نے اپنی بیوی بچوں کے حقوق بھی ادا نہیں کیے۔ اب میں پریشان ہوں کہ وہ حقوق جو اللہ کی ذات سے متعلق ہیں خدا انہیں تو معاف کر سکتا ہے لیکن مجھ سے حقوق العباد میں جو کوتاہیاں یا مظالم سرزد ہوئے ہیں ان کا کیا بنے گا؟"

سری نے جواب دیا۔" حدیث شریف میں آیا ہے کہ جس نے خدا کی محبت میں سب کچھ ترک کر دیا اور توبہ کر لی، اس کے ساتھ قیامت میں یوں معاملہ ہو گا کہ اللہ اس کے حقداروں کو طلب کرے گا اور انہیں حکم دے گا کہ وہ اس بندے کے حق میں اپنے حقوق سے باز آجائیں وہ تامل اختیار کریں گے تو خدا فرمائے گا، اگر تم اپنے حقوق سے باز آجاؤ گے تو میں تمہیں اس کا ایسا معاوضہ ادا کروں گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔"

وہ شخص اس جواب سے بہت خوش اور مطمئن ہو گیا۔ بولا۔" اب میرے دل سے تردّد نکل گیا۔" پھر سرہانے کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔" سرّی! میرے سرہانے چند درم رکھے ہیں یہ میری حلال کی کمائی کے ہیں، میں عنقریب مرنے والا ہوں اگر میں مر جاؤں تو میرے کفن دفن کا انتظام اس حلال کی کمائی سے کر کرنا اور میری موت کی میرے گھر والوں کو خبر بھی نہ کرنا ورنہ یہ ہو گا کہ وہ لوگ میری آخری رسوم ادا کرنے آجائیں گے اور میرے کفن دفن میں حرام کی کمائی صرف ہو گی۔

سری اس کے پاس کچھ دیر ٹھہرے رہے، اس نے آنکھیں بند کر لیں اور پڑھنے لگا۔" لمثل ھذا فلیعمل العاملون (عمل کرنے والوں کو ایسے ہی

اَجر کے لئے عمل کرنا چاہیئے۔")

سرّی نے دیکھا اس کا حال غیر ہوتا جا رہا ہے یہاں تک کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے رخصت ہو گیا۔ آپ نے اس کے سرہانے سے درم نکالے اور آخری رسُوم کی تیاری کے لئے بازار روانہ ہو گئے۔ جب وہ واپس آرہے تھے تو انہوں نے لوگوں کے ایک ہجوم کو شونیز کے قبرستان کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ یہ لوگ گھبرائے گھبرائے اور ملول سے تھے۔ سرّی نے ان سے دریافت کیا۔ "لوگو! خیریت تو ہے تم لوگ پریشان کیوں ہو؟"

ان لوگوں نے جواب دیا۔ "شونیز کے قبرستان میں ایک ولی کا انتقال ہو گیا ہے ہم سب اس کی نماز جنازہ پڑھنے اور تجہیز تدفین کرنے جا رہے ہیں۔"

سرّی سقطی نے دریافت کیا۔ "تمہیں اس ولی کے انتقال کی خبر کس نے دی ہے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "ایک شخص یہ اعلان کرتا ہوا ہمارے سامنے سے گزرا کہ اگر تمہیں ایک ولی کی نماز جنازہ پڑھنا ہے اور اس کی تدفین کی رسُوم میں شرکت کرنا ہے تو اسی وقت شونیز کے قبرستان میں پہنچ جاؤ۔"

سری سقطی نے کہا۔ "اللہ اکبر، اللہ نے اسے ولی کا درجہ عطا فرما دیا، تم لوگ میرے ساتھ آجاؤ، میں بھی اسی ولی کی آخری رسُوم ادا کرنے جا رہا ہوں۔"

یہ لوگ قبرستان پہنچے اور مرنے والے کی آخری رسوم ادا کیں۔

کچھ عرصہ بعد اس کی بیوی سری سقطی کے پاس آئی اور دریافت کیا۔ "حضرت! میرے شوہر کا کوئی پتہ چلا یا نہیں ہے؟"

آپ نے موت کی اندوہناک سنانے میں ذرا تامل سے کام لیا، عورت نے کہا۔ "حضرت! آپ مجھ سے کچھ بھی نہ چھپایئے، جو کچھ معلوم ہو صاف صاف

بتا دیجئے!"

آپ نے نہایت افسوس سے کہا "تیرے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔"
عورت کی چیخ نکل گئی۔ اس نے روتے ہوئے شوہر کی قبر کا پتہ دریافت کیا۔ آپ نے کہا "میں قبر کا پتہ تو بتا سکتا ہوں لیکن مجھے خدشہ ہے کہ تو کہیں اس قبر کو پختہ نہ کرا دے۔ دوسرے یہ کہ مرنے والے کے بقول تو حرام کی رقم سے ایسی رسمیں نہ ادا کرنے لگے جس سے مرحوم کی روح کو اذیت پہنچے کیونکہ اس نے مرنے سے پہلے مجھے یہ ہدایت کی تھی کہ میں اس کی آخری رسوم یا کبھی بھی کسی رسم کی ادائی میں حرام کی کمائی میں سے کچھ نہ خرچ کرنے دوں۔"

بیوی نے رو رو کر کہا "حضرت! آپ میری بات کا یقین کریں میں کوئی بھی ایسی بات نہ کروں گی جس سے مرحوم کی روح کو شکایت پیدا ہو۔"

آپ نے اسے اس کے شوہر کی قبر پر لے جا کر کھڑا کر دیا۔ وہ غش کھا کر قبر پر گر گئی۔ دیر بعد جب ہوش آیا تو اس نے از خود رفتگی میں کہا "میرے آقا، میرے مالک! میں نے تیری زندگی میں تجھے نہیں پہچانا اور تیرے اعلیٰ مرتبے سے بے خبر اور لاعلم رہی لیکن اب مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تو کس بلند مرتبے پر فائز ہے، اب میں جب تک زندہ ہوں تیری قبر کی مجاور بنی رہوں گی اور تیری دولت خدا کی راہ میں لٹا دوں گی۔"

عورت نے جو کچھ کہا تھا اس پر حرف بہ حرف عمل کر کے دکھا دیا وہ اس قبر کی مجاور بن گئی اور سارا مال و منال خدا کی راہ میں دے ڈالا۔ سرّی اپنے گھر واپس آنے لگے تو اس عورت نے کہا "سرّی! میں خوب جانتی ہوں کہ میرے شوہر کی روحانی دنیا میں جو انقلاب آیا تھا وہ آپ ہی کے طفیل آیا تھا، کچھ مجھ پر بھی نظر کرم ہو جائے۔"

آپ نے جواب دیا "اگر تیری طلب صادق ہے تو تجھے مایوس نہیں ہونا پڑے گا کیونکہ خدا کسی کو مایوس نہیں کرتا۔"

عورت نے کہا "میری طلب صادق نہ ہوتی تو میں دنیا تج کے اس قبر کی مجاور نہ بن جاتی۔"

آپ نے جواب دیا "تب پھر تو بھی کوئی نہ کوئی مرتبہ ضرور حاصل کر لے گی۔"

اس عورت نے پوری زندگی قبر پر گزار دی اور کہا جاتا ہے کہ اس کا شمار بھی ولی عورتوں میں کیا جانے لگا۔

* * * * * *

جس لونڈی کو قید خانے سے آزاد کرایا تھا اس کا مالک بھی سری سقطی کے ساتھ ہی رہنے لگا تھا۔ آپ مختلف اطراف میں گھومتے پھرتے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تو وہ شخص بھی آپ کے ساتھ ہی تھا۔ ایک دن آپ خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے کہ قریب ہی سے کسی کی نہایت درد بھری آواز سنائی دی "اے خدا۔ تیرا دوست دنیا کا بیمار ہے اور اس کی جتنی لمبی عمر ہو جاتی ہے گویا اس کا مرض بھی اتنا ہی طویل ہوتا جا رہا ہے۔ تو نے اسے اپنی محبت کی شراب کا پیالا پلا کر بے خود کر دیا ہے اور یہی نشہ اس کے مرض کا علاج بھی ہے، میں اس نشے میں تیری طرف اس طرح متوجہ اور منہمک ہو گئی ہوں کہ کسی اور طرف میرا دھیان نہیں جاتا، میں تیری محبت میں حیران ہوں اور یہ حیرانی اس وقت تک طاری رہے گی جب تک تیرا دیدار میسر نہیں آجاتا۔"

سری اس آواز کی سمت گئے ایک جگہ انہوں نے دیکھا کہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ پڑا ہوا ہے، اس نے آنکھیں کھول دیں اور سری کو مخاطب کیا "اے سری!

خیریت سے تو ہو؟"

آپ نے جواب دیا "لبیک، خدا تجھ پر رحم کرے، تو ہے کون؟"

اس نے کہا "سری! تجاہل عارفانہ سے کام نہ لو، کیا تم واقعی مجھے نہیں پہچان سکے؟"

آپ نے کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے کہا "تیرا یہ حال کیا ہو گیا، تو تو خواب و خیال بن کر رہ گئی ہے۔"

اس نے کہا "سری! میں ہی کیا، پوری دنیا ایک خیال کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

آپ نے پوچھا "لڑکی! آج میں تجھ سے چند سوال ضرور کروں گا، امید ہے کہ تو ان کے دل لگتے جواب دے گی۔"

اس نے کہا "کیجئے سوال، میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔"

آپ نے پوچھا "قید خانے کے بعد تجھ پر کیا بیتی؟"

اس نے جواب دیا "سری! تم خود بھی عاشق ہو، ذرا یہ تو بتاؤ کہ وہ کون سی آگ ہے جو تمہیں آوارہ و سرگرداں رکھتی ہے اور ایک ہجر و فراق کے مارے غم زدہ عاشق پر زندگی بھر کیا گزرتا رہتا ہے، کیا اس سوال کا جواب میں تم سے بہتر دے سکتی ہوں؟"

آپ نے تیز اور شدید سوال کیا "لڑکی! خلق سے جدائی اور رجوع الی الحق سے تجھے حاصل کیا ہوا؟ اس سے تجھے فائدہ کیا پہنچا؟"

اس نے جواب دیا "اس سے مجھے فائدہ یہ پہنچا کہ غیر سے نفرت اور خدا سے شدید محبت ہوتی چلی گئی۔"

آپ نے کہا "احمد بن مثنیٰ جو تیری قیمت لے کر میرے پاس آئے

تھے، ان کا انتقال ہو گیا۔"

اس نے کہا "ہاں مجھے معلوم ہو چکا ہے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ خدا نے انہیں بڑا بلند مرتبہ بخشا ہے اور جنت میں وہ میرے پڑوسی ہوں گے۔"

آپ نے کہا "تیرا مولیٰ و مالک دنیا کو ترک کر کے میرے ساتھ پھر رہا ہے اور وہ اس وقت بھی میرے ساتھ ہے۔"

اس نے کہا "اچھا۔" اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ کوئی دعا مانگنے لگی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ہونٹ کچھ دیر تو حرکت کرتے رہے، اس کے بعد ساکت ہو گئے۔ آپ نے اسے پکارا لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا جب اسے ہلایا جلایا تو معلوم ہوا کہ اس کا وصال ہو چکا ہے، اس وقت اس کا مالک بھی وہاں آگیا۔ اس نے اسے مردہ جو دیکھا تو برداشت نہ کر سکا، اس کے قدموں میں گر کر اپنی جان بھی دے دی۔ آپ نے ان دونوں کو برابر دفن کر دیا۔

ان دونوں کی موت نے آپ کے دل پر گہرا اثر کیا اور آپ نے صدمے سے نڈھال ہو کر سکوت اختیار کر لیا۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

آپ کی زبان میں ایسا جادو تھا کہ لوگ اپنے آپ میں نہ رہتے دورانِ وعظ گوئی آپ پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی کہ کسی بات کا احساس ہی باقی نہ رہتا یہاں تک کہ بڑی سے بڑی اذیت پر اُف نہ کرتے۔ ایک بار آپ وعظ گوئی میں مشغول تھے کہ ایک بچھو نے آپ کے پیر پر ڈنک مارا، آپ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بچھو نے دوبارہ ڈنک مارا، پھر کوئی اثر نہ ہوا تیسری بار ڈنک مارا اور اس بار پھر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس خبر پر جنید بغدادی نے یہ تبصرہ کیا کہ سری پر تو خدا کا سایہ ہے۔ اسے کوئی بھی موذی کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ "مال دار ہمسایہ، بازاری قاری اور امیر علماء سے ہمیشہ دور رہنا چاہیئے۔"

آپ نے ایک دوسرے موقع پہ فرمایا۔" مخلوق سے کچھ طلب نہ کرتے ہوئے دنیا سے متنفر رہنے کا نام زُہد ہے۔"

آپ نے آخری دنوں میں فرمایا۔" جنید کو بُلا دیا جائے۔"

جنید کو حاضر کر دیا گیا۔ آپ نے کہا۔" میرے عزیز بھانجے! میں مرنے کے بعد بغداد کی زمین کو اپنے لیے پسند نہیں کرتا۔"

جنید نے دریافت کیا۔" یہ کیوں ؟"

آپ نے جواب دیا۔" میرا خیال ہے یہاں کی زمین مجھے پسند نہیں کرے گی اور یہاں مجھ سے حُسنِ ظن رکھنے والے بدظنی کا شکار ہو جائیں گے۔"

جنید نے سکوت اختیار کیا۔ اس وقت گرمی اپنے شباب پر تھی اور سرّی سقطی کی حالت غیر تھی، جنید نے انہیں پنکھا جھلنا شروع کر دیا لیکن آپ نے انہیں روک دیا اور کہا۔" جنید! پنکھا مت جھلو، اس سے آگ اور بھڑک اٹھے گی۔"

جنید نے روتے ہوئے دریافت کیا۔" آپ کی طبیعت کیسی ہے ؟"

آپ نے جواب دیا۔" جنید! بندہ تو مملوک ہوتا ہے اس لیے اسے کسی چیز پہ بھی قدرت حاصل نہیں ہوتی۔"

جنید نے کہا۔" کوئی نصیحت فرمایئے۔"

آپ نے جواب دیا۔" جنید! مخلوق میں رہتے ہوئے خالق سے غافل نہ ہونا۔"

یہ کہتے ہوئے آپ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

حضرت جنید بغدادی نے روتے ہوئے فرمایا" لوگو! میں نے عبادت میں کسی کو اپنے ماموں سری سقطی سے زیادہ کامل نہیں پایا۔ آپ اٹھانوے ۹۸ سال زندہ رہے اور پوری زندگی زمین پر پہلو تک نہیں رکھا۔"

آپ کے وصال کے بعد آپ کی بہن نے بتایا کہ ایک بار جب میں اپنے بھائی سے ملنے ان کے گھر گئی تو گھر میں ہر طرف کوڑا کرکٹ پڑا دیکھا۔ انہوں نے بھائی سے کہا" اگر اجازت دو تو میں گھر کی صفائی کر دوں۔"

آپ نے منع کر دیا۔ دوسرے دن بہن نے دیکھا ایک بڑی بی جھاڑو دینے میں مصروف ہیں۔ انہوں نے بھائی سے جل کر کہا" بھائی سبحان اللہ۔ مجھے تو آپ نے جھاڑو دینے کی اجازت نہ دی اور اس نامحرم سے جھاڑو دلوا رہے ہو، یہ کیا بات ہے؟"

آپ نے جواب دیا" بہن! یہ بوڑھی عورت نہیں ہے، دنیا ہے۔ یہ میرے عشق میں جلتی تھی اور مجھ سے محروم تھی، اب اس نے اللہ تعالیٰ سے چاہا کہ اپنا نصیبہ مجھ سے حاصل کرے اس لیے اسے میرے گھر کی جاروب کشی پر مامور کر دیا گیا ہے۔"

آپ کا قول ہے کہ مرد وہ ہے جو بازار میں بھی ذکر حق سے غافل نہ رہے خرید و فروخت بھی کرے لیکن یاد الٰہی سے غافل نہ ہو۔

پھر یہ بھی فرمایا۔ بہادر وہ ہے جو اپنے نفس امارہ پر غالب آجائے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ ادب دل کا ترجمان ہے۔ جو شخص اپنے نفس کی تربیت و تادیب سے عاجز رہے وہ دوسروں کو کیا ادب سکھا سکتا ہے۔

آپ کی تاریخ وفات اس قطعہ سے نکلتی ہے

شیخ سری امینِ سرِ خدا	محرم راز، واقفِ تقدیر
سال وصلش بجو ز قطب الحق	باز خواں سنِ ارتحالش میر
۲۵۰ھ	۲۵۰ھ

عثمان ہارونی

نیشاپور کے ہارون نامی قصبہ میں ایک عام گھرانے میں بچہ پیدا ہوا۔ گھر والوں نے اس کا نام عثمان رکھا۔ یہ بچّہ عام بچوّں کی طرح پرورش پاتا رہا۔ اس کی تاریخ پیدائش اور روزمرہ واقعات اور حالات پر لوگوں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی کیونکہ انہیں بچّے کے درخشاں مستقبل کا کوئی علم نہ تھا۔ یہ خاموش طبع بچّہ بڑا ہوتا رہا اور لوگ اس کی عظمتوں سے لاعلم اپنے اپنے مشاغل میں مبتلا غافل رہے۔ یہاں تک کہ یہ بچّہ جوان ہوگیا اور اس نے اپنے وطن ہارون کو خیرباد کہا اس کا خدا کی ذات میں انہماک اتنا بڑھا کہ کھانا پینا اور آرام کرنا تک حرام ہوگیا۔ عثمان نے محسوس کیا کہ وہ جس شاہراہ پر چل رہے ہیں وہاں کسی کی رہنمائی از حد ضروری ہے۔ انہوں نے ابھی تک جن صاحبان کرامت وتصوف کا ذکر لوگوں سے سنا تھا ان میں حاجی شریف زندنی کا نام سرفہرست تھا، یہ ان کی خدمت میں پہنچ گئے اور درخواست کی کہ انہیں حلقۂ ارادت میں شامل فرمالیا جائے۔

حاجی شریف زندنی نے اس نوجوان کو روح میں اُترجانے والی نظروں سے دیکھا اور سوال کیا۔ "برخوردار! یہ بتاؤ تمہیں تصوف کی بابت کتنا علم

حاصل ہے؟"

عثمان نے جواب دیا "میں اور کچھ تو نہیں جانتا لیکن میرا عمل شاید آپ کے سوال کا جواب دے سکے!"

حاجی صاحب نے پوچھا "وہ کس طرح؟"

عثمان نے کہا "میں چار چار اور پانچ پانچ فاقوں کے بعد کہیں تھوڑا سا کھانا کھا کر اپنے نفس کو تسکین دیتا ہوں اس کے علاوہ نیند کو میں نے اپنے قابو میں کر رکھا ہے۔"

حاجی صاحب نے کلاہ چہار ترکی اٹھا کر عثمان کے سر پر رکھ دی اور کہا۔ "اے عثمان! میں نہیں جانتا کہ تم کیا کرو گے لیکن اب جبکہ تم نے اپنے سر پر کلاہ چہار ترکی رکھا ہے تو اس کی آبرو بھی رکھنا!"

عثمان نے پوچھا "وہ کس طرح؟"

حاجی صاحب نے جواب دیا "اب تم پر ترکِ دنیا فرض ہو گئی ہے۔ حرص و ہوا کو ترک اور تحمل و قناعت کو اختیار کرنا پڑے گا۔ دل جس شئے کا مطالبہ کرے اس کو اس شے سے محروم کر دو، رات سونے کے لیے بنی ہے لیکن تم خود پر نیند کو حرام قرار دے لو، رات بھر ذکر الٰہی میں مشغول رہو۔ اگر تم نے میری نصیحتوں پر عمل کیا تو کل قیامت کی شرمندگی سے بچ جاؤ گے۔"

پھر قدرے تحمل و سکوت کے بعد فرمایا "اگر تم نے ایسا نہ کیا تو سمجھ لینا کہ تم اس خرقے کے مستحق نہیں تھے تم ڈاکو ہو۔"

عثمان نے ان نصیحتوں کو گرہ میں باندھ لیا اور وعدہ کیا کہ وہ اپنے پیر و مرشد کو شرمندہ نہ ہونے دیں گے۔

اس کے بعد وہ ایک بار پھر شدید محنت و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔

آپ نے سیر و سیاحت اختیار کی اور مختلف شہروں اور ملکوں کا سفر کرنا شروع کر دیا۔ آپ کے ساتھ چند دوسرے لوگ بھی تھے اور یہ وہ لوگ تھے جنہیں وقتاً فوقتاً آپ کی بزرگی اور عظمت کا علم ہوتا رہا تھا۔ دوران سفر آپ ایک ایسے گاؤں میں داخل ہوئے جہاں کے لوگ آتش پرست تھے۔ آپ نے اپنے ساتھیوں سمیت ایک گھنے درخت کے نیچے قیام فرمایا۔ شام قریب تھی۔ آپ عصر کی نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ نماز شروع کرنے سے پہلے آپ نے اپنے ایک ارادت مند شیخ فخر الدین سے فرمایا "شیخ! سامنے کے گاؤں سے آگ لے آنا رات کا کھانا اسی درخت کے نیچے تیار ہوگا۔"

ارادت مند شیخ نے جواب دیا۔ "بہتر ہے۔"

عثمان نماز پڑھنے لگے اور شیخ فخر الدین آگ لینے چلے گئے۔ گاؤں کے لوگ آتش کدے میں جمع تھے۔ پیر مغاں سات سالہ بچے کو گود میں لیے نہایت عقیدت و احترام سے آگ کے شعلوں کو دیکھ رہا تھا۔ دوسرے لوگ بھی مؤدب بیٹھے تھے۔ فخر الدین نے ان سب کو مخاطب کیا۔ "لوگو! ہم پردیسی لوگ سامنے درخت کے نیچے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہمیں تھوڑی سی آگ دے دو تاکہ ہم رات کا کھانا پکا لیں۔"

لوگوں نے شیخ کو نفرت کی نظروں سے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے جواب دیا۔ "جاہل پردیسی! کیا تم یہ نہیں جانتے کہ جس آگ کے سامنے تم کھڑے ہو یہ مقدس آتشکدے کی آگ ہے۔ ہم اس میں سے ذرا سی بھی آگ نہیں نکال سکتے۔" فخر الدین نے اصرار کیا۔ "لوگو! آگ کی تقدیس کیا ہوتی ہے ہم نہیں جانتے۔ ہمیں تو بس اتنا معلوم ہے کہ دنیا کی بہت ساری

دوسری چیزوں کی طرح یہ آگ بھی ہم انسانوں کی خادم ہے۔"
پیر مغاں ایک دم مشتعل ہوگیا۔" زبان کو قابو میں رکھ اے اجنبی شخص مقدس آگ کو انسان کا خادم کہہ کر اپنے ساتھ ہم سننے والوں کو بھی گناہگار نہ کر۔"

فخرالدین آگ کی حصولیابی پہ مصر رہے اور آتش پرست نہ دینے پہ اڑے رہے، آخر فخرالدین مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔ مغرب کا وقت قریب تھا۔ عثمان نے پوچھا۔" بابا فخرالدین آگ لائے ہو؟"
فخرالدین نے مایوسی سے جواب دیا۔" حضرت! یہ آتش پرستوں کا گاؤں ہے ان مگراہوں نے آگ دینے سے انکار کردیا۔"
آپ نے متبسم ہو کر کہا۔" ہاں، مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا کہیں گے، نماز مغرب پڑھ چکنے کے بعد میں تمہارے ساتھ ان کے پاس چلوں گا اور انشاءاللہ آگ لے کر واپس آؤں گا۔"
فخرالدین نے کہا۔" مجھے امید نہیں کہ وہ اپنے آتشکدے کی آگ آپ کو واقعی دے دیں گے۔"
کچھ دیر بعد ان سبھوں نے مغرب کی نماز پڑھی اور ادھر سے فارغ ہو کر عثمان ہارونیؒ کے ساتھ آتشکدے کی طرف روانہ ہوگئے۔ آتشکدے کے لوگوں کو ان کی آمد کا پہلے ہی علم ہوگیا۔ وہ گھبرائے کہ کہیں یہ مسلمان آتش کدے ہی کو نہ پھونک کر تباہ و برباد کریں۔ ان لوگوں نے عثمان ہارونی کی خدمت میں حاضری دی اور پوچھا۔" حضرت کی تشریف آوری کا مقصد؟"
آپ نے جواب دیا۔" بابا! ہم نے کچھ دیر پہلے بھی آپ سب کی خدمت میں اپنا آدمی بھیجا تھا اور تھوڑی سی آگ مانگی تھی، لیکن آپ لوگوں کو

دینے میں تامل ہوا اس لیے اسی آگ کی خاطر یہ ناچیز آپ سب کی خدمت میں حاضر ہوا ہے۔"

آتش پرست گھبرا گئے بولے "آگ کے دینے یا نہ دینے کا اختیار پیر مغاں کو ہے۔ براہ کرم آپ ان سے مل کر آگ طلب فرمائیں۔ ممکن ہے وہ دے دیں۔"

آپ نے پوچھا "پیر مغاں کہاں ہے؟"

جواب ملا "آتش کدے میں!"

آپ نے کہا "اچھا چلو، میں وہیں چلا چلتا ہوں۔"

کچھ ہی دیر میں یہ لوگ آتشکدے میں داخل ہو گئے۔ پیر مغاں اپنے بچّے سے آگ کی پرستش کرا رہا تھا۔ آپ نے اندر داخل ہوتے ہی پیر مغاں سے کہا "بابا! مجھے تھوڑی سی آگ درکار ہے۔ براہ کرم ذرا سی آگ دیکر ہمیں شکر گزار فرمائیں۔"

پیر مغاں نے عثمان ہارونی کو سر سے پیر تک دیکھا اور جواب دیا۔ "کیا تمہارے آدمی نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ آتشکدے کی مقدس آگ یہاں سے کہیں اور نہیں جا سکتی۔"

آپ نے ہنس کر کہا "یہ مقدس آگ کیا شے ہے؟"

پیر مغاں نے حیرت سے پوچھا "تم مقدس آگ نہیں جانتے؟"

آپ نے جواب دیا "میں جس آگ کو جانتا ہوں وہ مقدس نہیں ہوتی بلکہ خدا کی کمترین مخلوق ہوتی ہے پھر یہ تم کس مقدس آگ کی بات کر رہے ہو؟"

پیر مغاں نے نفرت سے کہا "براہ کرم مقدس آگ کو خدا کی کمترین

مخلوق مت کہو۔ اس سے ہمارے مذہبی جذبات مجروح ہوتے ہیں۔"

آپ نے اسی شان سے کہا "ارے بے وقوف انسان! ذرا یہ تو بتا کہ تو بقولِ خود اس مقدّس آگ کی کب سے پرستش کر رہا ہے؟"

پیرِ مغاں نے جواب دیا "نسلوں سے، یاد نہیں کتنی مدّت سے، کیونکہ آتش پرستی ہمارا آبائی مذہب ہے۔"

آپ نے پوچھا "اچھا اب یہ بتاؤ کہ اگر تم کسی شخص کی عمر بھر خدمت کرو تو وہ شخص اپنی عمر کے کسی بھی حصّے میں تمہاری مخالفت کرنے کی جرأت کرے گا؟"

پیرِ مغاں نے جواب دیا "کبھی نہیں، اپنی زندگی کے کسی حصّے میں بھی نہیں۔"

آپ نے کہا "اب تم خود ہی فیصلہ کر لو، جس آگ کی تم نسلوں سے پرستش کرتے چلے آ رہے ہو کیا اگر تم اس میں اپنا ہاتھ ڈال دو تو وہ تمہیں جلانے سے باز رہے گی؟"

ایسا کیونکر ممکن ہے آگ کا کام جلانا ہے وہ تو جو کوئی بھی ہاتھ ڈالے گا جلے گا۔"

آپ نے کہا "تب پھر میری بات ذرا غور سے سنو، یہ آگ اگر تمہارے ساتھ اتنی مروت بھی نہیں کر سکتی کہ تمہیں جلانے سے باز رہے تو تمہارا اس کی پرستش کرنا بے سود ہے عبث وقت گنوانا ہے۔ ادھر آ جاؤ میرے ساتھ خدائے واحد کی طرف۔ اس معبودِ حقیقی کے سایۂ عاطفت میں، جو لاشریک ہے اور جس کی عبادت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔"

پیرِ مغاں نے پوچھا "اس کا کیا ثبوت ہے کہ تمہارے خدا کی عبادت رائیگاں نہیں جاتی؟"

آپ نے جواب دیا "اس کا ثبوت ابھی لو، اسی وقت اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر لو۔"

آپ نے پیر مغاں کے بچے کو اپنی گود میں لے لیا اور پوچھا "آگ کا کیا کام ہے؟"

پیر مغاں نے جواب دیا "جلانا۔"

آپ نے کہا۔ وہ آگ جو پانی کے چھینٹوں سے بجھ جاتی ہے تمہاری معبود بنی ہوئی ہے، اس آگ کو اللہ کا حکم بے اثر کر سکتا ہے، کس طرح؟ اس کا تم سب اپنی آنکھوں سے نظارہ کر سکتے ہو۔"

پیر مغاں اور دوسرے آتش پرستوں کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ آپ نے پیر مغاں کے بچے کو اپنی گود میں اٹھا رکھا تھا آپ اسی حالت میں آتش کدے کی آگ میں داخل ہو گئے۔ آگ کے افعی شعلوں نے عثمان ہارونی کے اردگرد سانپ کے پھنوں کی طرح لہرانا شروع کر دیا۔ پیر مغاں کی جان نکل گئی کہ اس کا سات سالہ بچہ گیا اپنی جان سے، لیکن وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ بچہ نہایت اطمینان اور سکون سے اپنے باپ اور دوسرے آتش پرستوں کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا ہے عثمان ہارونی آگ کے شعلوں میں کچھ دیر تک ٹہلتے رہے اور وہیں سے پیر مغاں کو مخاطب کیا، "یہ وہی آگ ہے نا جسے تم مقدس کہتے ہو۔ اور یہ بتاتے ہو کہ اس کا کام جلانا ہے اس میں جو بھی داخل ہو گا جل جائے گا، میں اس میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔ ذرا یہ بتاؤ کہ تمہاری آگ کی گرمی کہاں گئی؟ یہ مجھے اور اس بچے کو جلاتی کیوں نہیں ہے؟"

پیر مغاں یا آتش پرستوں میں سے کسی کے پاس بھی اس کا کوئی

جواب نہ تھا۔ کچھ دیر بعد عثمان ہارونی آگ سے نکل آئے اور بچے کو پیر مغاں کی گود میں دے دیا۔ بولے "اسے خوب اچھی طرح دیکھ لو کہیں سے یہ جھلسا جھلسایا تو نہیں ہے جیسا تم سے لیا گیا تھا تمہیں ویسا ہی واپس کیا ہے۔"

پیر مغاں اور دوسرے آتش پرست اتنے دم بخود تھے کہ ان کی قوت گویائی ہی سلب ہو کر رہ گئی، وہ سب بے اختیار عثمان ہارونی کے قدموں میں گر گئے۔ بولے "حضرت! ہم سب گمراہی میں مبتلا ہیں، خدا کے لیے ہمارے دلوں میں معبود حقیقی کی شمع روشن فرما دیں۔"

آپ نے انہیں اسی وقت مسلمان کر لیا۔ آپ نے پیر مغاں کا نام عبداللہ اور اس کے سات سالہ بیٹے کا نام ابراہیم رکھ دیا۔ آتش پرستوں نے آتش کدہ بجھا دیا اور اس کی جگہ چھوٹی سی مسجد بنا ڈالی۔ آپ اس جگہ ڈھائی سال مقیم رہے اور انہیں تعلیمات اسلامی دیتے رہے۔ جب یہ یقین ہو گیا کہ وہ لوگ اسلام کی روح سمجھ چکے ہیں اور شعائر اسلامی پہ کاربند ہو گئے ہیں تو آپ نے وہاں سے دوسری جگہ کا قصد کیا۔

* * * * * *

ان دنوں آپ اپنے آبائی وطن ہارون میں قیام پذیر تھے کہ ایک اجنبی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیعت ہو جانے کی خواہش کی آپ نے اس اجنبی کو نہایت محبت سے قبول فرمایا اور ایک عرصے تک اس کی تعلیم و تربیت فرماتے رہے۔ بعد میں یہ اجنبی خواجہ معین الدین سنجری چشتی، سلطان الہند خواجہ غریب نواز کے نام سے مشہور ہوا۔ آپ خواجہ معین الدین کے ساتھ مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے دُعا کی "اے پروردگار! میرے اس درویش کو قبول فرما"!

آپ کی دُعا قبول ہوئی۔ خانہ کعبہ سے آپ مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور اپنے عظیم القدر مرید حضرت خواجہ سے کہا۔" معین الدین! شہنشاہ مرسلین کی خدمت میں سلام عرض کرو۔"

خواجہ معین الدین نے بآواز بلند عرض کیا۔" الصلوٰۃ والسّلام علیکم یاسید المرسلین، خاتم النبیّین۔"

روضۂ اقدس سے جواب ملا۔" وعلیکم السلام یا قطب المشائخ۔"

یہیں حضرت خواجہ کو خواب میں ہندوستان جانے کا حکم ملا۔

آپ دونوں بغداد چلے آئے۔ ایک دن دریائے دجلہ کے اس پار جانا تھا۔ دونوں حضرات دیر تک کشتی کے انتظار میں کھڑے رہے جب کھڑے کھڑے طبیعت اکتا گئی تو حضرت خواجہ معین الدین نے فرمایا۔" کشتی آتی نظر نہیں آتی۔ ہمیں معلوم نہیں ابھی کتنی دیر اور انتظار کرنا پڑے۔"

عثمان ہارونی نے اپنے مرید کی اکتاہٹ محسوس کرلی۔" کیا تم اسی وقت دجلہ کے اس پار پہنچنا چاہتے ہو؟"

" جی حضرت!" مرید نے جواب دیا۔" سوچنے کی بات ہے کہ اگر یہ کشتی سارا دن نہ آئی تو کیا ہم اسی طرح کھڑے رہیں گے؟"

عثمان ہارونی نے متبسم ہو کر فرمایا۔" اچھا تم اپنی آنکھیں تو بند کرلو۔"

خواجہ معین الدین نے دونوں آنکھیں بند کرلیں۔ کچھ دیر بعد آنکھیں کھول دینے کا حکم ملا۔ خواجہ نے آنکھیں کھول دیں اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ دجلہ سے اس پار کھڑے ہیں۔ پوچھا۔" حضرت! یہ کیا؟"

عثمان ہارونی نے جواب دیا۔" یہ تمہاری اکتاہٹ کا علاج تھا بس اور کچھ نہیں۔"

ایک دن آپ اپنی قیام گاہ میں تشریف فرما تھے۔ ایک شخص اچانک اندر داخل ہوا اور روتے ہوئے عرض کیا۔ "حضرت! میں تو لُٹ گیا، تباہ ہو گیا۔ کچھ مجھ ناچیز کے حق میں بھی دُعا فرمائیں!"

عثمان ہارونی نے دریافت کیا۔ "تجھے کیا پریشانی ہے؟ بیان کر!"

اس شخص نے مذبذب لہجے میں کہا۔ "میں پریشان ہوں کہ اپنی پریشانی کے لیے ایسا کون سا پیرایۂ بیان اختیار کروں کہ سننے والوں کو اس پر یقین آجائے۔"

عثمان ہارونی نے جواب دیا۔ "تو کوئی سا بھی پیرایۂ بیان اختیار کر، سچ دل سے نکل کر دل ہی میں گھر کرتا ہے۔ لفظوں کی سچائی سننے والے کے دل میں یقین کی آگ پیدا کر دیتی ہے۔"

اس شخص نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو میں یقین سے کہتا ہوں کہ میری ہر بات آپ کے دل میں اتر جائے گی۔"

اس کے بعد اس شخص نے کہا۔ "سالہا سال سے میرا بچّہ گم ہے میں نے چاروں طرف، دور دور تک تلاش کر ڈالا لیکن ناکام رہا اور اب کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کہاں تلاش کروں کہ وہ مجھے مل جائے۔"

عثمان ہارونی نے پوچھا۔ "تیرا کیا خیال ہے، تیرا لڑکا تیرے خیال میں زندہ ہے؟"

وہ شخص روہانسا ہو گیا۔ آہستہ سے بولا۔ "مجھے ذرا سا بھی یہ اعتبار نہیں کہ میرا لڑکا زندہ ہے میں نے رو پیٹ کر صبر کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ میں اور کیا کر سکتا ہوں۔"

آپ نے آنکھیں بند کر لیں۔ فرمایا۔ "تم کچھ دیر خاموش رہو، میں مراقبے

میں جاتا ہوں۔"

وہ آدمی خاموش ہوگیا۔ آپ مراقبے میں چلے گئے کچھ دیر بعد آپ نے آنکھیں دیں۔ اور فرمایا۔" لوگو! اس لڑکے کی واپسی کی خاطر فاتحہ پڑھو۔"

حاضرین نے فاتحہ پڑھی اور آپ نے مراقبے میں جاکر سکوت فرمایا۔ کچھ دیر بعد آنکھیں کھول دیں اور لڑکے کے باپ سے کہا "اے شخص! گھر پہنچ، تیرا لڑکا گھر میں واپس آچکا ہے!"

اس شخص کو یقین نہیں تھا۔ وہ مایوسی اور بے یقینی میں قدم اٹھاتا ہوا گھر میں جیسے ہی داخل ہوا اس نے گھر کے ایک گوشے میں اپنے بیٹے کو ماں کی آغوش میں دبکا روتا ہوا دیکھا۔ یہ بھی دوڑ کر بچے کے پاس پہنچ گیا اور بے چینی سے پوچھا "بیٹے! کیا تو سچ مچ آچکا ہے یا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں!"

بیٹے نے جواب دیا "باواجان! مجھے کچھ لوگ ایک جزیرے میں پکڑ کر لے گئے تھے۔ انہوں نے مجھے زنجیروں سے جکڑ دیا تھا۔ آج آپ کی شکل کے ایک بزرگ میرے پاس پہنچے اور مجھے کھڑے ہوجانے کا حکم دیا۔ زنجیروں کے بوجھ سے مجھ میں کھڑے ہونے کی طاقت نہیں تھی۔ لیکن میں تعمیل حکم میں ہمت کر کے کھڑا ہی ہوگیا۔ اس کے بعد ان بزرگ نے میری زنجیروں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ہاتھ رکھتے ہی زنجیر پانی کی طرح بہہ گئی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا "کیا تو اپنے گھر جانا چاہتا ہے؟"

میں نے خوشی خوشی عرض کیا "ہاں میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔"

ان صاحب نے مجھے آنکھیں بند کرنے کا حکم دیا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور دوبارہ جب ان بزرگ کے حکم ہی پہ آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ

میرے پاس کوئی بھی نہ تھا اور میں اپنے مکان کے دروازے پہ کھڑا تھا اس کے بعد میں اندر داخل ہوا اور ماں کے گلے سے لگ گیا۔ ابھی میں ان سے مِل ہی رہا تھا کہ آپ آ گئے۔"

٭ ٭ ٭

نصف رات گزر چکی تھی، عثمان ہارونی اپنے رب کے حضور سجدے میں پڑے معافی مانگ رہے تھے، اسی وقت کسی نے آپ کا دروازہ کھٹکھٹایا آپ نے کچھ تامل کے بعد پوچھا "کیا کام ہے؟"

انہوں نے جواب دیا "حضور والا! آپ خود سوچ لیجئے کہ اتنی رات گئے آنے والا کسی خاص کام ہی سے آپ کی خدمت میں حاضری دے گا۔"

آپ نے دروازے کھول دیے۔ ان کے سامنے اس وقت تقریباً ستر آدمی کھڑے تھے۔ آپ نے حیرت سے پوچھا "تم سب کتنے نفر ہو اس وقت؟"

ایک نے جواب دیا "ستر نفر!"

"کیا چاہتے ہو؟"

جواب دیا "ہم سب بھوکے ہیں اور اس وقت کھانے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔"

"خوب!" آپ مسکرا دیے "نصف رات کو خلاف امید ستر آدمیوں کی آمد اور پھر کھانے کی خواہش! آخر یہ سب کیا ہے؟ کیا تم لوگ میری آزمائش پر تو متعین نہیں کیے گئے ہو؟"

اس شخص نے جواب دیا "کیسی آزمائش؟ کس بات کی آزمائش؟ ہم سب بھوکے ہیں اور کھانے کے لیے حاضر ہوئے ہیں لیکن اگر آپ یہ سوچتے

ہیں کہ آپ کھانے کا انتظام فی الفور نہیں کر پائیں گے تو ہم لوگ بھی آپ کو تنگ نہ کریں گے اور واپس چلے جائیں گے۔"

"نہیں، مایوس جانے کی کوئی ضرورت نہیں، تم لوگ آئے ہو تو تمہیں کھانا بھی ملے گا۔ ذرا سی دیر کے لیے میرے پاس بیٹھو تم لوگ میں کھانا بھی منگواتا ہوں۔"

اس کے بعد آپ نے اپنے خادم کو آواز دی، خادم سویا ہوا تھا کئی آوازوں پر اس کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھیں ملتا ہوا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ "فرمائیے، کیا حکم ہے؟"

آپ نے چند کھانوں کے نام لیے اور کہا "یہ کھانے لے آؤ۔ اس کے بعد دوسرے کھانے لانا، جن کے نام میں بعد میں بتاؤنگا۔"

خادم نے آپ کی سوالیہ نظروں سے شکل دیکھنی شروع کر دی۔

آپ نے کہا "میری شکل کیا دیکھ رہا ہے، جا کر یہ کھانے لے آ۔"

خادم نے ذرا پس و پیش سے کہا "کہاں سے؟ اتنے سارے کھانے اتنے آدمیوں کے لیے؟"

آپ نے ان لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ ستّر افراد ہیں اور یہ سب کھانے کے لیے میرے پاس آئے ہیں۔ میں انہیں بھوکا کس طرح بھیج دوں۔"

خادم بہت پریشان تھا کیونکہ وہ اس گھر سے خوب واقف تھا کہ وہاں ستّر آدمیوں کا کھانا تو درکنار، ایک آدمی کا کھانا بھی موجود نہ تھا۔ خادم کی پریشانی اور تشویش سے آنے والے خوب لطف اندوز ہو رہے تھے۔

آپ نے ان سب کو مخاطب کیا "تم لوگ یہ تو جانتے ہی ہو کہ خُدا

عالم الغیب ہے اور اسے دلوں کا حال معلوم ہوتا ہے لیکن تم یہ نہیں جانتے کہ خدا کے علاوہ اس کے ان بندوں کو بھی غیب کا علم ہو جاتا ہے جن پر خدا کا خاص لطف وکرم ہوتا ہے۔ خدا انہیں بھی اپنی غیب بینی کی خوبی سے نواز دیتا ہے چنانچہ ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے میرے خدا نے مطلع کر دیا کہ تم لوگ اپنے اپنے دلوں میں کیا کیا منتیں لے کر میرے پاس آئے ہو۔"

آنے والوں میں سے ایک نے دریافت کیا۔ آپ کے خدا نے آپ کو کیا بتلایا ہے؟ آپ نے جواب دیا۔ "میرے خدا نے مجھے بتلایا کہ یہ جو ستّر لوگ تیرے پاس آئے ہیں یہ تیری آزمائش کی غرض سے آئے ہیں۔ تم لوگ منکر اسلام ہو اور میری آزمائش یوں کرنا چاہتے ہو کہ تم سب نے اپنے اپنے دلوں میں مختلف کھانوں کا خیال قائم کر لیا ہے اور ان کا زبان سے نام لیے بغیر تم مجھ سے مطالبہ کر رہے ہو۔ میں تم میں سے ایک ایک کی خواہش سے واقف ہوں اور تمہاری خواہشوں کے مطابق ہی کھانے پیش کیے جائیں گے۔" اس کے بعد آپ نے خادم کو حکم دیا۔ "جاؤ کھانے کے برتنوں میں دیکھو، وہاں تمہیں جو جو ملتا رہے ان کے لیے لاتے رہو۔"

خادم اندر چلا گیا اور ذرا سی دیر بعد مختلف قسم کے کئی کھانے لے کر حاضر ہو گیا اور ان کے آگے رکھ دیے۔

آپ نے چند آدمیوں کو یکے بعد دیگرے مخاطب کیا "تم لوگوں کا کھانا آ چکا ہے، اللہ کا نام لے کر شروع کرو۔" انہوں نے کھانا شروع کر دیا اسی طرح یکے بعد دیگرے آپ نے ان ستّر آدمیوں کو ان کی پسند کے کھانے کھلوا دیے۔ کھانا کھا چکنے کے بعد یہ لوگ شرمندہ شرمندہ سے بیٹھے رہے۔ آخر میں ندامت سے پوچھا۔ "حضرت! آپ کی بزرگی مسلّم۔

شاید اس زمانے میں آپ سے بڑا دوسرا کوئی بزرگ نہیں۔ لیکن ہم سب ایک بات ضرور جاننا چاہتے ہیں۔"

"پوچھو" آپ نے انہیں اجازت دے دی۔

ان لوگوں نے کہا۔ "اگر ہم سب مسلمان ہو جائیں تو کیا ہم بھی اس بلند مقام کو حاصل کر سکتے ہیں۔ کیا ہم بھی آپ جیسی بزرگی حاصل کر سکتے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں بے چارہ کس شمار میں ہوں۔ اگر اس کا کرم شامل حال ہو جائے تو اس سے ہزار گنا مرتبہ عطا کر سکتا ہے۔"

وہ ستّر افراد اسی وقت مسلمان ہو گئے اور ہر وقت آپ کی خدمت میں رہنے لگے۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

خواجگانِ چشت کی طرح عثمان ہارونی کو بھی سماع سے گہری دلچسپی تھی خلیفۂ وقت نے آپ کو منع کیا۔ "شیخ! آپ جانتے ہیں کہ اسلام میں سماع ناجائز ہے آپ نے اسے کس طرح جائز کر رکھا ہے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "سماع کے جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ آپ کس طرح کر سکتے ہیں؟"

خلیفہ نے کہا۔ "اگر سماع جائز ہوتا تو سید الطائفہ خواجہ جنید بغدادی سماع کو ترک نہ فرماتے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "سماع اسرارِ الٰہی میں سے ایک راز ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان ہے اس کو چھپایا نہیں جا سکتا اور کس کی مجال ہے جو مجھے سماع سے روک دے۔ میں خدائے عزوجل سے دعا گو اور امیدوار ہوں کہ وہ قیامت تک ہمارے فرزندوں،

اور مریدوں میں سماع کو برقرار اور قائم رکھے اور سماع کا مخالف ان پہ فتحیاب نہ ہو سکے۔"

خلیفہ نے حکم دے دیا۔"جو کوئی سماع سنے گا اسے دار پر چڑھا دیا جائے گا اور مجلس سماع میں گانے والوں کو قتل کرا دیا جائے گا۔"

آپ نے غصّے میں کہا۔" تو سلسلۂ سہروردیہ میں مرید ہے اس لیے سماع تجھ پر حرام ہو سکتا ہے لیکن ہمارے مرشدوں نے سماع سنا ہے اور اسے جائز رکھا ہے اس لیے میں اسے جائز رکھوں گا، اگر میں خود سماع سے توبہ کروں اور اپنے مرشدوں کی پیروی نہ کروں تو زیاں کار سمجھا جاؤں گا۔"

خلیفہ نے کہا۔"تمہیں اس سلسلے میں علماء سے مباحثہ کرنا ہو گا۔ اگر علماء سماع کے قائل ہو جائیں گے تو میں اپنا حکم واپس لے لوں گا۔"

آپ نے فرمایا۔" میں تیار ہوں تو اس مباحثے کے لیے ایک دن مقرر کر لے اور اپنی مرضی کے علماء بلوا لے۔"

خلیفہ نے ایک دن مقرر کر دیا اور اس مباحثے میں حصہ لینے کے لیے تمام جید علماء کو دربار میں طلب کر لیا۔

مقررہ دن آپ دربار میں پہنچے۔ آپ جس شان اور وقار سے دربار میں داخل ہوئے۔ خلیفہ اس سے مرعوب ہو گیا۔ علمائے کرام کی نظریں جیسے ہی عثمان ہارونی پر پڑیں وہ خوفزدہ ہو گئے۔ کچھ دیر تک دونوں ہی طرف خاموشی طاری رہی۔ آخر خلیفہ نے علماء کو حکم دیا۔" مباحثہ کا آغاز کیا جائے۔"

عثمان ہارونی نے کہا۔"میں تیار ہوں، تمہیں اجازت ہے جہاں سے چاہو مباحثہ کا آغاز کر دو۔"

لیکن علماء بدستور خاموش رہے۔

خلیفہ نے پھر کہا "مباحثہ شروع کیا جائے۔"
علماء نے یکے بعد دیگرے اپنے اپنے پہلو بدلے لیکن زبان نہ کھول سکے۔
خلیفہ نے سختی سے کہا "تم لوگ خاموش کیوں ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟"
عثمان ہارونی نے علماء سے کہا "میں نے تم سب کو اجازت دے رکھی ہے کہ جہاں سے چاہو اپنی مرضی سے مباحثے کا آغاز کر دو۔"
علماء نے خلیفہ سے عرض کیا "امیر المومنین! اس وقت ہم سب کی کچھ عجیب سی کیفیت ہو رہی ہے۔ ہمیں ایسا لگ رہا ہے گویا ہم سب جاہل ہیں اور ہمارا سارا علم ہم سے چھینا جا چکا ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم سب یقین محکم اور برہان مستحکم سے کس طرح بحث کا آغاز کریں۔"
خلیفہ نے ذرا غصے میں کہا "یہ کیونکر ممکن ہے کہ تم سارے ہی گونگے بن چکے ہو، بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔"
علماء نے خلیفہ کو تو کوئی جواب نہیں دیا۔ خلاف توقع عثمان ہارونی کے قدموں میں گر گئے اور رقت و زاری سے عرض کیا "خواجہ ہارونی! ہم لوگوں کی کیا مجال کہ سماع کو حرام قرار دیں لیکن امیر المومنین چونکہ سلسلہ سہروردیہ سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے وہ سماع کے خلاف ہیں۔ لیکن امیر المومنین کے اختلاف میں ہم نہیں شامل ہو سکتے۔ اور دربار تک آپ کے مقابل آنے کی جسارت اور گستاخی پر معافی کے طالب ہیں۔ آپ اہلِ سماع کے صدقے میں ہمیں معاف فرما دیں اور ہم لوگوں پر رحم فرمائیں۔"
آپ نے فرمایا "میں نے معاف کیا۔ میرے خدا نے معاف کیا۔"
علماء نے کہا "نہیں، اس طرح نہیں، ہم لوگوں نے اپنی زندگیاں تحصیلِ علم

یں صرف کی ہیں لیکن اس وقت بالکل کورے نظر آرہے ہیں، خدا کے لیے ہمارا علم ہمیں واپس فرمادیں۔"

خواجہ ہارونی نے فرمایا "نادانو! تم لوگ سماع کی قدر کیا جانو! میرے لیے خواجہ جنید بغدادی کا سماع ترک فرمانا حجت نہیں ہوسکتا کیونکہ ہمارے مرشد برابر سنتے رہے ہیں ان میں سے کسی ایک نے بھی سماع کو ترک نہیں کیا لیکن اس کے برعکس خواجہ بغدادی کے مرید ارشد خواجہ شبلی، ہمارے خواجہ ابو یوسف چشتی کی مجلس سماع میں اکثر شریک ہوتے رہے ہیں اور حالتِ سماع میں نعمتوں سے مالا مال ہوتے رہے"

اس کے بعد آپ نے خلیفہ وقت کو مخاطب کیا "ہمارے خواجہ ابو احمد چشتی کے زمانے میں فضل برمکی نے بھی سماع پر اسی طرح کا اعتراض کیا تھا اور اس نے اس کی جیسی سزا بھگتی ہم سب اس سے واقف ہیں۔ کیا تم لوگوں کو بھی حصولِ بلا کی تمنا ہے اور یہ چاہتے ہو کہ چشتیوں کے برہان ظاہر کر دیے جائیں اور تم بھی ان کے اثر میں آکر مصائب جھیلو۔"

خلیفہ کے بجائے علماء نے عرض کیا "حضرت! اس سے بڑھ کر اور کیا مصیبت ہوگی کہ ہم سب اپنے علوم سے محروم ہو گئے ہیں۔ آپ نہیں جانتے کہ ہم پر کیا گزر رہی ہے۔ ہم نے برہان چشتیہ کا مزہ چکھ لیا ہے خدا کے لیے اب رحم فرمالیں۔"

آپ نے علماء کو محبت کی نظروں سے دیکھا اور انہیں صاف محسوس ہونے لگا کہ ان کے سارے علوم ان کے دل و دماغ پر دوبارہ نزول کر رہے ہیں۔ ذرا سی دیر میں ان کا سارا سلب زدہ علم انہیں واپس مل گیا اور انہیں مزید یہ عطا ہوا کہ فرش سے عرش تک انہیں ایک روشنی

سی نظر آنے لگی۔ علماء کا دل دنیا سے بیزار ہو گیا۔ ان لوگوں نے اعلان کیا۔" اب ہم سب پر دنیا حرام ہو چکی ہے اور ہم سب خواجہ ہارونی کی خدمت میں رہنا اپنی سعادت سمجھیں گے۔ خلیفہ خود بھی آپ سے اتنا مرعوب ہو چکا تھا کہ اس کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس نے کہا۔ "میں خواجہ ہارونی کو سماع سے نہیں روک سکتا۔ آپ کو سماع سننے کی اجازت ہے۔ میں اپنا سابقہ حکم واپس لیتا ہوں۔"

خواجہ ہارونی اپنے گھر واپس آگئے اور قوالوں کو طلب کیا اور متواتر سات دن تک سماع سنتے رہے۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

خواجہ ہارونی نے اپنے مرید اور خلیفہ خواجہ معین الدین چشتی سے ملنے کا ارادہ کیا اور ہندوستان کے لیے روانہ بھی ہوئے لیکن ہندوستان نہیں جا سکے۔ آپ مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور وہیں مستقلاً اقامت اختیار کی۔ یہاں بھی آپ کے آس پاس ارادت مندوں اور عقیدتمندوں کا مجمع رہنے لگا۔ آپ جو کچھ بھی فرماتے لوگ اسے محفوظ کر لیتے۔

آپ نے ایک موقع پر فرمایا۔" علم کی دو قسمیں ہیں۔"

کسی مرید نے پوچھا۔" وہ کون کون سی ہے"

آپ نے جواب دیا۔" ایک علم تو وہ ہے جو خدائے ذوالجلال کے لیے حاصل کیا جائے اور دوسرا وہ جو بہ طریق عوام حاصل کیا جائے۔" مزید فرمایا۔" اسی طرح عمل کی بھی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ عمل جو خاص اللہ کے لیے کیا جائے یہ خواص کا عمل ہے۔ دوسرا عمل وہ ہے جو لوگوں کے لیے کیا جائے یعنی محض نمائش کے طور پر۔ اس عمل کا کوئی اجر نہیں محض

بیکار ہوتا ہے۔"

ایک دوسرے موقع پر فرمایا "ایمان بھی دو طرح کا ہوتا ہے۔"

کسی نے دریافت کیا۔ "دو کون کون سے ہے؟"

آپ نے جواب دیا "ایک ایمان تو یہ ہے کہ بندہ اپنی زبان سے تو اقرار کر لے لیکن دل میں شبہ رکھے۔ یہ منافقوں کا ایمان ہے۔ دوسرا ایمان یہ ہے کہ زبان اور دل دونوں ہی سے اقرار کیا جائے۔ یعنی جو کچھ زبان سے کہے دل میں بھی اس کا یقین موجود ہو کہ ہاں ایسا ہی ہے اور یہ دوسرا ایمان نیک لوگوں کا ایمان ہے۔"

کسی اور موقع پر فرمایا "مومن وہ ہے جو تین چیزوں کو دوست رکھے۔ موت۔ فاقہ کشی اور درویشی۔ حلال کھاؤ۔ حلال کمائی کا لباس پہنو اور توبہ کرتے رہو۔" مزید فرمایا "حسد سے بچتے رہو، یہ بہت ہی بڑی چیز ہے، اسے اپنے دل میں مت بسنے دو۔"

ایک اور موقع پر فرمایا "مرد وہ ہے جو اللہ کے سوا کسی پر نظر نہ رکھے اور دنیا و آخرت میں نہ مبتلا ہو۔"

آپ کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ آپ مکہ معظمہ میں دفن ہوں چنانچہ شوال کی سولہ تاریخ ۶۱۷ھ میں جب آپ کا انتقال ہوا تو آپ کو کعبہ اور جنت المعلیٰ کے درمیان دفن کیا گیا۔ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک سے پہلے تک ان کے مزار کے آثار موجود تھے لیکن جب قبروں کے نشانات مٹائے جانے لگے تو ان میں آپ کے مزار کو بھی زمین کے برابر کر دیا گیا۔ اور آج خواجہ عثمان ہارونی کا نام عالم تصوف میں سورج کی

طرح چمک رہا ہے اگر ان کی قبر کا نشان باقی نہ رہا تو کوئی بات نہیں کیونکہ مزار کی حیثیت ایک تودہ خاک کے سوا اور کیا ہے اصل چیز تو ان کا روحانی تصرّف اور کمال ہے جو آج بھی جاری ہے اور خواجہ معین الدین چشتی غریب نواز اور ان کے خلفا کا جب اور جہاں بھی ذکر آئے گا، خواجہ عثمان ہارونی کی عظمت کا قائل اور معترف ہو جانا پڑیگا۔

رابعہ بصری

۹۷ھ کی ایک تاریک رات میں بصرہ کے ایک غریب گھر میں بڑی بے چینی پائی جاتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی تین بچیاں برابر برابر لیٹی ہوئی گہری نیند کے مزے لوٹ رہی تھیں۔ ان کا باپ اسماعیل اپنی بیوی کے پاس کھڑا بڑی بے بسی سے اسے دیکھ رہا تھا لیکن اندھیرے کی وجہ سے وہ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح نہیں دیکھ سکتے تھے۔ گھر میں نہ تو تیل تھا کہ چراغ جلایا جاسکتا اور نہ ہی کوئی اور چیز کہ تیل کی جگہ اس سے کام لے لیا جاتا۔

بیوی کا درد کے مارے بڑا بُرا حال تھا۔ اس نے اپنے شوہر سے کہا۔" اسماعیل! اگر تم دایہ کا انتظام نہیں کر سکتے تو نہ سہی لیکن کسی طرح، کہیں سے کچھ تیل ہی مانگ لاؤ کہ اندھیرا تو دُور ہو، مجھے تو اس اندھیرے میں بڑی وحشت ہو رہی ہے۔ معلوم نہیں میں زندہ بھی رہوں گی یا مَر جاؤں گی۔"

شوہر نے حسرت سے کہا" گھبراؤ مت، خدا بڑا مہربان اور رحم والا ہے، وہ ہمارا امتحان لے رہا ہے۔"

بیوی نے درد سے کراہتے ہوئے کہا" کیا تم پڑوس سے تیل مانگ کر نہیں لا سکتے؟"

شوہر نے کسی قدر تامّل سے جواب دیا" مانگ کر تو لا سکتا ہوں لیکن رات زیادہ ہو چکی ہے، میرا خیال ہے پڑوسی بھی سو گئے ہونگے۔"

بیوی کا تکلیف سے بہت بُرا حال تھا۔ منہ بناتے ہوئے کہا" اسماعیل! مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں مَر جاؤں گی۔" اس کے بعد اپنی سوئی ہوئی بچیوں

کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میرے بعد ان کا کیا ہوگا؟"

شوہر نے جواب دیا "خدا بڑا کارساز ہے، یہ باتیں ہمارے سوچنے کی نہیں ہیں، تم مت گھبراؤ اور اپنے خدا پر یقین رکھو۔ اور پھر ایسے معاملات پر غور کرنے سے کیا حاصل جو ہمارے اختیار میں نہیں ہیں۔"

بیوی نے درد و اذیّت سے اپنے ہونٹ بھینچ لیئے، بولی "لیکن سوچ پر قفل ڈال دینا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میں یہ سب کچھ خود بخود سوچنے پر مجبور ہوں، میں جاندار ہوں، پتھر نہیں ہوں، جو بے جان اور بے حس ہوتا ہے۔"

درد کی ایک لہر نے بیوی کو مدہوش سا کر دیا، بڑی بے بسی سے کہا "خدا کے لیئے ذرا سے تیل کا انتظام کرو، میرا اس تاریکی میں دم گھٹ رہا ہے۔"

اسماعیل نے بے دلی سے اُٹھتے ہوئے کہا "دیکھو میں کوشش کرتا ہوں، شاید کام بن جائے۔"

وہ دردِ زہ میں تڑپتی ہوئی بیوی کو چھوڑ کر باہر چلا گیا اور ایک پڑوسی کے دروازے پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہر طرف سکوت اور خاموشی کا عالم طاری تھا۔ اندھیرا اور خاموشی۔ اسماعیل کا دل بھر آیا۔ اس نے اپنے رب سے عرض کیا "خدایا! تو اچھّی طرح جانتا ہے کہ میں نے آج تک کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ آج میری بیوی کا دردِ زہ سے بہت بُرا حال ہے، گھر میں ذرا سا تیل بھی نہیں کہ روشنی کی جا سکے۔ بیوی مصر ہے کہ میں کسی پڑوسی کے سامنے دستِ سوال دراز کروں۔ لیکن تو میرے استغنا اور میری قانع اور راضی بہ رضا طبیعت سے خُوب واقف ہے

تو ہی بتا، میں کسی سے کچھ کس طرح مانگ سکتا ہوں۔ اے اللہ! تُو میری اور میری بیوی کی مشکل دستِ طلب دراز کرائے بغیر ہی حل کرا دے۔"

اسماعیل دروازے پہ دستک دیے بغیر ہی واپس آگیا اور بیوی سے کہا "افسوس کہ میں جھُوٹ نہیں بول سکتا۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ دروازے پہ دستک دے کر ذرا سا تیل مانگ لُوں لیکن ہمّت ہی نہ پڑی۔"

اب بیوی کا درد سے بہت بُرا حال تھا۔ کراہتے ہوئے کہا "بہتر ہے مَیں صبر و شکر سے کام لُوں گی، اے کاش! اس بار لڑکا ہو، کیونکہ تین لڑکیاں تو پہلے ہی سے موجود ہیں۔"

کچھ دیر بعد کسی دایہ کے بغیر ہی ایک نیا وجود دنیا میں آگیا۔ بچّے کے رونے کی آواز نے اسماعیل کو خوشی سے دیوانہ کر دیا۔ بیوی پر بیہوشی طاری ہو رہی تھی، وہ خُدا جو مہربان اور رحیم بھی ہے۔ اس نے ان دونوں پر رحم کیا تھا۔ اسماعیل ڈرا سہا بیوی کی طرف بڑھا۔ وہ یہ جاننے کے لیئے بے چین تھا کہ یہ نیا وجود لڑکی ہے یا لڑکا۔ اور جب یہ معلوم ہوا کہ پیدا ہونے والی لڑکی ہے تو اسماعیل کو چکّر سا آگیا۔

بیوی نے نحیف آواز میں پوچھا "کیا ہے؟ لڑکی یا لڑکا؟"

اسماعیل نے آواز میں خوشی اور طمانیت کا تاثّر بھرنا چاہا اور جواب دیا "لڑکی۔ ہمارے رسولِ مقبولؐ کے بھی تو کئی لڑکیاں تھیں۔"

بیوی نے زبردست ہنسنے کی کوشش کی، کہا "میں لڑکی کو ناپسند تو نہیں کرتی۔ یہ بھی خدا کی دین ہے، اس نے جو کچھ دے دیا میں اس پر اس کی شُکر گزار ہوں۔"

یہ لڑکی چونکہ تین لڑکیوں کے بعد پیدا ہوئی تھی اس لیئے اسماعیل نے اس کا نام رابعہؒ (چوتھی) رکھ دیا۔

اسماعیل نے خواب میں دیکھا۔ رسول اللہ صلعم تشریف لائے ہیں اور اسماعیل سے کہہ رہے ہیں " اسماعیل! مت پریشان ہو، تیری یہ بچیؓ جس کا تو نے رابعہؒ نام رکھا ہے، بہت زیادہ مقبولیت حاصل کرے گی اور اس کی شفاعت سے ایک ہزار افراد بخشے جائیں گے"

اسماعیل نے کہا " یا رسولؐ اللہ! عسرت اور تنگدستی نے مجھے بہت زیادہ پریشان کر رکھا ہے۔ اور مَیں کسی کے آگے دستِ طلب بھی نہیں دراز کر سکتا"

رسول اللہؐ نے جواب میں فرمایا " تو والیٔ بصرہ کے پاس یہ تحریر لے کر چلا جا کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے، تو ہر روز مجھ پر ایک سو بار درُود بھیجتا ہے اور جمعہ کی شب چار سو بار۔ لیکن آج جمعہ کی شب تُو درود بھیجنا بھُول گیا ہے۔ لہٰذا کفّارے کے طور پہ حامل ہذا کو چار سو دینار دے دے"

بیداری کے بعد اسماعیل پہ رقّت طاری ہوگئی۔ دیر تک رونے کے بعد رسولؐ اللہ کی ہدایت پر اس نے والیٔ بصرہ کے نام وہ تحریر لکھ دی اور والیٔ بصرہ کے دربان کے حوالے کر دیا۔ پرچے کا اندر پہنچنا تھا کہ والیٔ بصرہ کے قصر میں زلزلہ سا آگیا۔ اس نے حکم دیا۔

" حضور اکرمؐ کی یاد آوری کے شکرانے میں دس ہزار درہم اسی وقت فقراء میں تقسیم کر دیے جائیں اور چار سو درہم اس شخص کو دے دیے جائیں جو یہ تحریر لے کر آیا ہے"

اس کے بعد والیٔ بصرہ، اسماعیل کی خدمت میں خود بھی حاضر ہوا اور انتہائی لجاجت سے کہا "آپ کو جب بھی کسی چیز کی ضرورت ہوا کرے بے تکلف مجھ سے مانگ لیا کریں۔ آپ کی ضرورت پوری ہو جایا کرے گی۔"

لیکن غیرت مند اسماعیل کے بس کی بات ہی نہ تھی کہ وہ اپنی ضروریات اور خواہشات کے لیے والیٔ بصرہ کو تنگ کرتے رہتے۔"

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

رابعہؒ کی اپنی تینوں بہنوں کے ساتھ پرورش ہوتی رہی۔ غیرتمند باپ نہایت عسرت اور پریشانی سے ان کی پرورش کرتا رہا لیکن ایک شام اسماعیل کو ایک چونکا دینے والے واقعے سے دوچار ہونا پڑا۔

ایک ہی دسترخوان پر پورا کنبہ بیٹھا تھا۔ ہر کوئی تیزی سے کھانے پر ہاتھ صاف کر رہا تھا، لیکن رابعہؒ خاموش بیٹھی کھانے والوں کی شکلیں دیکھ رہی تھی۔ باپ بھی محویت سے رابعہؒ کی اس کیفیت کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ باپ کے علاوہ کسی کو بھی اس کی فکر نہ تھی کہ رابعہؒ کھانے میں ان کا ساتھ کیوں نہیں دے رہی ہے۔

باپ سے نہیں رہا گیا۔ نہایت شفقت سے پوچھا "رابعہؒ بیٹی!"

رابعہؒ نے چونک کر جواب دیا " جی باواجان! کیا بات ہے؟"

باپ نے پوچھا "تُو کھانا کیوں نہیں کھا رہی ہے؟"

رابعہؒ نے غمزدہ آواز میں جواب دیا "باواجان! میں سوچتی ہوں کہ خدا جانے یہ کھانا حلال ہے یا مشتبہ۔"

باپ نے بڑے دُکھ سے بیٹی کی طرف دیکھا، کہا "بیٹی رابعہؒ! ایک بات تو خود تُو نے بھی محسوس کی ہوگی کہ میں نے ہمیشہ حرام حلال کا ضرور خیال رکھا ہے۔ اگر میں کبھی حلال رزق سے محروم رہا ہوں تو میں نے حرام کھانے پر فاقے کو ترجیح دی ہے۔"

رابعہؒ نے کہا۔ "لیکن باواجان! میرا یہ عقیدہ ہے کہ ہمیں اس دنیا میں بھوک پر صبر کر لینا چاہیئے یہ اس لیے کہ ہمیں آخرت میں آگ پر نہ صبر کرنا پڑے۔"

پھر ایسا ہوا کہ باپ کا سایہ بھی اُٹھ گیا، ماں بھی چل بسی۔ اب چاروں بہنیں ایک ساتھ رہ رہی تھیں۔

ان دنوں بصرے پر قحط کا عذاب نازل ہوا۔ لوگ رزق کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ دوستوں نے دوستوں کو پہچاننا چھوڑ دیا۔ خونی رشتے اپنا پاس و لحاظ ختم کر بیٹھے۔ ہر طرف نفسا نفسی کا بازار گرم تھا۔ رابعہؒ کی تینوں بہنیں رابعہؒ کو چھوڑ کر معلوم نہیں کہاں چلی گئیں۔ رابعہؒ پریشان ہو کر اِدھر اُدھر رہنے کا ٹھکانا تلاش کرنے لگیں۔ یہ کسی سہارے کی تلاش میں بصرے کے اس حصے کی طرف چل پڑیں، جہاں متموّل خاندان رہتے تھے۔ گلی کے نکڑ پر ایک شخص نے انہیں روک لیا اور پوچھا "لڑکی! تیرے ماں باپ کہاں ہیں؟"

رابعہؒ نے جواب دیا۔ "دونوں فوت ہو چکے۔"

اس شخص نے قہقہہ لگایا، بولا۔ "خوب! اب تیرا سرپرست کون ہے؟"

رابعہؒ نے جواب دیا۔ "اللہ۔ جو ہم سب کا سرپرست ہے۔"

اس شخص نے کہا، "اگر یہ بات ہے تو تجھے کسی سے ڈرنا بھی نہیں چاہیئے۔ آ تُو میرے ساتھ چل۔"

رابعہؒ نے پوچھا، "کہاں ؟ تُو مجھے کہاں لے جائے گا؟"

آدمی نے جواب دیا، "لڑکی ! سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ میں خود بھی بہت بھُوکا ہوں۔ کئی وقت سے کچھ بھی نہیں کھایا اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنے بھُوک کے مسئلے کو کس طرح حل کروں گا لیکن ابھی ابھی جیسا کہ تو نے مجھے بتایا تھا کہ ہم سب کا سرپرست خدا ہے میں تیری ذہانت اور حاضر جوابی کا قائل ہو گیا۔ اس نے تجھے بھیج کر میری بھوک کا مسئلہ حل کر دیا۔ وہ بڑا کارساز اور مہربان ہے۔"

اس نے رابعہؒ کو پکڑ لیا اور ایک دوسرے شخص کے ہاتھ بیچ دیا خریدنے والے نے چند دن رابعہؒ سے خدمت لی اور اس کے بعد اچھی قیمت پر کسی دوسرے کے حوالے کر دیا۔ اس نئے خریدار نے رابعہؒ سے بڑی بے دردی سے کام لینا شروع کر دیا۔ بازار کے سودے کی خریداری سے لے کر گھر کے کام کاج تک ہر کام رابعہؒ کو انجام دینا پڑتا۔

ایک دن آپ بازار سے سودا خرید کر لا رہی تھیں کہ کسی اوباش نے آپ کا پیچھا کیا۔ آپ اس سے بچنے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگنے لگیں لیکن اس شاطر نے بھی آپ کا پیچھا کیا۔ آخر اس شخص نے آپ کو گھیر ہی لیا۔ آپ نے اس کے گھیراؤ سے نکلنے کی بھرپور کوشش کی تو اتنے زور سے گریں کہ ان کا ایک ہاتھ ٹوٹ گیا، راہگیروں نے آپ کی مدد کی اور انہیں گھر پہنچا دیا۔ رابعہؒ کے مالک کو کچھ پتہ نہ تھا کہ رابعہؒ کا ہاتھ ٹوٹ چکا ہے۔ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر وہ سجدے میں گر گئیں اور خدا سے عرض کیا "اے اللہ!

مَیں بے یار و مددگار تو پہلے ہی تھی، اب ایک ہاتھ بھی ٹوٹ گیا۔ لیکن میں پھر بھی تیری رضا چاہتی ہوں، تو مجھے جس حال میں چاہے رکھ، میں تیرا گلہ نہیں کروں گی۔"

رابعہؒ نے جواب میں ایک پُراسرار سی آواز سُنی۔ کوئی کہہ رہا تھا "رابعہؒ! غمگین نہ ہو، کل تجھے وہ مرتبہ ملنے والا ہے کہ مقرّب ملائکہ بھی تجھ پر رشک کرنے لگیں گے۔"

رابعہؒ نے سکوت اختیار کیا اور بڑی سے بڑی مصیبت پر بھی گلہ و شکوہ نہ کرنے کا عہد کر لیا۔

یہ دن میں روزے رکھتیں اور رات بھر عبادت میں مشغول رہتیں ان کے مالک کو رابعہؒ کے مرتبے کا ابھی تک کوئی علم نہ تھا۔

ایک رات ان کے مالک کی نصف شب کو آنکھ کھُل گئی۔ رابعہؒ کے بستر پر جو نظر کی تو وہ خالی نظر آیا۔ وہ حیران ہو کر اٹھ بیٹھا اور رابعہؒ کو تلاش کرنے لگا۔ اس نے آپ کو ایک کونے میں نماز پڑھتے دیکھا۔ اس وقت وہ سجدے میں پڑی تھیں اور ان کے سر پر نُور کا ایک گول دائرہ ہالہ کیے ہوئے تھا۔ رابعہؒ سِسک سِسک کر کہہ رہی تھیں "خدایا! اگر میرے بس میں ہوتا تو میں چوبیس گھنٹے تیری عبادت میں گزار دیتی۔ لیکن تُو ہی بتا میں کیا کروں۔ تُو نے خود ہی تو مجھے غیر کا محکوم بنا دیا ہے۔ غیر کی اسی محکومی نے مجھے مجبور کر رکھا ہے کہ میں تیرے دربار میں دیر سے حاضری دوں۔"

رابعہؒ کا مالک حیران رہ گیا۔ اس وقت تو وہ کچھ بھی نہ بولا، اپنے بستر پر واپس گیا لیکن اب اس کی نیند اڑ چکی تھی، وہ پوری رات جاگتا رہا،

علی الصباح رابعہؒ کے پاس پہنچا اور ان کے سامنے دو زانوں بیٹھ گیا، اور ادب سے کہنے لگا "رابعہؒ! مجھے افسوس ہے کہ میں اب تک تیرے مرتبے سے لاعلم تھا لیکن رات میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے تو تجھ سے اپنی خدمت لینے کے بجائے تیری خدمت کرنا چاہیئے تھی، میں کتنا نالائق اور اندھا ہوں جو تجھے پہچان نہیں سکا۔ اب میں اس طرح کا اسی طرح کفارہ ادا کر سکتا ہوں کہ یا تو آپ بدستور اسی گھر میں رہیں اور میں آپ کی خدمت کروں اور اگر کسی طرح آپ کو میری یہ بات منظور نہ ہو تو میری طرف سے آپ آزاد ہیں جہاں چاہیں چلی جائیں۔"

رابعہؒ مدتوں پنجرے میں بند رہنے والے پرند کی طرح عجلت میں باہر نکلیں اور ان مجلسوں کا رخ کیا جہاں اس عہد کے صوفیائے کرام وعظ و تلقین فرمایا کرتے تھے انہی میں خواجۂ خواجگان حسن بصریؒ بھی شامل تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی ریاضت اور ذہانت کے چرچے ہونے لگے۔ اس عہد کے نامی گرامی صوفی بھی ان پر رشک کرنے لگے۔

رات کے سناٹے میں وہ چھت پر چڑھ جاتیں اور آسمان کی طرف دیکھتی ہوئی حسرت سے کہتیں "خدایا! رات نے پوری دنیا کو اپنی آغوش میں لے رکھا ہے، زمانہ محوِ خواب ہے، حبیب اپنے حبیب سے محوِ راز و نیاز ہے لیکن میں رابعہؒ تیرے سامنے کھڑی ہوں اور تیری محبت کی آگ میں جل رہی ہوں۔"

آپ نے یہاں تک شہرت حاصل کر لی کہ بصرہ کے نامی گرامی حضرات ان سے شادی کی درخواست کرنے لگے۔ خدا نے حسن و جمال بھی ایسا دیا تھا کہ جو دیکھتا شادی کی توقعات وابستہ کر لیتا۔

ایک دن صبح ہی صبح والیٔ بصرہ محمد بن سلیمان ہاشمی کی سواری رابعہؒ کے دروازے پہ رُکی۔ گلی میں سناٹا چھا گیا۔ لوگ رابعہؒ کے گھر کی طرف رشک و حسد سے دیکھنے لگے۔ والیٔ بصرہ کے غلام نے رابعہؒ کے دَر پہ دستک دی جب رابعہ نے دروازے کی آڑ سے پوچھا کہ تو میرے پاس کس لیے آیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا "رابعہؒ! میں والیٔ بصرہ محمد بن سلیمان ہاشمی ہوں۔ لوگ صبح سے شام تک میرے در پہ درخواستیں پیش کرتے رہتے ہیں لیکن اتفاق تو دیکھ، آج میں خود تجھ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" رابعہؒ نے جواب دیا "اے والیٔ بصرہ! تُو کتنا نادان اور احمق ہے کہ اپنی درخواست اللہ کے پاس لے جانے کے بجائے میرے پاس لے آیا۔"

والیٔ بصرہ نے کہا "رابعہؒ! میری آمدنی دس ہزار درہم ماہانہ ہے، میں یہ ساری کی ساری تمہیں دے دیا کروں گا۔"

رابعہؒ نے پوچھا "اور اس کے عوض تُو مُجھ سے کیا چاہے گا؟"

والیٔ بصرہ نے جواب دیا "میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

رابعہؒ نے کہا "اے بصرے کے حاکم! جب تک تو دنیا سے رغبت رکھے گا، پریشان رہے گا۔ یاد رکھ بے رغبتی اور زہد، دُنیا میں باعثِ راحت ہیں، رغبت رنج و ملال پیدا کر دیتی ہے۔ تو اپنے لیے توشۂ آخرت تیار رکھ اور اسے آگے روانہ کر دے۔ اپنا وارث تُو خود بن، دوسروں کو تو اپنا والی وارث ہرگز نہ بنا۔ ورنہ وہ تیرا ترکہ آپس میں تقسیم کر لیں گے ہمیشہ روزے رکھا کر اور دل میں اس خیال کو مستقل کر لے کہ گویا تو ابھی پیدا ہوا ہے اور رہا میرا معاملہ، تو اگر خدا مجھے تیری پیش کش سے زیادہ دیدے، تب بھی میرا دل خوش نہ ہوگا کیونکہ میں اپنے اللہ سے ایک گھڑی بھی غافل رہنا

نہیں چاہتی۔"

والیٔ بصرہ اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔

آپ حاجیوں کے قافلے کے ساتھ حج کے لیئے روانہ ہوگئیں۔ ایک گدھا آپ کے ساتھ اور اس پر آپ کا سامان لدا ہوا تھا۔ اس قافلہ نے ایک جنگل میں پڑاؤ ڈالا اور آپ عبادت و ریاضت میں مشغول ہوگئیں۔ رابعہؒ کا گدھا بہت کمزور تھا، مرگیا، قافلے والوں کو آپ سے ہمدردی تھی، کہا "رابعہ! تم فکرمند نہ ہونا۔ ہم لوگ تمہارا سامان اپنے مویشیوں پر لاد لیں گے۔"

رابعہؒ نے جواب دیا "خوب، کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ میں نے یہ سفر تمہارے سہارے کے پیش نظر کیا ہے؟ اگر تم لوگوں نے میرا ساتھ دیا بھی تو میں اسے قبول نہیں کروں گی۔ میں اسی کا سہارا قبول کروں گی جس کے علاوہ دوسرا کوئی سہارا نہیں۔"

قافلے والے تنگ آکر، انہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ رابعہؒ اپنے گدھے کے پاس پہنچیں اور خدا سے کہنا شروع کیا "خدایا! کسی نادار اور عاجز کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے کہ پہلے تو اسے اپنے گھر کی طرف رجوع کیا، پھر راستے ہی میں میرے گدھے کو ہلاک کر دیا اور مجھے جنگل میں تنہا چھوڑ دیا۔"

ابھی آپ کے کلمات پوری طرح ادا بھی نہیں ہوئے تھے کہ گدھے میں حرکت ہوئی۔ وہ ایڑیاں رگڑتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ آپ نے اپنا سامان اس پر لادا اور مکّے کی طرف دیکھنے لگیں۔

جب آپ مکّہ معظمہ میں داخل ہوئیں تو وہاں ٹھہرا نہ گیا۔ ایک ویرانے میں نکل گئیں اور خدا سے کہنا شروع کیا "خدایا! تو خوب جانتا ہے کہ میری تخلیق خاک سے ہوئی ہے اور کعبہ بھی پتھر سے بنا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میں

تجھ سے کسی ذریعے سے ملوں، تو میرے اور اپنے درمیان سے کعبے کو نکال دے۔ میں تجھ سے براہ راست ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔"

انہیں جواب ملا۔" رابعہؒ! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ جب موسیٰؑ نے دیدار کی خواہش کی تھی اور ہم نے اپنی تجلیات میں سے ایک چھوٹی سی تجلی کوہ طور پر ڈال دی تھی تو وہ اس سے جل کر خاک ہو گیا تھا۔ یہ سب جاننے کے باوجود بھی تو براہِ راست ملاقات کی خواہش مند ہے؟"

اس کے ایک عرصہ بعد آپ دوبارہ حج کرنے پہنچیں تو آپ نے ایک عجیب ہی منظر دیکھا۔" دھواں دھواں خانۂ کعبہ" ان کے استقبال کی خاطر بڑھا چلا آرہا ہے۔

آپ نے نفرت سے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا اور کہا۔" تو واپس جا، مجھے مکان کی نہیں، مکین کی ضرورت ہے۔"

ان ہی دنوں کی بات ہے کہ بلخ کے مشہور حکمران، جو بعد میں صوفی ہو گئے تھے، ابراہیم ادہمؒ بھی حج کرنے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے خانۂ کعبہ کو دیکھا تو وہ غائب دکھائی دیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیر تک دیکھتے رہے لیکن انہیں وہ نظر نہ آیا۔ ابراہیم ادہمؒ کو یہ شبہ گزرا کہ ان کی بصارت زائل ہو چکی ہے۔ وہ رونے لگے لیکن اسی وقت انہیں ایک آواز نے مطلع کیا "ابراہیمؒ! تیری بصارت موجود ہے، وہ زائل نہیں ہوئی۔ کعبہ تو رابعہؒ کے استقبال کو گیا ہوا ہے۔"

ابراہیم ادہمؒ نے حیرت سے سوال کیا۔" خدایا! یہ کون سی برگزیدہ ہستی ہے، جس کے استقبال کو کعبہ چلا گیا۔"

جواب ملا۔" ابراہیمؒ! وہ بہت ہی قابلِ احترام ہستی ہے۔" پھر کچھ توقف

کے بعد حکم دیا گیا۔" ابراہیمؒ! اپنے داہنے طرف مڑ کر دیکھ، رابعہؒ آرہی ہے۔"

ابراہیمؒ نے رابعہؒ کو دیکھا تو دم بخود رہ گئے۔ ابراہیمؒ نے رابعہؒ سے کہا۔

"رابعہؒ! آخر تم نے نظامِ عالم کو درہم برہم کیوں کر رکھا ہے، کعبہ تمہارے استقبال کی خاطر اپنی جگہ سے ہٹ جاتا ہے۔"

رابعہؒ نے جواب دیا۔" ابراہیمؒ! ہنگامہ میں نے نہیں، تم نے کھڑا کیا ہے تُو نے ہر گام پہ دو رکعت نماز پڑھتے ہوئے خانہ کعبہ تک پہنچنے میں چودہ سال ضائع کر دیے، یہ فضول سی بات ہے۔"

ابراہیمؒ نے کہا۔"میں نے ہر قدم پہ دو رکعت نفل ادا کی ہیں، اسی لیے اتنی دیر سے پہنچا ہوں۔"

رابعہؒ نے جواب دیا۔" ابراہیمؒ! ہم دونوں میں یہ فرق پایا جاتا ہے کہ تم نمازیں پڑھ پڑھ کر یہاں تک پہنچے ہو اور میں نے اس فاصلے کو عجز وانکسار سے طے کیا ہے۔"

ابراہیمؒ خاموش ہو گئے۔

رابعہؒ نے حج کرنے کے بعد خدا سے کہا۔" خدایا! تُو نے حج پہ بھی اجر مقرر فرمایا ہے اور مصیبت پہ صبر کرنے کی تلقین کی ہے۔ لہٰذا میری تجھ سے یہ درخواست ہے کہ اگر تُو میرا حج قبول نہیں فرماتا تو مصیبت پر صبر کرنے کا اجر ہی عطا فرما دے کیونکہ حج کی عدمِ قبولیت سے بڑھ کر اور کون سی مصیبت ہو سکتی ہے۔"

حج سے فراغت حاصل کر کے آپ بصرے واپس چلی گئیں۔

⁂ ⁂ ⁂

دو بھو کے آپس میں باتیں کرتے ہوئے رابعہؒ کے گھر کی طرف جا رہے

تھے۔ ایک کہہ رہا تھا "بھائی، میں نے رابعہؒ کے زہد و عرفان کا بڑا شہرہ سُنا ہے۔ آؤ آج اس کا امتحان ہی کرلیں۔"

دوسرے نے پوچھا "وہ کس طرح ؟"

پہلے نے کہا "غالباً میری طرح تم بھی بھوک کی آگ محسوس کر رہے ہو گے ؟"

دوسرے نے جواب دیا "ہاں بھوک تو مجھے بھی لگی ہے۔"

پہلے نے کہا "ہم دونوں رابعہؒ کے پاس چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ کچھ بتائے بغیر ہی ہمارے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہے، اس طرح ہم اس کے کشف اور علم کا امتحان بھی لے لیں گے۔"

دونوں بھوکے رابعہؒ کے در پہ پہنچے اور زور زور سے دستک دینے لگے۔ رابعہؒ نے دروازے کے پاس آکر تسلی دی اور کہا۔" پریشان مت ہو، میں تم دونوں کو ابھی شکم سیر کراتی ہوں۔ افسوس کہ تم لوگ ذرا دیر میں پہنچے ہو۔"

دونوں بھوکے حیرت سے رابعہؒ کی آواز سننے اور دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

رابعہؒ نے ان دونوں کو اپنے اندرونی کمرے میں بٹھایا اور ان کے سامنے دو روٹیاں رکھ دیں کہ "کھاؤ اور اپنے رب کا شکر ادا کرو۔" ابھی یہ دونوں کھانا شروع بھی نہ کرسکے تھے کہ کسی سائل نے آواز لگائی "بی بی! خدا بھلا کرے، اور تجھے سب سے زیادہ چاہے۔"

رابعہؒ نے دونوں بھوکوں کے سامنے سے روٹیاں اٹھالیں اور انہیں درویش کے حوالے کردیا۔ دونوں بھوکوں کو رابعہؒ کی یہ حرکت بری لگی ابھی

ان دونوں کے دلوں کا تکدر دُور بھی نہ ہوا تھا کہ ایک کنیز باہر سے آئی۔ اس کے کاندھے پر روٹیوں کا خوان رکھا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی رابعہؒ سے کہا "حضور! یہ روٹیاں میری مالکہ نے آپ کو بھیجی ہیں۔"

دونوں بھوکے بے صبری سے ان گرم گرم روٹیوں کو دیکھنے لگے۔

رابعہؒ نے پوچھا "یہ کتنی روٹیاں ہیں؟"

کنیز نے جواب دیا "اٹھارہ روٹیاں۔"

رابعہؒ نے فوراً کہا "ان روٹیوں کو واپس لے جا، یہ کسی اور کو بھیجی گئی ہوں گی۔"

بھوکے پریشان ہو گئے۔ ایک نے دوسرے کے کان میں کہا "میاں! یہ عجیب و غریب عورت ہے، اسے بھوک یا کھانے کی کوئی پرواہ ہی نہیں۔"

دوسرے نے جواب میں کہا "اگر اسے کھانے کی پرواہ نہیں ہے، تو اس کو ہماری بھوک کا تو کچھ خیال کرنا چاہیئے۔"

کنیز اپنے کاندھے پر روٹیاں لیے بدستور کھڑی تھی، اس نے رابعہؒ سے کہا "حضور! یہ روٹیاں آپ ہی کو بھیجی گئی ہیں، آپ یقین تو کریں۔"

رابعہؒ نے جواب دیا "میرا خدا منصف ہے اور اپنے قول کا پکا اور سچا ہے، تو میری بات مان لے، یہ روٹیاں کسی اور کے لیئے بھیجی گئی ہیں۔ تو انہیں اپنی مالکہ کے پاس واپس لے جا اور میں نے جو کچھ کہا ہے ان کے گوش گزار کر دے۔"

کنیز روٹیوں سمیت واپس چلی گئی۔ اس نے رابعہؒ کی گفتگو سے اپنی مالکہ کو مطلع کیا تو اس نے ایک لمحہ بھی تامل میں ضائع نہیں کیا۔ کنیز سے کہا "تُو اپنی روٹیوں میں دو کا اضافہ کر کے پھر لے جا اور رابعہؒ سے کہہ

دے کہ یہ روٹیاں تمہارے ہی پاس بھیجی گئی ہیں۔ انہیں قبول فرمالیں اور ہمیں شرمندہ نہ کریں۔"

کنیز روٹیاں لے کر دوبارہ پھر پہنچ گئی، رابعہؒ نے دیکھتے ہی پوچھا۔ "تو اب کیوں آئی ہے؟"

کنیز نے جواب دیا" میں نے مالکہ سے بات کی تھی، وہ کہتی تھیں کہ یہ روٹیاں آپ ہی کو بھیجی گئی تھیں۔ میری مالکہ نے اس میں دو روٹیاں اور شامل کرا دی ہیں۔"

آپ نے برجستہ کہا "میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ خدا اپنے قول کا پکا اور سچا ہے۔"

کنیز چلی گئی اور رابعہؒ نے دونوں بھوکوں سے کہا" اب تم کھا سکتے ہو۔"

دونوں کھانے پر ٹوٹ کر گرے، خوب شکم سیر ہو کر کھایا، لیکن ان کے سامنے جو واقعہ پیش آیا تھا، وہ ایک معمّا تھا اور دونوں اس معمّے کو اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش میں لگے تھے لیکن جب عاجز آگئے اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو مجبوراً رابعہؒ سے دریافت کیا" بی بی! ہم دونوں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھا لیا، طبیعت سیر ہو گئی لیکن یہ معاملات اپنی سمجھ میں نہیں آئے۔"

رابعہؒ نے دریافت کیا "کون سے معاملات؟"

دونوں میں سے ایک نے کہا "آپ نے پہلے ہمارے سامنے دو روٹیاں رکھی تھیں، پھر سائل کی آواز پہ دونوں روٹیاں اس کے حوالے کر دیں۔ اور جب ذرا دیر بعد ایک کنیز اٹھارہ روٹیاں لے کر آئی تو آپ نے

انہیں یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ یہ روٹیاں آپ کو نہیں کسی اور کو بھیجی گئی ہیں لیکن جب ان میں دو کا اضافہ کر دیا گیا تو آپ نے انہیں قبول کر لیا۔ یہ سب کیا تھا؟ ہم اس معمّے کو حل کرنے سے قاصر ہیں۔"

رابعہؒ نے جواب دیا۔" جب تم دونوں میرے پاس آئے تھے تو میں نے ایک نظر میں معلوم کر لیا تھا کہ تم دونوں بہت بھوکے ہو۔ میں نے دو روٹیاں تم دونوں کے آگے رکھ دیں کیونکہ گھر میں موجود ہی دو روٹیاں تھیں لیکن اس دوران سائل آ گیا تو میں نے وہ دونوں روٹیاں تمہارے سامنے سے اٹھا کر سائل کو دے دیں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ خدا نے انسان سے وعدہ کر رکھا ہے کہ ایک کی جگہ دس دے گا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا سے عرض کیا کہ خدایا! جب تو نے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ ایک کی جگہ دس دے گا تو یہ ایک کی جگہ نو کیوں، تیرا وعدہ غلط تو نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ تم دونوں نے دیکھ لیا کہ خدا نے اپنا وعدہ پورا کر دیا اور دو کی جگہ بیس روٹیاں مرحمت فرما دیں۔"

❖ ❖ ❖ ❖

رات کے پچھلے پہر تک آپ نے شدید ریاضت کی، اعصاب آرام کرنے کے خواہش مند تھے۔ آپ جس جگہ مصروف عبادت تھیں اس سے ذرا ہٹ کر لیٹ گئیں۔ تھکے ہوئے اعضاء عالم خواب میں چلے گئے۔ اسی وقت ایک چور آپ کے حجرے میں داخل ہوا اور آپ کے سرہانے سے چادر اٹھا کر چلنے لگا۔ اسے اچانک احساس ہوا کہ اس کی بینائی رخصت ہو چکی ہے۔ وہ اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا، اسے باہر نکلنے کے لئے دروازہ نہیں مل رہا تھا۔ آخر اسے ڈر لگا کہ کہیں رابعہؒ کی آنکھ نہ کھل جائے اور وہ پکڑا

جائے۔ اس نے چادر جس جگہ سے اٹھائی تھی وہیں رکھ دی۔ چادر کے رکھتے ہی بینائی بحال ہوگئی۔ بینائی کا واپس آنا تھا کہ حرص نے پھر زور کیا۔ اس نے چادر دوبارہ اٹھالی اور فرار ہونے کی کوشش کی۔ بینائی پھر جاتی رہی اور وہ دیوار سے ٹکرا گیا۔ اس نے چادر پھر رکھ دی اور چادر رکھتے ہی بینائی پھر واپس آگئی۔ اسی حالت میں رابعہؒ کی آنکھ کھُل گئی۔ حجرے میں چور دیکھ کر ذرا بھی پریشان نہ ہوئیں، پُوچھا "تو کون ہے اور یہاں کیا لینے آیا ہے؟"

چور نے جواب دیا "بی بی! میں آپ سے کیا چھپاؤں، میں چور ہوں اور کافی دیر سے ایک ناقابلِ فہم چکر میں مبتلا ہوں۔"

آپ نے پوچھا "کس چکر میں ہے؟"

چور نے پوری رُوداد سنادی۔ آخر میں کہا "اب میں جب بھی چادر اٹھاتا ہوں، اپنی بینائی کھو دیتا ہوں، اور جب چادر رکھ دیتا ہوں تو میری بینائی واپس آجاتی ہے۔ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟"

رابعہؒ نے جواب دیا "تُو خود کو کسی آفت میں مبتلا کیوں کرنا چاہتا ہے۔ کیا تُو نہیں جانتا کہ میں نے برسوں سے خود کو خدا کے حوالے کر دیا ہے اور اب عالم یہ ہے کہ میرے پاس شیطان تک نہیں پھٹکتا۔ پھر تیری کیا مجال ہے کہ چوری کر سکے۔ میں اس حقیقت پر یقین رکھتی ہوں کہ اگرچہ میں سو جاتی ہوں لیکن میرا دوست، میرا خدا ہمیشہ بیدار رہتا ہے۔"

چور آپ کی باتوں سے اتنا متاثر ہوا کہ چوری کی عادت چھوڑ دی اور یادِ الٰہی میں مشغول ہو گیا۔

ایک دن رابعہؒ ایک پہاڑی پر تشریف لے گئیں۔ تمام صحرائی جانوروں

نے آپ کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ وہ سب آپ سے بے حد مانوس نظر آتے تھے اسی دوران ایک دوسرے مشہور زمانہ صوفی اور رابعہؒ کے ہموطن حسن بصریؒ بھی وہاں پہنچ گئے۔ ان کے پہنچتے ہی تمام جانور اِدھر اُدھر بھاگ کر رُوپوش ہو گئے۔ حسن بصریؒ یہ منظر دیکھتے رہے، آخر تعجب سے پوچھا۔ "رابعہؒ! یہ معاملہ کیا ہے، یہ جانور مجھے دیکھتے ہی فرار کیوں ہو گئے؟"

رابعہؒ نے پوچھا۔ "آج آپ نے کھانے میں کیا کھایا ہے؟"

حسن بصریؒ نے جواب دیا۔ "گوشت اور روٹی۔"

رابعہؒ نے کہا۔ "جب آپ ان کا گوشت کھائیں گے تو یہ آپ سے کس طرح مانوس ہوں گے؟"

حسن بصریؒ حیرت زدہ شکل دیکھتے رہ گئے۔

گھر میں کھانے کی چیزیں تو موجود تھیں لیکن رابعہؒ کئی دن کی بھوکی تھیں گھر میں آپ کی ایک ارادت مند خادمہ کی طرح کام میں لگی رہتی تھی۔ اس نے آپ کے لیے کھانا تیار کیا، کھانا پکانے کے دوران گھر میں اسے پیاز نہیں ملی، رابعہؒ سے کہا۔ "بی بی! اگر آپ اجازت دیں تو میں پڑوس سے پیاز مانگ لاؤں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں بغیر پیاز ہی کے کھالوں گی۔"

ہانڈی چولہے پر چڑھی ہوئی تھی۔ اس میں سے لذیذ خوشبو نکل کر ناک کی راہ سے دل و دماغ کو بے چین کر رہی تھی۔ اسی وقت ایک پرندہ اڑتا ہوا آیا اور کھلی ہوئی ہانڈی پر منڈلانے لگا۔ اس کی چونچ میں کوئی سفید

سفید چیز دبی ہوئی تھی۔ پھر وہ اسی سفید چیز کو ہانڈی میں گرا کر چلا گیا۔ رابعہؒ نے اپنی ارادت مند سے کہا۔ "دیکھنا تو یہ پرندہ ہانڈی میں کیا گرا گیا ہے؟"

اس نے ہانڈی سے وہ چیز نکال لی اور مارے خوشی کے پھولی نہ سمائی، بولی "بی بی! یہ پیاز ہے۔ آپ نے مانگنے سے منع کیا تھا۔ خدا نے اس پرندے کے ذریعہ آپ کا بھرم رکھ لیا اور اس طرح پیاز بھیج دی!"

آپ نے کہا۔ "لیکن میں اس ہانڈی کا سالن چکھوں گی بھی نہیں۔ میں اسے نہیں کھا سکتی۔"

خادمہ نے پوچھا۔ "وہ کیوں؟ اس ہانڈی میں کیا خرابی پیدا ہو گئی؟"

رابعہؒ نے جواب دیا۔ "پرندے کی جس حرکت کو تو اشارۂ خداوندی قرار دے رہی ہے، یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ فریب شیطانی ہو۔"

اور آپ نے اس ہانڈی کا سالن چکھا تک نہیں۔

رابعہؒ بصری فرات کے ساحل پر کھڑی تھیں، مصلّٰی ان کی بغل میں تھا اتفاق سے حسن بصریؒ بھی وہاں پہنچ گئے۔ دونوں کا آمنا سامنا جو ہوا تو حسن بصریؒ نے کہا۔ "آیئے ہم دونوں نماز ادا کر لیں۔"

یہ کہہ کر حسن بصریؒ نے فرات کے پانی پر اپنا مصلّٰی بچھا دیا۔

رابعہؒ نے جواب دیا۔ "حسنؒ! اگر تمہارا یہ فعل مخلوق کی نمائش کے لیئے ہے تو بہت خوب ہے اور دوسرے لوگ ایسا نہیں کر سکیں گے۔"

اس کے بعد رابعہؒ نے اپنا مصلّٰی ہوا میں بچھا دیا، بولیں "وہاں نہیں یہاں ہوا کے دوش پر آجاؤ، ہم دونوں ایک ساتھ نماز پڑھ لیں۔"

حسن بصریؒ نے تعجب سے کہا۔ "یہ کیا ہے رابعہؒ؟"

رابعہؒ نے جواب دیا۔ "ہوا کے دوش پر نماز پڑھنے کا فائدہ یہ ہے کہ

ہمیں اس طرح نماز پڑھتے کوئی دیکھ نہیں سکے گا۔"

حسن بصریؒ رابعہؒ کی صورت دیکھتے رہ گئے۔

رابعہؒ نے کہا۔" آپ میری شکل دیکھ رہے ہیں ؟ آپ نے جو فعل انجام دیا تھا۔ وہ تو پانی کی معمولی مچھلیاں بھی انجام دے سکتی ہیں اور جو میں نے کیا۔ اسے ایک حقیر مکھی بھی کر سکتی ہے لیکن یہ دونوں ہی فضول باتیں ہیں۔"

لوگ آپ سے طرح طرح کے سوال کیا کرتے تھے۔ ایک دن کسی نے پوچھا۔" رابعہؒ! تم کہاں سے آئی ہو اور کہاں جاؤ گی ؟"

آپ نے جواب دیا۔" میں جس جہان سے آئی ہوں، وہیں واپس چلی جاؤں گی۔"

پھر سوال کیا گیا۔" اس جہان میں آپ کا کیا کام ہے ؟"

جواب دیا۔" کفِ افسوس ملنا۔"

سوال کیا گیا۔" کفِ افسوس ملنے کی وجہ ؟"

جواب دیا۔" میں رزق تو اس جہان کا کھاتی ہوں لیکن کام دوسرے جہاں کا کرتی ہوں۔"

سوال کرنے والے نے کہا۔" رابعہؒ! تمہاری شیریں بیانی اس قابل ہے کہ تمہیں کسی مسافر خانے کا نگران مقرر کر دیا جائے۔"

رابعہؒ نے جواب دیا۔" میں اپنے مسافر خانے کی خود ہی نگران ہوں اور خود ہی محافظ بھی۔"

پوچھا گیا۔" وہ کس طرح ؟"

جواب دیا۔" جو کچھ میرے اندر ہے باہر نکال دیتی ہوں اور جو باہر ہے، اسے اندر نہیں جانے دیتی، اس لیے مجھے کسی کی آمدورفت کی کوئی

پرواہ نہیں ہوتی۔ مَیں قلب کی نگہبان ہوں، جسدِ خاکی کی نہیں۔"

پھر سوال ہوا: "رابعہؒ! تم ابلیس کو دشمن تصور کرتی ہو یا نہیں؟"

جواب دیا: "میں رحمٰن کی دوستی میں اتنی محو رہتی ہوں کہ ابلیس کی معاندت کا کبھی خیال ہی نہیں آتا۔"

※ ※ ※ ※ ※ ※

آپ کو کمبل کی سخت ضرورت تھی۔ آپ نے کسی ارادت مند کو چار درہم دیے اور کہا: "میرے لیے ایک کمبل خرید لاؤ۔"

اس شخص نے پوچھا: "کمبل کس رنگ کا آئے، سیاہ یا سفید؟"

آپ نے کہا: "میرے درہم واپس دو دینا۔"

اس شخص نے درہم واپس کر دیے۔ آپ نے چاروں درہم دریا میں پھینک دیے اور کہا: "ابھی کمبل خریدا بھی نہیں اور سیاہ و سفید کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ خریداری کے بعد پتہ نہیں کیا ہو؟"

خادمہ آپ کی باتیں سُن رہی تھی، بہار کا موسم تھا، بولی: "بی بی! آپ کُنجِ تنہائی سے باہر نکلیں اور دیکھیں کہ فطرت کتنی رنگین ہے۔"

آپ نے جواب دیا: "باہر نکل کر اگر کچھ دیکھا تو اس میں کمال کی کیا بات ہے؟ ادھر آ، میرے پاس اور گوشہ نشین ہو کر میری طرح صانعِ حقیقی کا مشاہدہ کر۔ کیونکہ میں صانع کے نظارے کو صنعت کے نظارے پر ترجیح دیتی ہوں۔"

ایک دن آپ کی مجلس میں ایک دوسرے بزرگ صالح عامریؒ تشریف فرما تھے، کہنے لگے: "رابعہؒ! اگر کسی کا دروازہ مسلسل کھٹکھٹایا جائے تو کسی نہ کسی دن کُھل ہی جاتا ہے۔"

رابعہؒ نے حیرت سے صالح عامریؒ کی شکل دیکھی اور کہا۔" دروازہ کھلنے کا کیا مطلب ہے کیونکہ میں جاننا چاہتی ہوں کہ وہ بند ہی کب ہوا تھا؟"

اس جواب نے صالح عامریؒ کو چونکا دیا۔ بولے۔" بی بی! مجھے آپ کی دانشمندی پر مسرت اور اپنی کم عقلی پر رنج ہو رہا ہے۔"

ان سے سوال کیا گیا۔" کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ خدا بندے سے کس وقت خوش ہوتا ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔" اس وقت جب بندہ محنت پر اس طرح شکر گزار ہوتا ہے جیسے کوئی نعمت مل گئی ہو۔"

کسی نے پوچھا۔" رابعہؒ! خدا عاصی کی توبہ قبول کرتا ہے یا نہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔" اگر خدا توفیق نہ دے تو کیا کوئی شخص توبہ کر سکتا ہے؟"

جواب ملا۔" ہرگز نہیں۔"

آپ نے کہا۔" جب یہ طے ہے کہ توفیقِ ایزدی کے بغیر توبہ نہیں کی جا سکتی تو جب خدا نے توفیق دے دی تو پھر توبہ کو قبول بھی فرمائے گا۔"

آپ کا لباس بہت میلا تھا، ایک بزرگ نے آپ سے کہا۔" رابعہؒ! آپ کا لباس بہت میلا ہے، حالانکہ اگر آپ ذرا سا اشارہ کر دیں تو بصرہ میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو آپ کو نفیس سے نفیس ترین لباس فوراً ہی مہیا کر سکتے ہیں۔"

" آپ نے کہا۔" تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن میں کسی غیر سے کچھ اس لیے نہیں طلب کرتی کہ ایسے موقعوں پر میں حیا کا شکار ہو جاتی ہوں۔ میں سوچتی ہوں، دنیا کا مالک تو خدا ہے اور دنیا والوں کو جو کچھ ملا ہے، عارضیتاً، مستعار

ملا ہے۔ تو سوچنے کی بات ہے کہ جب مخلوق کے پاس خود ہی ہر شے عاریتاً ہو تو اس سے طلب کرنا کیا معنی؟ بلکہ ایسا کرنا شرمناک ہے۔"
آپ کے جواب نے اس بزرگ کو شرمسار کر دیا۔
آپ کے ہاں مجلس جمی ہوئی تھی۔ طرح طرح کے مباحث چھڑے ہوئے تھے لیکن یہ سارے کے سارے تھے دنیا، آخرت، خدا، رسول اور ایسے ہی دیگر موضوعات سے متعلق۔
آپ نے کہا۔" لوگو! میں تمہاری عبادت سے ذرا بھی مطمئن نہیں۔"
کسی صوفی نے پوچھا۔" وہ کیوں؟"
آپ نے پوچھا۔" تم جو عبادت کرتے ہو، اس کا صلہ تمہیں کیا ملے گا؟ اور اگر نماز نہ پڑھو، عبادت نہ کرو تو اس کی سزا کیا ملے گی؟"
صوفی نے جواب دیا۔" اگر ہم عبادت کریں تو اس کے عوض ہمیں جنّت ملے گی اور اگر عبادت نہ کریں تو جہنّم کا ایندھن بنیں گے۔ یہ تو ایک عام سی بات ہے جس سے سبھی واقف ہیں۔"
رابعہؒ نے کہا۔" لیکن میں کہتی ہوں کہ اللہ کی عبادت کسی لالچ سے نہیں کرنی چاہیئے۔"
ایک دن آپ نے ایک ہاتھ میں آگ لی اور دوسرے میں پانی سے بھرا ہوا لوٹا۔ اور نہایت جوش و خروش سے چلی جا رہی تھیں۔ کسی نے پوچھا۔" رابعہؒ! یہ کیا؟ کہاں جا رہی ہو؟"
رابعہؒ نے جواب دیا۔" اس آگ سے میں جنّت کو جلا دوں گی اور پانی سے دوزخ کو بجھا دوں گی۔"
کسی نے پوچھا۔" یہ کیوں؟ ایسا کیوں کرو گی؟"

آپ نے جواب دیا۔" تاکہ لوگ خدا کی عبادت کسی حرص و لگاوٹ کے بغیر کریں۔"

کسی حاسد نے کہا۔" رابعہؒ! تم عورت ہو، کچھ بھی ہو تم مردوں کے مقابلے میں فضیلت اور بزرگی حاصل نہیں کر سکتیں۔"

رابعہؒ نے پوچھا۔" وہ کیوں؟"

حاسد نے جواب دیا۔" اللہ نے خود مرد کو عورت سے افضل بنایا ہے اور ہمیشہ مرد کو رسُول یا نبی بنا کر بھیجا ہے اور کسی عورت کو آج تک یہ شرف حاصل نہیں ہوا ہے۔"

رابعہؒ نے کہا۔" تو صحیح کہتا ہے، لیکن یہ بھی تو کہہ کہ آج تک کسی بھی عورت نے کبھی خدائی کا دعویٰ نہیں کیا۔ حالانکہ مردوں نے اکثر یہ دعویٰ کیا ہے۔"

حاسد لاجواب اور شرمندہ ہو کر چُپ ہو گیا۔

⁂ ⁂ ⁂

ایک شخص پیشانی پر پٹّی باندھ کر آپ کی مجلس میں شریک ہوا۔ آپ نے اسے قریب بلایا۔ پُوچھا۔" تُو نے پٹّی کیوں باندھ رکھی ہے؟"

اس شخص نے پٹّی کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔" سر میں شدید درد ہے۔"

آپ نے پوچھا۔" تیری کیا عُمر ہو گی؟"

اس نے جواب دیا۔" تیس سال۔"

آپ نے پوچھا۔" اتنی مدت تم بیمار رہے یا تندرست؟"

اس نے جواب دیا۔" عجیب اتفاق کی بات ہے کہ میں اپنے ہوش میں تو بیمار پڑا نہیں کبھی۔"

آپ نے نہایت افسوس کے ساتھ کہا، "اتنے عرصے تک تم تندرست رہے تو تم نے ایک دن بھی شکریے کی پٹی نہیں باندھی، اور اب جو ایک دن ذرا سر میں درد ہو گیا تو شکایت کی پٹی فوراً باندھ لی۔"

اس شخص نے شرمندہ ہو کر سر کی پٹی فوراً کھول دی۔

ایک دن ایک شخص کو اس حال میں دیکھا کہ رو رو کر "ہائے افسوس، ہائے افسوس" کہہ رہا تھا۔ آپ نے اسے منع کیا، کہا، "تم ایسا مت کہو۔ بلکہ کہو، ہائے بے غمی، ہائے بے غمی۔"

اس نے پوچھا "میں یہ کیوں کہوں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اس لیئے کہو کہ اگر تم واقعی غمزدہ، اندوہ گیں یا متاسّف ہوتے، تو ہائے افسوس ہائے افسوس کہنے کی تم میں نہ ہمت ہوتی، نہ جرأت۔"

آپ کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ صوفیائے کرام اور دوسرے ارادتمند آپ کی عیادت کے لیے حاضر ہونے لگے۔ عیادت کرنے والوں میں حسن بصریؒ بھی شامل تھے۔ جس وقت حسن بصریؒ حجرے میں داخل ہونے والے تھے، انہوں نے ایک دولتمند کو حجرے کے در پر اس طرح کھڑے دیکھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں اشرفیوں کی تھیلی تھی اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

حسن بصریؒ نے پوچھا "جناب! یہ ماجرا کیا ہے؟ آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟"

دولتمند نے جواب دیا۔ "میں اس یکتائے زمانہ عورت کے لیئے ایک چیز لایا ہوں۔ اگر یہ مجھ سے بات چیت کرنا پسند کرلے تو مارے خوشی کے میں یہ اچھی سی چیز اسے پیش کر دوں۔"

حسن بصریؒ نے کہا۔" پیش کرنے میں کیا حرج ہے ؟"

دولتمند نے کہا۔" میں اس بات سے خوفزدہ ہوں کہ وہ لینے سے کہیں انکار نہ کر دیں۔ ہاں اگر آپ میری سفارش کر دیں تو وہ شاید قبول فرما لیں۔"

حسن بصریؒ نے جواب دیا۔" دیکھو، میں سفارش کر کے دیکھتا ہوں۔"

حسن بصریؒ اندر گئے اور ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس رئیس کی سفارش کی۔ رابعہؒ بصری نے بڑے دُکھ سے کہا۔" حسنؒ! تم جانتے ہو کہ جو شخص اللہ کو بُرا کہتا ہے اللہ اس کی روزی بند نہیں کرتا۔ اور جس کی زندگی اس کی محبت پر قائم ہو، اسے تو اللہ بغیر رزق ہی کے زندہ رکھ سکتا ہے۔ حسنؒ! جب سے میں نے اسے دیکھا ہے کُل مخلوق سے اپنا منہ پھیر لیا ہے، اب تم ہی بتاؤ کہ جس شخص سے میں واقف نہیں، اس کا مال کس طرح قبول کر لوں۔ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ اس شخص کا مال حرام کا ہے یا حلال کا۔ اس سے کہو واپس جائے۔"

اس موقع پر دوسرے مشہور صوفی سفیان ثوریؒ آپ کی عیادت کو پہنچے وہ رابعہؒ سے اتنے مرعوب تھے کہ کوئی بات ہی نہ کر سکے۔

رابعہؒ نے خود ہی پوچھا۔" فرمائیے سفیانؒ! کیسے آنا ہوا ؟"

سفیان ثوریؒ نے کہا۔" میں اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ اس تکلیف سے آپ کو ہٹا لے۔"

رابعہؒ نے جواب دیا۔" سفیانؒ! کیا تمہیں اتنی سی بات بھی نہیں معلوم کہ یہ بیماری بھی اسی کے حکم سے ہے۔"

سفیانؒ نے مرعوب لہجے میں کہا۔" آپ درست فرماتی ہیں۔"

رابعہؒ نے کہا۔" تب پھر دوست کی مرضی کے خلاف تم نے یہ بات کیوں

کہی کہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس تکلیف کو دُور فرما دے۔"

سفیانؒ پریشان ہو گئے، گھبرا کر پوچھا۔ "آپ کو کسی چیز کی خواہش محسوس ہوتی ہے؟"

رابعہؒ نے جواب دیا۔ "سفیانؒ! تم سمجھدار انسان ہو اور ایسی باتیں کرتے ہو۔ آج سے بارہ سال سے میں تازہ خرما کھانے کی خواہش رکھتی ہوں۔ اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ خرمے یہاں کتنے ملتے ہیں اور کتنی بے قدری سے فروخت ہوتے ہیں۔ لیکن میں انہیں نہیں کھا سکی۔"

سفیانؒ نے پوچھا۔ "ان کے کھانے میں کیا قباحت ہے؟"

رابعہؒ نے جواب دیا۔ "میں تو غلام ہوں اور غلام کو خواہش سے کیا سروکار؟ میں ڈرتی ہوں کہ اگر میں کسی چیز کی خواہش کروں اور میری یہ خواہش خدا کو ناپسند ہو تو میرے لیے یہ کُفر ہو گا۔"

سفیان نے بے بسی سے عرض کیا۔ "آئندہ میں آپ کے کاموں میں دخل نہیں دوں گا۔ آپ میرے متعلق کچھ فرمائیں۔"

رابعہ نے جواب دیا۔ "سفیانؒ! اگر تم دنیا کو دوست نہ رکھتے تو ایک مرد ہوتے۔"

سفیانؒ نے کہا۔ "میں دنیا کو کہاں دوست رکھتا ہوں؟"

رابعہؒ نے جواب دیا۔ "تم باتیں بہت زیادہ کرتے ہو اور یہ دنیا داری ہے۔"

رابعہؒ کی اس بات نے سفیانؒ کو رُلا دیا۔ دُعا کی۔ "خدایا! رابعہؒ کہتی ہیں کہ میں دُنیا کو دوست رکھتا ہوں، تو مجھ سے راضی ہو جا، میں یہی درخواست کر سکتا ہوں۔"

رابعہؒ نے کہا "سفیانؒ! تجھے شرم نہیں آتی، اللہ کی رضا تو چاہتا ہے لیکن خود اللہ سے راضی نہیں ہے۔"

مشہور زمانہ صوفی مالک بن دینارؒ آپ کی ملاقات کو پہنچے تو دیکھا، رابعہ ٹوٹے ہوئے لوٹے سے وضو کر رہی ہیں۔ سامنے ایک بوسیدہ چٹائی بچھی تھی جس پر سرہانے ایک اینٹ کا ایک تکیہ رکھا ہے۔

مالک بن دینارؒ نے کہا "رابعہؒ! میرے ارادتمندوں میں بہت سے مالدار ہیں اگر آپ اجازت دیں کہ میں ان سے آپ کے لیئے کچھ طلب کرلوں۔"

رابعہؒ نے پوچھا "ابنِ دینارؒ! ایک بات تو بتاؤ، کیا مجھے، تمہیں اور دولت مندوں کو رزق عطا کرنے والی ایک ہی ذات نہیں ہے؟"

مالکِ بن دینارؒ نے جواب دیا "کیوں نہیں؟"

رابعہؒ نے کہا "تو کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ اللہ نے درویشوں کو ان کی غربت کی وجہ سے فراموش کر دیا ہے اور اسے محض امراء کو رزق دینا یاد رہ گیا ہے؟"

مالک بن دینارؒ نے کہا "نہیں ایسی بات تو نہیں ہے۔"

رابعہؒ نے کہا "جب یہ بات نہیں ہے تو پھر وہ ذات جو ہم سب کی ضروریات سے واقف ہے۔ ہمیں یہ کہاں زیب دیتا ہے کہ اپنی احتیاج کی یاددہانی کرائیں۔ اس شرم سے میں خاموش رہتی ہوں کہ وہ میری ضروریات سے اچھی طرح واقف ہے، پھر یاددہانی کرانے سے کیا حاصل؟"

ایک بار، لوگوں نے دیکھا آپ زار و قطار رو رہی ہیں، لوگوں نے پوچھا۔ "اس طرح رونے کا سبب؟"

رابعہؒ نے جواب دیا "لوگو! میں اس کے فراق سے خوفزدہ ہوں، میں

ڈرتی ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دمِ نزع یہ صدا نہ آ جائے کہ تُو لائقِ بارگاہ نہیں ہے۔"

حسن بصریؒ، رات بھر رابعہؒ کے گھر مقیم رہے اور حقیقت و معرفت پر گفتگو کرتے رہے۔ صبح ہوتے ہوتے حسن بصریؒ نے محسوس کیا کہ رابعہؒ علم و معرفت کا سمندر ہیں اور خود مفلس ہیں۔

حسن بصریؒ نے دورانِ گفتگو دریافت کیا "رابعہؒ! کیا تمہیں نکاح کی خواہش نہیں محسوس ہوئی ہے؟"

رابعہؒ نے جواب دیا "نہیں، بالکل نہیں۔"

حسن بصریؒ نے پوچھا "وہ کیوں ہے؟"

رابعہؒ نے جواب دیا "حسنؒ! نکاح کا تعلق تو جسم و وجود سے ہے اور جس کا وجود اپنے مالک میں ضم ہو گیا ہو تو اسے نکاح کی ضرورت کیونکر محسوس ہو سکتی ہے۔"

اس کے بعد ایک موقع پر رابعہؒ نے حسن بصریؒ کے پاس موم، سوئی اور بال روانہ کیے اور لے جانے والے سے کہا "تم حسنؒ سے کہہ دینا کہ موم کی مانند پگھل کر روشنی فراہم کرو، سوئی کی مانند برہنہ ہو کر مخلوق کی خدمت کرو اور جب تم ان دونوں امور کی تکمیل کر لو گے، تو تم بال کی مانند ہو جاؤ گے۔ اور کبھی بھی تمہارا کوئی خرابہ نہیں ہوگا۔"

بصرہ کے صوفیوں میں سے کسی ایک نے آپ کی مجلس میں دنیا کی شکایت شروع کر دی۔ رابعہؒ نے کہا "حضرت! معلوم ہوتا ہے آپ کو دنیا سے بہت لگاؤ ہے؟"

ان صاحب نے کہا "نہیں تو، میں دنیا سے نفرت کرتا ہوں۔"

رابعہؒ نے کہا "جناب یہ ایک کلیہ ہے کہ جس کا جس چیز سے لگاؤ

ہوتا ہے وہ اس کا ذکر بہت زیادہ کرتا ہے۔ اگر آپ کو دنیا سے واقعی نفرت ہوتی۔ تو اس کا اتنا زیادہ ذکر نہ کرتے۔"

ایک رات عبادت میں گزار کر صبح کے وقت سفیان ثوریؒ سے کہا "سفیانؒ! مجھے عبادت گزاری کی جو توفیق عطا ہوئی ہے میں اس کا کس طرح شکریہ ادا کروں۔ اسی لئے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بطورِ شکرانہ میں اس کا روزہ رکھوں۔" اس کے بعد آپ نے خدا کی بارگاہ میں روتے ہوئے عرض کیا۔ "خدایا! اگر تو نے مجھے روزِ محشر جہنم کی آگ میں جھونکا تو میں تیرا ایک ایسا راز افشا کر دوں گی کہ اسے سُن کر جہنم مجھ سے ایک ہزار سال کی مسافت پہ بھاگ جائے گا۔ خدایا! دنیا میں میرا جو حصّہ مقرر اور مقدّر ہے وہ اپنے معاندین کو دے دے اور میرا جو حصّہ عقبیٰ میں ہے اسے اپنے دوستوں میں تقسیم فرما دے۔ کیونکہ میں اپنے لیئے تجھی کو کافی سمجھتی ہوں۔ اے اللہ! اگر میں جہنم کے ڈر سے عبادت کروں تو تجھے اختیار ہے کہ مجھے جہنم میں جھونک دے۔ اور اگر تُو یہ سمجھتا ہے کہ میں جنّت کے لالچ میں مصروفِ عبادت رہتی ہوں تو تُو فردوس کو مجھ پہ حرام کر دے۔ اور اگر میری عبادت تیرے دیدار کی خاطر ہے تو پھر مجھے اپنے جمالِ عالم افروز سے مشرف فرما دے۔ اور اگر تو نے پھر بھی مجھے جہنم میں ڈال دیا تو میں یہ شکوہ کرنے میں حق بجانب ہوں گی کہ "دوستوں کے ساتھ دوستوں ہی جیسا سلوک ہونا چاہیئے تھا۔" اس کے بعد آپ نے دُعا مانگی۔ "خدایا! یا تو مجھے حضوریٔ قلب عطا فرما یا پھر بے رغبتی کی عبادت ہی کو شرفِ قبولیت بخش دے۔"

۱۸۵ھ میں آپ اٹھاسی ۸۸ برس کی ہو چکی تھیں، آہستہ آہستہ

صحت اتنی گر گئی کہ صاحب فراش ہو گئیں۔ صبح و شام عیادت کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ ایک دن آپ نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے عیادت کرتے والوں سے کہا: "لوگو! تم سب ذرا دیر کے لئے باہر چلے جاؤ، فرشتے آ رہے ہیں ان کے لیے جگہ چھوڑ دو۔"

عیادت گزار باہر چلے گئے۔ ذرا دیر بعد اندر سے آواز آئی۔ "....

....!" (ترجمہ: "اے مطمئن نفس! اپنے مولیٰ کی طرف لوٹ چل)"۔

اس کے بعد خاموشی طاری ہو گئی۔ عبادت کرنے والے دوبارہ اندر داخل ہو گئے۔ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ان کی رُوح قفسِ عنصری چھوڑ چکی ہے۔"

اسی رات کسی صوفی نے رابعہ کو خواب میں دیکھا، پوچھا: "رابعہ! منکر نکیر کے ساتھ کیسا معاملہ رہا؟"

رابعہؒ نے جواب دیا: "منکر نکیر نے مجھ سے پوچھا: "تیرا رب کون ہے؟ میں نے جواب دیا۔ واپس جاؤ اور اللہ تعالیٰ سے کہہ دو کہ جب تُو نے پُوری مخلوق میں ایک ناسمجھ عورت کو فراموش نہیں کیا تو پھر رابعہؒ تجھے کس طرح بھُول سکتی ہے۔ اور جب دنیا میں تیرے سوا اس کا کسی اور سے کوئی تعلق نہیں رہا تو پھر ملائکہ کے اس قسم کے سوال و جواب کا مطلب ہے؟"

عبدالواحد بن زید

حضرت خواجہ حسن بصریؒ کو جب یہ معلوم ہوا کہ ان کے حلقہ ارادت میں ایک ایسا شخص بھی موجود ہے جس کے مستقل گریہ وزاری کی وجہ سے کبھی آنسو خشک ہی نہیں ہوتے اور اسے درہم و دینار سے اتنی نفرت ہے کہ مالدار ہونے کے باوجود انہیں چھونے میں ایک گھن سی محسوس کرتا ہے۔ ایک دن حسن بصریؒ نے اپنے اس ارادت مند کو اپنے روبرو طلب کیا۔ یہ ایک نوجوان شخص تھا۔ آپؒ نے اسے نیچے سے اوپر تک دیکھا اور پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

جواب ملا۔ "عبدالواحد"

پھر سوال ہوا۔ "باپ کا نام؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "زید"

"خوب خوب!" حسن بصریؒ نے متبسم لہجے میں فرمایا۔ "تو تم زید کے بیٹے ہو! واہ بھئی واہ۔ کیا یہ درست ہے کہ تم مستقل گریہ وزاری کرتے رہتے ہو؟"

واحد نے نظر بھر کے اپنے پیر و مرشد کی طرف دیکھا۔ دونوں کی ایک

دوسرے سے نظریں ملیں تو حسن بصریؒ نے واحد کی آنکھوں کے دونوں گوشے آنسوؤں سے تر محسوس کیے۔ آپؒ نے کہا۔"واحد! زیادہ رونے کے انجام سے واقف ہو؟"

واحد نے جواب دیا۔"خوب اچھی طرح، بس یہی ناکہ بینائی جاتی رہے گی اور کچھ بھی؟"

حسن بصریؒ نے کہا۔"کیا یہ مصیبت کم ہے تمہارے نزدیک؟"

واحد نے عرض کیا۔"میری بینائی نے اب تک جو کچھ دیکھا ہے اس نے مجھے دنیا میں الجھا کر رکھ دیا ہے۔ اب میں اپنے مالک سے لو لگانا چاہتا ہوں اور اس کے بعد میں اپنے دل کی بینائی برقرار رکھنا چاہتا ہوں اور بس۔"

حسن بصریؒ نے اپنے ارادت مندوں سے کہا۔"لوگو! واحد سے تصوّف کا درس لو، یہ بہت بڑا آدمی ہے!"

اسی دن شام سے ذرا پہلے حسن بصریؒ، واحد کے گھر تشریف لے گئے انہوں نے دیکھا واحد اپنے دونوں ہاتھ دھونے میں مشغول ہیں اور انہیں کچھ پتہ نہیں کہ ان کے پیچھے کون کھڑا ہے۔ حسن بصریؒ کچھ دیر کھڑے یہ تماشا دیکھتے رہے۔ واحد نے ہاتھوں کو اتنی بار اور اتنی زور زور سے رگڑ رگڑ کر دھویا کہ کھال ادھڑ گئی۔ حسن بصریؒ نے دریافت کیا۔"واحد! کیا بات ہے؟ ان ہاتھوں پر یہ ظلم کیوں کر رہے ہو؟"

واحد نے گھوم کر اپنے پیر و مرشد کو دیکھا اور عرض کیا۔"حضرت ابھی کچھ دیر پہلے ایک حاجت مند آگیا تھا، اسے چند دیناروں کی ضرورت تھی میں یہ دینار اسے دینا تو ضرور چاہتا تھا لیکن اپنے ہاتھ سے چھونا نہیں چاہتا

تھا۔ اس وقت گھر میں غلام بھی موجود نہیں ہے ورنہ یہ دینار اسی سے دلوا دیتا۔ آخر میں نے اپنے ہاتھوں سے یہ دینار دے دیے اور اب دیناروں کی نجاست دھو کر اور ہاتھوں کو رگڑ رگڑ کر دُور کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

حسن بصریؒ نے رشک سے کہا "واحد! زر و مال سے نفرت اور بے نیازی تم پر ختم ہے۔"

آپؒ نے حضرت علیؓ سے بھی بالواسطہ فیض حاصل کیا تھا اور اپنی زندگی کے چالیس سال شدید عبادت و ریاضت میں صرف کر دیے تھے۔ آپؒ کی بے نیازی اور توکل کا یہ عالم تھا کہ گھر میں جو کچھ بھی تھا، درویشوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ذکرِ الٰہی میں زندگی گزار دی اور شادی تک کا خیال بھی نہ آیا۔

آپؒ نے جب یہ دیکھا کہ دنیاوی کاموں کی وجہ سے آپ کی عبادت و ریاضت متاثر ہو رہی ہے تو لوگوں کے مشورے پر گھر کے کام کاج کے لیے ایک غلام رکھ لیا۔ آپؒ نے غلام کو اس شرط پر رکھا تھا کہ وہ رات کو بھی حاضر رہا کرے گا۔

ایک بار آپ نصف رات کے بعد اٹھے اور غلام کو آواز دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ آپؒ نے اٹھ کر غلام کو اِدھر اُدھر تلاش کیا لیکن اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ باہری دروازہ اندر سے بند تھا اور غلام کی کوٹھری خالی پڑی تھی۔ آپؒ کو حیرت تھی کہ غلام اگر باہر جاتا تو دروازہ کھلا ہوتا اور گھر میں کہیں موجود نہیں تھا۔ کافی تلاش اور جستجو کے بعد بھی جب غلام کا کچھ پتہ نہ چلا تو آپؒ صبر کر کے اپنے حجرے میں چلے گئے۔

صبح فجر کی اذان کے وقت غلام آپؒ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ آپؒ

نے ناراضی سے دریافت کیا۔ "تم رات کہاں چلے گئے تھے؟"
غلام نے عرض کیا۔ "حضرت! افسوس کہ میں رات کی حاضری سے معذور رہوں گا۔"
آپ نے پوچھا۔ "وہ کیوں؟"
غلام نے کہا۔ "حضور بندہ پرور ہیں، بس یہ سمجھ لیجئے کہ میں کسی کام سے نکل جاتا ہوں۔ رات کی غیر حاضری کے عوض میں حضرت کی خدمت میں ایک دینار پیش کر دیا کروں گا جو حضرت مستحقین کی امداد و اعانت پر صرف فرما سکتے ہیں۔"
اس کے بعد فوراً ایک دینار آپؒ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس دینار پر سورۂ اخلاص کا نقش کھدا ہوا تھا۔ آپؒ نے یہ دینار لے لیا اور سکوت اختیار کیا۔
غلام ہر رات غائب ہو جاتا اور صبح ہوتے ہی ایک دینار آپؒ کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔
کچھ عرصہ بعد، غلام کی غیر حاضری کے دوران، نصف رات کے بعد پاس پڑوس کے لوگوں نے آپؒ کے دروازے پر دستک دی۔ آپؒ نے اپنے حجرے میں سے بہت سی ملی جلی بے ہنگم آوازیں سنیں۔ کچھ لوگ آپس میں زور زور سے باتیں کر رہے تھے اور کچھ دروازہ پیٹنے میں مشغول تھے۔ آپؒ نے حجرے سے نکل کر دریافت کیا۔ "کون ہو تم لوگ؟ اور اتنی رات گئے کیا لینے آئے ہو؟" کئی آوازیں ایک ساتھ نکلیں۔ "حضرت! دروازہ کھولیے ہمیں آپ سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔"
آپ نے دروازہ کھول دیا۔ دروازے پر بہت سے پڑوسی جمع تھے۔

ان میں سے ایک عمر رسیدہ شخص آپ کے قریب پہنچا اور سوال کیا۔
"اس وقت آپ کا غلام کیا کر رہا ہے؟"

آپؒ نے پوچھا "میرے غلام سے تمہارا کیا کام آپڑا ہے؟"

اس شخص نے کہا "پہلے آپ میری بات کا جواب دیجئے پھر میں آپ کی بات کا جواب دوں گا۔"

آپؒ نے جواب دیا "میرا غلام عموماً رات کو موجود نہیں رہتا، کہیں چلا جاتا ہے۔"

ایک پڑوسی طنزاً بولا "اور آپؒ اس سے کبھی پوچھتے بھی نہیں کہ تو کہاں جاتا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "میں اس سے یہ سوال کیا کروں؟ کیونکہ خدا نے خود منع فرمایا ہے کہ ...... (ترجمہ۔ جستجو مت کرو) میں دوسروں کے ذاتی معاملات میں دلچسپی نہیں لیتا۔"

بوڑھے پڑوسی نے گہرا طنز کیا "کمال ہے جناب۔ یعنی اس سے آپؒ ایک دینار روز تو وصول فرما لیتے ہیں لیکن وہ یہ دینار لاتا کہاں سے ہے؟ اس سے یہ نہیں پوچھتے۔"

آپؒ نے جواب دیا "تم لوگ مجھے بلاوجہ مت پریشان کرو۔ ہاں اگر اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہتے ہو تو میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔"

پڑوسیوں نے ایک بار پھر کھسر پھسر شروع کر دی۔

آپؒ نے مزید فرمایا "کھسر پھسر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، باتیں صاف صاف کرو۔"

آخر میں ایک پڑوسی نے کہا "حضرت! آپ اللہ والے آدمی ٹھہرے،

آپؒ کا غلام ہر رات غائب ہو کر قبرستان سے کفن چوری کر کے فروخت کر دیتا ہے۔ اسی قیمت میں سے ایک دینار آپؒ کی نظر کر دیتا ہے۔ کیا آپؒ کے لیے یہ دینار جائز ہے؟"

آپؒ نے کہا: "بھئی ایک بات اب بھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ رات کو کون سا بازار کھُلا ہوتا ہے جہاں میرا غلام تمہارے بقول چوری کا کفن بیچ آتا ہے۔"

کسی بدمزاج پڑوسی نے کہا: "میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ان سادہ لوح بزرگ سے ان کے غلام کی شکایت کرنا فضول ہے۔ تم لوگوں نے دیکھ لیا اپنی شکایت کا انجام! میں تو یہ کہتا ہوں کہ اب تمہیں جو کچھ کرنا ہے خود ہی کر ڈالو۔ ان بزرگ سے اس کی شکایت کرنا فضول ہے۔"

کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں: "بھائی! تمہارا مشورہ سر آنکھوں پر، اس سلسلے میں واقعی جو کچھ کرنا ہے ہم خود ہی کر ڈالیں گے۔"

آپؒ نے کہا: "ابھی تم لوگ خاموش ہو جاؤ، میں پہلے خود اس کے جرم کی سراغ رسی کر لوں۔ اگر میں اس میں ناکام رہا تو میں آپ سب کو اجازت دے دوں گا کہ میرے غلام کے خلاف جو رویّہ مناسب سمجھیں روا رکھیں۔"

ایک سیدھے سادے پڑوسی نے آپ کے خیال کی تائید کی، بولا: "لوگو! حضرت واحد میاں درست فرماتے ہیں۔ ہمیں ذرا دیر صبر سے کام لینا چاہیے اور صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔"

تھوڑی دیر تک تو یہ سب آپس میں بحث و مباحثے کرتے رہے، آخر میں سبھی نے اس رائے سے اتفاق کیا اور واپس جاتے جاتے آپؒ سے کہتے گئے: "حضرت! ہم نہیں کہیں گے سرِ دست، لیکن ہم بہ ضرور جاننا

چاہیں گے کہ آپؒ نے اس سلسلے میں کیا کچھ کیا؟"

آپ نے جواب دیا "ہاں، تمہیں اس بات کی آزادی ہوگی کہ میرے غلام کے بارے میں جب چاہو، مجھ سے سوال کرنے آجاؤ۔"

اس رات آپؒ صدمے اور افسوس کی وجہ سے سو نہیں سکے، آپ کو اپنے غلام پر غصّہ بھی آرہا تھا اور افسوس بھی ہورہا تھا کہ دیکھو تو اس نالائق نے آپؒ کی مروّت اور شرارت سے کیا فائدہ اٹھایا؟

اسی رات، صبح، علی الصبح وہ اپنے غلام کا انتظار فرمارہے تھے کہ وہ آگیا اور ایک دینار آپؒ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

آپؒ نے اسے حقارت سے دیکھ کر جواب دیا "اٹھالے اپنا دینار اور جو کچھ میں دریافت کروں، اس کا صحیح صحیح جواب دے ورنہ میں تجھے اس گھر سے نکال دوں گا۔"

اس نے عرض کیا "حضرت! آپؒ اس پر اصرار نہ کریں، میں آپ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ میری رات کی غیر حاضری کا وہ سبب ہرگز نہیں ہے جو آپؒ غلطی سے سمجھ بیٹھے ہیں۔"

آپؒ نے پوچھا "اچھا تو بس یہ بتادے کہ تو رات کو چلا کہاں جاتا ہے؟"

غلام نے جواب دیا "میں کہہ چکا ہوں کہ آپ مجھ سے یہ سوال نہ کیجئے اور ایک بار پھر یہی عرض کروں گا کہ مجھے اپنے سوال کے جواب میں لب کشائی پر مجبور نہ کیجئے۔"

آپؒ نے خاموشی اختیار کی اور فیصلہ کرلیا کہ وہ رات میں غلام کا تعاقب کرکے موقعۂ واردات پر جاپکڑیں گے اور وہاں اس بُری طرح

لتاڑیں گے کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔

اس رات عشاء کی نماز پڑھ کر واحدؒ، غلام کی کوٹھری ہی میں چھُپ رہے۔ غلام نے کسی پریشانی یا تجسّس کا اظہار نہیں کیا۔ اس نے کوٹھری کے بند دروازے کی طرف دُور ہی سے اشارہ کیا۔ دروازہ فوراً کھل گیا۔ غلام کوٹھری سے باہر نکل گیا اور دروازے کی طرف بند ہونے کا اشارہ کیا۔ دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ آپؒ نہایت حیران ہو گئے، چُپ چاپ کوٹھری سے باہر نکلے اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ وہ آبادی اور قبرستان سے گزر کر ایک چٹیل میدان میں داخل ہو گیا۔ آپؒ کا دل دھک دھک کر رہا تھا اور اس بات سے خفیف اور شرمندہ ہو رہا تھا کہ کہیں پڑوسیوں کی بات سچ نہ نکل جائے۔ اس چٹیل میدان میں پہنچ کر غلام نے اپنے سارے کپڑے اتار دیے اور ٹاٹ کا ایک بڑا ٹکڑا احرام کی طرح جسم پر لپیٹ لیا اور نماز پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ واحد کا خیال تھا کہ یہ سلسلہ شاید زیادہ دیر نہ قائم رہے اور چند رکعت پڑھ کر کہیں اور چلا جائے لیکن غلام تو کچھ اس طرح خشوع و خضوع سے نماز پڑھنے میں مشغول تھا کہ اسے کسی بات کا ہوش ہی نہ تھا۔ اسی طرح صبح ہو گئی۔ ابھی فجر کی اذان میں ذرا سا وقت باقی تھا، آخر غلام نے مناجات شروع کر دی وہ خدا کے حضور گڑگڑا رہا تھا، "خداوندا مجھ پر رحم فرما۔ اے میرے بڑے آقا میرے چھوٹے آقا کی مزدوری مرحمت فرما۔"

ابھی اس کی دُعا ختم ہی ہوئی تھی کہ ایک سکّہ اس کے قدموں میں آ گرا۔ غلام نے سکّہ اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ واحدؒ یہ سب کچھ دیکھ کر ضرورت سے زیادہ پریشان ہو گئے۔ آپؒ نے اس دہشت پر قابو

پانے کے لیے دو رکعت نماز کی نیت باندھ لی اور نماز پڑھ چکنے کے بعد خدا سے توبہ و استغفار کرنے لگے کہ وہ سہو اور وہ سوءِ ظنی جو انہیں اب تک غلام کی جانب سے اپنے دل میں جاگزیں محسوس ہوتی رہی تھی، اس کی معافی چاہنے لگے۔ انہوں نے گڑگڑا کر خدا سے عرض کیا "اے اللہ! میں دنیا والوں کے کہے سننے میں آگیا اور اپنے متقی اور پرہیزگار غلام کے لیے بُرے بُرے خیالات کو دل میں جگہ دی، اب اس کی اصل حقیقت اور پاکی مجھ پر ظاہر ہو چکی ہے اس لیے میں نادم اور شرمسار ہوں، مجھے معاف کر دے۔"

وہ کچھ دیر اسی طرح گڑگڑاتے اور آنسو بہاتے رہے اور جب دل کو ذرا سکون ملا تو آپؒ اس نیّت سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے کہ اپنے غلام سے بھی معافی مانگ لیں اور اسے آزاد کر دینے کی خوشخبری سنائیں لیکن وہاں غلام کہیں نظر نہ آیا۔ وہ اِدھر اُدھر تلاش کرتے ہوئے دور تک چلے گئے لیکن غلام کا کہیں پتہ نہ چلا۔

مشرق سے سورج طلوع ہو رہا تھا اور اس کی روشنی میں گردوپیش کی ہر شے بہت صاف اور واضح دکھائی دے رہی تھی۔ غلام کا دُور دُور تک پتہ نہ تھا۔ آپؒ کو یقین ہو گیا کہ غلام گھر واپس جا چکا ہے۔ تھک ہار کر خود بھی جس راہ سے آئے تھے اسی سے واپس ہوئے لیکن انہیں یہ عجیب بات چند قدم چلنے کے بعد ہی محسوس ہو گئی کہ وہ جس راستے پر چل رہے ہیں، اجنبی اور غیر مانوس ہے۔ وہ بصرے میں ایک عرصے سے رہ رہے ہیں یعنی پیدا یہیں ہوئے تھے اور ہوش کی آنکھیں بھی یہیں کھولی تھیں لیکن اس وقت وہ جس جگہ موجود تھے یہاں پہلے

کبھی بھی نہ آئے تھے اور اختیار کیا ہوا راستہ غیر مانوس اور اَن دیکھا تھا کہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس طرف چلیں جو اپنے گھر پہنچ جائیں، آپ پھر اسی جگہ واپس چلے گئے جہاں سے چلے تھے۔ ان کی پشت پر ایک گھنا جنگل تھا۔ وہ ایک درخت کے تنے سے پشت لگا کر بیٹھ گئے کہ کوئی مسافر سامنے سے گزرے تو اس سے راستہ پوچھ کر یہاں سے چل پڑیں۔

کافی دیر بعد ایک سیاہ رنگ کے گھوڑے پر سفید بُراق جیسے کپڑے پہنے ایک سوار گزرا۔ اس نے واحدؒ کو دیکھتے ہی حیرت سے پوچھا "عبدالواحد! تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟"

آپؒ نے پوچھا "کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟"

"ہاں، میں تمہیں خوب اچھی طرح پہچانتا ہوں اور تمہیں یہاں دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں۔"

آپؒ نے پورا واقعہ سنا کے عرض کیا "بھائی! میں اس طرح یہاں آکر پھنس گیا ہوں۔ بصرے واپس جانا چاہتا ہوں لیکن راستہ نہیں مل رہا، سمجھ میں نہیں آتا کہ گھر تک کس طرح پہنچوں؟ اگر تم میری رہنمائی کر سکو تو کر دو۔ بہت شکر گزار ہوں گا۔"

سوار بے اختیار ہنس دیا، بولا "عبدالواحد! اگر میں تمہاری رہنمائی کر بھی دوں اور تمہیں ایک تیز رفتار گھوڑا بھی میسّر آجائے تو تمہیں بصرے تک پہنچنے میں تقریباً دو برس لگ جائیں گے۔"

واحد بہت زیادہ گھبرا گئے، بولے "تب پھر میں گھر تک کس طرح پہنچوں گا؟"

سوار نے جواب دیا "اس کی بس ایک ہی آسان راہ ہے!"

آپؒ نے بے چینی سے پوچھا" وہ کیا، خدارا جلدی بتاؤ۔ میں بہت پریشان ہوں"

سوار نے جواب دیا" تمہارا غلام رات کو پھر آئے گا، تم اس کا انتظار کرو اور اسی کے ساتھ واپس چلے جانا"

سوار تو یہ کہہ کر چلا گیا اور آپؒ اپنے غلام کی واپسی کی اُمید میں رات کا انتظار کرنے لگے۔

کہاں کا آرام، کہاں کا کھانا، کیسا پانی، سنسان ویرانے میں شام اور پھر رات کا انتظار اور اپنی بے بسی کا احساس، ان کا عجیب سا حال ہو رہا تھا۔ جب سورج نے مغرب میں جھکنا شروع کیا تو رات کی آمد نے انہیں بہت زیادہ بے چین کر دیا۔ شام گزری، رات آئی اور پھر عشاء کے بعد انہیں سامنے کے میدان سے ایک سایہ آتا دکھائی دیا۔ آپ نے محسوس کیا وہ اپنے سر پر کچھ اٹھائے ہوئے ہے۔ آپؒ کی خوشی کی انتہا نہ رہی بے ساختہ اس کی طرف بڑھے اور غلام کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ غلام کے سر پر ایک خوان رکھا تھا، اس نے خوان اتار کر آپؒ کے سامنے رکھ دیا اور افسوس کرتا ہوا بولا" میرے آقا! مجھے بہت افسوس ہے کہ آپؒ کو بڑی پریشانی اٹھانی پڑی۔ آپؒ کو میرا پیچھا نہیں کرنا چاہیئے تھا"

آپؒ نے کہا" میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں، اس خوان میں کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا" کھانا، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپؒ سارا دن بھوکے رہے ہیں"

آپؒ نے کھانا کھا کر ایک بار پھر شرمندگی اور خجالت کا اظہار کیا

"میں اپنی سوءِ ظنی اور تیرے تعاقب پر بہت نادم ہوں۔"

غلام نے کہا: "آقا! میں عبادت کروں گا، آپ بھی نماز پڑھ لیں، جب یہاں سے چلوں گا تو اپنے ساتھ آپ کو بھی لے چلوں گا۔"

واحدؒ نماز پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ صبح سے ذرا پہلے غلام نے آپ سے کہا: "آقا! چلنے کے لیے تیار ہو جائیے، میں واپس جا رہا ہوں۔"

یہ فوراً تیار ہو گئے۔ غلام نے آپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ زیرِ لب کچھ پڑھ رہا تھا۔ وہ جدھر سے آیا تھا، اسی طرف روانہ ہو گیا۔ ابھی یہ دونوں کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ واحد کو ایک بستی کے آثار نظر آنے لگے۔ انہوں نے بستی میں داخل ہو کر غور سے دیکھا تو یہ بصرے کا وہی محلہ تھا جس میں ان کا مکان تھا۔ ان کے مکان کا دروازہ ان کے سامنے تھا۔ واحدؒ کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

غلام نے آپؒ سے عرض کیا: "میرے آقا! کیا آپ نے میری آزادی کی نیت نہیں کر رکھی ہے؟"

آپؒ نے جواب دیا: "تو درست کہتا ہے۔ بے شک میں تجھے آزاد کر رہا ہوں۔"

غلام نے کہا: "اس طرح نہیں بلکہ میں اپنی آزادی کی قیمت ادا کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کے بعد اس نے جھک کر زمین سے ایک پتھر اٹھایا اور واحدؒ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "میری طرف سے یہ حقیر سا معاوضہ قبول فرمائیں۔"

آپؒ نے اس پتھر کو روشنی میں لے جا کر دیکھا تو وہ سونے کا نکلا۔ آپؒ فوراً واپس آئے اور غلام کو تلاش کیا لیکن وہ جا چکا تھا۔ اس کے چلے جانے

کا آپؒ کو بے حد ملال ہوا اور ایک عرصے تک حسرت سے اس کا ذکر کرتے رہے۔

کچھ دنوں بعد آپؒ کے پڑوسیوں نے آپؒ سے دریافت کیا "حضرت! آپ کا وہ کفن کھسوٹ غلام نظر نہیں آتا، کیا آپ نے اسے نکال دیا؟"

پڑوسیوں کے اس لب و لہجے سے آپؒ کو تکلیف پہنچی۔ غلام کی پوری تفصیل سنا کر آپؒ نے افسوس سے کہا "اسے جس طرح تم لوگ نہیں پہچان سکے تھے، میں بھی لاعلم رہا اور جب اس کی اصل شخصیت کا انکشاف ہوا تو وہ میرے پاس سے رخصت ہو چکا تھا۔"

❊ ❊ ❊ ❊

آپؒ کا زہد و تقویٰ اور کشف و کرامات کا شہرہ حجاز تک پہنچ گیا۔ چند قریش آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سب کی مالی حالت بہت خراب تھی۔ آپؒ نے ان اہل قریش سے پوچھا "تم لوگ میرے پاس کسی خاص مقصد سے آئے ہو یا یوں ہی ملاقات کرنے؟"

ان لوگوں نے جواب دیا "حضرت! آپ سے کیا پردہ، اصل واقعہ یہ ہے کہ ہماری معیشت تباہ ہو چکی ہے اور اس لائق نہیں رہ گئے ہیں کہ کوئی کام کر کے بال بچوں کے لیے روزی مہیا کر سکیں۔ آپؒ کے پاس اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ آپؒ کا شہرہ سنا ہے اور اب دیکھتے ہیں کہ آپؒ ہماری کیا مدد کرتے ہیں!"

آپؒ اپنی جگہ سے اٹھے اور حجرے میں جا کر سربسجود ہو گئے۔ روتے ہوئے فرمایا "یا اللہ! اہلِ قریش کے چند لوگ میری اس حیثیت کا اندازہ لگا کر میرے پاس آئے ہیں جو مجھے تیرے ذکر و فکر سے حاصل ہوئی ہے

وہ مجھ سے اپنی معیشت کی بہتری کی دعا اور اس کے اثر کے طالب ہیں اس وقت تو ہی میری عزت آبرو بچا سکتا ہے۔ اپنے اس عاجز کو شرمندگی سے بچا لے۔"

آپؒ ابھی دُعا میں مشغول ہی تھے کہ مہمان قریش آپؒ کے پاس حجرے میں پہنچ گئے۔ انہوں نے آپؒ کے سامنے بہت سارے دینار رکھ دیے اور عرض کیا "حضرت! خدا نے آپؒ کو جب اتنی ساری دولت دے رکھی ہے تو آپؒ کا ہماری استدعا سُن کر، جواب دیے بغیر اپنے حجرے میں چلا آنا کچھ عجیب سی بات ہے۔"

آپؒ نے ان دیناروں کو دیکھ کر حیرت سے پوچھا "یہ تمہیں کہاں سے ملے ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا "آپ کی چھت سے۔ ہم حیران ہیں کہ آپؒ نے انہیں اپنی چھت کے کس حصے میں چھپا رکھا تھا؟ یہ اچانک ہم پر اس طرح برسنے لگے گویا کوئی تھیلی پھٹ گئی ہو اور یہ اس میں سے بکھر پڑے ہوں۔"

آپؒ نے جواب دیا "لوگو! میں نے ان دیناروں کو نہ تو کہیں چھت میں چھپایا تھا اور نہ اس گھر میں کہیں اور دینار موجود ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اس طرح خدا نے مجھے شرمندگی اور ندامت سے بچا لیا ہے اور کچھ نہیں۔"

قریش کے لوگوں کو آپؒ کی باتوں پر کچھ یقین آیا کچھ نہیں آیا۔ لیکن انہیں تو کافی دینار مل چکے تھے اس لیے شکریہ ادا کر کے اپنی راہ لی۔

آپؒ کہیں تشریف لے جا رہے تھے کہ ایک بے آب و گیاہ ویرانے

میں ایک ضعیف بیمار کو دھوپ میں پڑے دیکھا۔ آس پاس درختوں کا نشان تک نہ تھا۔ آپؒ اس کے بڑھاپے اور بیماری سے پریشان ہوئے اس کے سرہانے جا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ بوڑھا دھوپ کی تمازت سے بے حال ہو رہا تھا۔ آپؒ نے اسے مخاطب کیا۔" بڑے میاں! آپ اس ویرانے میں کس طرح آ گئے؟"

بوڑھے نے آنکھیں کھول دیں۔ نہایت کمزور آواز میں بولا۔" کون؟ تو عبدالواحدؒ، زید کے بیٹے؟"

آپؒ نے جواب دیا۔" ہاں، میں ہوں۔ خواجہ عبدالواحد، زید کا بیٹا۔"

بوڑھے نے کہا۔" خواجہ! میں ایک عرصہ سے بیمار چلا آ رہا ہوں، اس پر بڑھاپے نے اور زیادہ ناکارہ کر دیا ہے۔ گھر والوں نے مجھے بیکار اور غیر مفید سمجھ کر اس ویرانے میں مرنے کے لیے ڈال دیا ہے۔"

آپ نے افسوس سے کہا۔" لیکن یہاں تو سائے اور پانی کا بھی گزر نہیں۔ جیو گے کس طرح؟"

بوڑھے نے جواب دیا۔" انہوں نے مجھے یہاں مرنے کے لئے تو ڈالا ہے۔"

آپؒ نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ دُور مشرق میں بادلوں کے ٹکڑے منتشر ہو رہے تھے۔ آپؒ نے دُعا کی۔" خدایا! میں تجھ سے یہ نہیں کہتا کہ تو اس بے آب و گیاہ ویرانے کو فوراً سبزہ زار میں بدل دے لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ تو بادلوں کے ٹکڑوں کو حکم دے کہ وہ یہاں اس ضعیف اور بیمار کے اوپر آ کے سایہ کر دیں۔ یہ پانی کو ترس رہا ہے، بادلوں کو حکم دے، اسے سیراب کر جائیں۔ میں اپنے لیے کچھ نہیں چاہتا، اس

بے یار و مددگار کی تیرے سوا اور کون مدد کر سکتا ہے۔"

مشرق کے بادلوں نے اسی وقت اس بوڑھے کی طرف حرکت شروع کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے دھوپ کی تمازت سے جہنم زار ویرانہ بادلوں کے زیر سایہ آ گیا اور بوند اباندی کے ساتھ ہی خنک ہواؤں نے جھلسا دینے والے ماحول کو پُر لطف اور کیف آور بنا دیا۔

بوڑھے نے دُعا کی زود اثری کو جو دیکھا تو عرض کیا "حضرت! میں آپؒ سے اور کچھ نہیں چاہتا، آپؒ میرے حق میں خدا سے یہ دُعا کریں کہ وہ مجھے صحت یاب کر دے تاکہ میں اس ضعیفی میں بھی کسی کا دستنگر یا بار نہ بنوں۔"

آپ نے دعا کی "اے اللہ العالمین! تو سمیع و بصیر ہے تو دیکھ بھی رہا ہے اور سُن بھی رہا ہے کہ یہ پریشان حال بیمار بوڑھا مجھ سے کیا کہہ رہا ہے، تیری عنایات اور مہربانیوں نے تیرے بندوں میں مجھے معزز اور فیض رساں مشہور کر دیا ہے لیکن میں جو کچھ بھی ہوں تیری نوازش اور مہربانی سے ہوں۔ اگر تو چاہے گا تو میں اپنی عزت قائم اور برقرار رکھ سکوں گا۔ ورنہ میں اس بیمار بوڑھے سے بھی کمتر سمجھا جانے لگوں گا۔"

بوڑھا آپؒ کے دعائیہ کلمات سنتا رہا اور آپؒ بدستور گڑگڑاتے رہے۔ یکایک بوڑھے نے اندر سے بشاشت اور توانائی سی محسوس کی اور ذرا سی دیر میں وہ اس لائق ہو گیا کہ آپؒ کا شریک سفر ہو سکے۔ بڑھاپے کا اثر تو اب بھی باقی تھا لیکن بیماری رخصت ہو چکی تھی۔ اس نے آپؒ کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور روتا ہوا بولا "خواجہ! اب میں بالکل ٹھیک ہوں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آپؒ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔"

بُوڑھا کچھ دُور تک تو آپ کے ساتھ چلا، اس کے بعد اپنے گھر

جلنے لگا، آپ نے فرمایا "بڑے میاں! دنیا کو تم نے اپنی آنکھوں اور تجربوں سے سمجھ لیا، اب تم دنیا والے سے لَو لگا لو اور دنیا داری کے ساتھ ساتھ دنیا والے کو کسی حال میں نہ بھولنا۔"

بوڑھے نے آنسوؤں کی نمی سے اللہ کو یاد رکھنے کا عہد کیا اور اپنے گھر چلا گیا۔

چند درویش آپؒ کے پاس آئے، پہلے تو وہ سب اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، فقر و استغنا، کشف و کرامات، عبد و معبود اور ذاکر و مذکور پر باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد اچانک درخواست "حضرت! پیٹ بڑی ظالم شے ہے۔ بھوک نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔"

آپؒ نے کہا "ارے تم نے پہلے کیوں نہ بتایا۔ کھانا ابھی حاضر کرتا ہوں۔"

درویشوں نے کہا۔ "کھانے کی تو کوئی بات نہیں لیکن ہم لوگ اس وقت حلوہ کھانا چاہتے ہیں۔"

"آپ لوگ حلوہ کھانا چاہتے ہیں!" آپ نے کسی قدر تردّد سے کہا۔ "خوب! اچھا بھائی آپ سب کو حلوہ ہی کھلاؤں گا۔ بس ذرا صبر کرنا ہوگا۔"

"بس ذرا دیر!"

اسی وقت کسی نے دروازے پر دستک دی۔ آپؒ اٹھ کر دروازے پر پہنچے اور دریافت کیا "کون ہو بھائی؟"

باہر سے کسی نے جواب دیا "کیا اندر خواجہ عبدالواحدؒ تشریف رکھتے ہیں؟ ذرا دروازہ تو کھولیے۔"

آپ نے دروازہ کھول دیا، بولے "میں ہی خواجہ عبدالواحد ہوں،

کہو کیا کام ہے مجھ سے؟"

وہ شخص ایک بہت بڑا قاب سر پر رکھے ہوئے تھا، اس نے جواب دیا "حضرت! اس قاب کو اتروا لیجیے۔ حاکم شہر نے حلوے کی یہ قاب آپؒ کی خدمت میں روانہ کی ہے تاکہ آپؒ اور آپؒ کے ارادت مند حاکم شہر کے حق میں دعائے خیر فرمائیں۔"

آپؒ نے حلوے کی قاب درویشوں کے سامنے لے جا کر رکھ دی اور خود حجرے میں جا کر بارگاہ ایزدی سر بسجود ہو کر رونے لگے، بولے "اے اللہ! تو میرا کتنا خیال رکھتا ہے۔ میں کس زبان سے تیرا شکریہ ادا کروں۔"

اس حلوے کو تمام درویشوں نے شکم سیر ہو کر کھایا لیکن آپؒ نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔

❖ ❖ ❖ ❖

دریائے دجلہ کے کنارے مسافروں کا ہجوم تھا۔ لوگ دوسرے کنارے تک پہنچنے کے لیے بہت بے چین تھے۔ کشتی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ان میں چند بے نیاز درویش بھی شامل تھے۔ کچھ دیر بعد مسافروں کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ دریا کے دوسرے کنارے سے آتی ہوئی کشتی کو خوشی سے دیکھ رہے تھے۔ لوگ اپنی اپنی جگہ پر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں کوئی نظم و ضبط نہ تھا بلکہ ہر کوئی عین اس جگہ کھڑے ہونے کی کوشش کر رہا تھا جہاں کشتی ٹھہرنے والی تھی۔ درویش ان سب کے پیچھے بے نیاز کھڑے تھے۔

کشتی جیسے ہی ساحل پہ رکی، دوسرے کنارے سے آنے والے مسافروں نے اترنے کی کوشش کی لیکن جانے والوں نے انہیں دھکّا دے

دے کر چڑھنے کی جد و جہد شروع کر دی۔ اس دھکا پیل میں چند مسافر پانی میں گر گئے۔ ملاح نے ڈانٹ کر کہا۔ "پہلے آنے والوں کو اتر جانے دو، اس کے بعد باری باری چڑھنے کی کوشش کرنا۔"

لیکن لوگوں پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر آنے اور جانے والوں میں معرکہ آرائی شروع ہو گئی۔ اس مار پیٹ میں کچھ زخمی ہوئے، کچھ پانی میں گر گئے اور کچھ کے لباس تار تار ہو گئے۔ بمشکل اترنے والے اُتر گئے اور چڑھنے والے چڑھ گئے۔ درویش ان کا تماشا ہی دیکھتے رہ گئے۔ جب ذرا سکون ہوا تو درویش بھی کشتی کی طرف بڑھے۔ ملاح نے ان کی صورت اور کیفیت سے ان کی بے بضاعتی اور تہی دستی کا اندازہ لگا لیا، پوچھا۔ "درویشو! کشتی میں قدم رکھنے سے پہلے یہ تو بتاؤ کہ تمہارے پاس کشتی کا کرایہ بھی ہے یا یوں ہی بغیر کرایہ ادا کیے پار اترنا چاہتے ہو؟"

کسی درویش نے جواب دیا۔ "ہمارے پاس کرایہ نہیں ہے اور ہم چند درویش ہی تو ہیں، کسی کونے میں کھڑے ہو جائیں گے۔"

ملاح نے سختی سے کہا۔ "خبردار جو میری کشتی میں قدم رکھا۔ اگر کرایہ ہے تو آجاؤ ورنہ یہیں ساحل پر ہی کھڑے کھڑے دریا کی لہریں گنو اور کشتی کے بہاؤ کا پُر لطف منظر دیکھتے رہو۔"

ملاح کی بات سنے درویشوں کو بہت دکھ پہنچایا۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور ساحل پر ہی بیٹھ گئے۔ وہیں معلوم نہیں کدھر سے عبدالواحدؒ آگئے۔ درویشوں سے پوچھا۔ "کیا بات ہے درویشو؟"

ایک درویش نے اپنی بپتا سُنا کے عرض کیا۔ "بابا عبدالواحدؒ! ہمارے پاس کرائے کی رقم نہیں ہے اور دریا کے پار اُترنا ہے، ملاح نے ٹھلنے

سے انکار کر دیا، اب سمجھ میں نہیں آتا، دجلہ کو کس طرح عبور کریں۔"

آپؒ نے دیکھا، کشتی بتدریج ساحل سے دُور ہوتی جا رہی تھی اور کشتی کے مسافر، درویشوں کو طنز و تمسخر کی نظروں سے دیکھ رہے تھے

آپؒ نے درویشوں سے کہا "چلو میں تمہیں دجلہ کے پار لیے چلتا ہوں۔"

درویشوں نے پوچھا "وہ کس طرح؟"

آپؒ نے جواب دیا "یہاں سے دجلہ کا دوسرا کنارہ دور ہی کتنا ہے۔ ابھی پار اترتے ہیں۔"

درویشوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آپؒ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ پانی میں اتر گئے اور درویشوں سے کہا "تم سب میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ، اللہ نے چاہا تو اس کشتی سے پہلے ہی دوسرے کنارے پر پہنچے جاتے ہیں۔"

درویش دجلہ کی گہرائی سے ڈرے، بولے "بابا عبدالواحد! کیا تمہیں دجلہ کی گہرائی کا علم نہیں ہے؟"

"خوب ہے لیکن میں تمہیں اس کے پایاب راستے سے لے جاؤں گا۔ تم لوگ وقت نہ ضائع کرو، میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔"

اتنا کہہ کر آپ دجلہ میں دوسرے کنارے کی طرف بڑھنے لگے آپؒ کی دیکھا دیکھی ایک درویش بھی پانی میں اتر گیا۔ پھر دوسرا اُترا پھر تیسرا، اس طرح سبھی آپؒ کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ انہیں حیرت تھی کہ دجلہ میں کسی جگہ بھی ٹخنوں سے زیادہ پانی نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد جب یہ لوگ دوسرے کنارے پر پہنچ گئے تو دیکھا کشتی ابھی تک دریا کی سطح پر ڈول رہی ہے۔ اس کی رفتار میں حیرت انگیز حد تک کمی آگئی تھی۔

جب ملاح نے درویشوں کو دوسرے کنارے پر پہلے ہی کھڑے

دیکھا تو مسافروں کے ساتھ خود بھی شرم و ندامت سے گر گیا۔

درویشوں نے عبدالواحدؒ سے پوچھا "اب آپؒ کہاں تشریف لے جائیں گے؟"

آپؒ نے جواب دیا "میں دجلہ کے اسی کنارے پر واپس جاؤں گا جہاں سے لے کر تمہیں آیا تھا۔"

درویشوں نے عاجزی سے عرض کیا "حضرت! آپؒ نے ہم پر جو کرم کیا ہے اس کے پیش نظر ہم آپ سے ایک اور درخواست کریں گے۔"

آپؒ نے کہا "کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟"

درویشوں نے کہا "یا عبدالواحد! جیسا کہ آپؒ ہماری حالت سے اندازہ لگا چکے ہوں گے کہ ہماری معاشی حالت بہت خراب ہے اور بظاہر سُدھرنے کے آثار بھی نہیں ہیں، آپ دُعا کریں کہ ہماری معاشی حالت بہتر ہو جائے۔"

آپؒ نے کہا "تم سب کی معاشی حالت بہتر تو ہو جائے گی لیکن اس کے لیے تم وعدہ کرو کہ خوش حالی میں خدا اور شرعی احکام کو فراموش نہیں کرو گے۔"

درویشوں نے اس کا عہد کیا اور اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

جب یہ لوگ اپنے اپنے فاقہ زدہ گھروں میں داخل ہوئے تو گھر کا منظر ہی کچھ اور تھا۔ ان کے گھروں خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ خوش ذائقہ لذیذ کھانے پک رہے تھے۔ گھر کی عورتوں اور بچوں کے چہروں پر خوشی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ درویشوں سے حیرت سے پوچھا "گھروں میں یہ خوش حالی کہاں سے آ گئی ہے؟"

عورتوں نے جواب دیا۔ "ہم اور تو کچھ جانتی نہیں، بس اتنا جانتی ہیں کہ دو دن گزرے ایک شخص دیناروں کی تھیلیاں لے کر آیا تھا، اس نے یہ تھیلیاں دیتے ہوئے کہا تھا کہ جب تمہارے شوہر واپس آئیں اور پوچھیں کہ یہ رقم کہاں سے آئی تو ان سے کہہ دینا کہ عبدالواحدؒ بن زید کے دوستوں میں سے ایک فقیر یہ مال وزر دے گیا ہے۔"

درویشوں کو عورتوں کے جواب سے بڑی حیرت ہوئی اور انہوں نے اپنی بیویوں کو پورا واقعہ سُنا کے بتایا کہ عبدالواحدؒ نے ان پر اور کیا احسان کیا ہے اور اس مال وزر کے لیے انہوں نے کس طرح پہلے ہی بشارت دے دی تھی۔

پوری رُوداد سُن کر عورتوں نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔ "درویشو! تم پر افسوس ہے کہ تمہیں ایک ایسا مردِ کامل ملا اور تم نے اس سے دنیا مانگ لی، حالانکہ مانگنے کی چیز تو عقبیٰ تھی۔"

درویش شرم سے گردنیں جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

✤ ✤ ✤

آپؒ نے فیصلہ کیا کہ بیت المقدس ضرور دیکھیں گے۔ مسلمانوں کا یہ قبلۂ اول کی سرزمین بھی ہے، آپؒ سراپا اشتیاق بن کر بیت المقدس کی طرف روانہ ہو گئے۔ کافی مسافت طے کرنے کے بعد آپؒ راستہ بھول گئے۔ بڑی کوشش کی کہ صحیح راہ پر پڑ جائیں لیکن ناکام رہے۔ اگر کسی سے آپؒ نے بیت المقدسؔ کا راستہ پوچھا بھی تو اس نے مذاق اڑا کر یہی کہا کہ "میاں کہاں بیت المقدس اور کہاں تمہاری یہ راہ، اس راہ سے تو تم کرمان ہوتے ہوئے خراسان اور ماوراءالنہر پہنچ سکتے ہو، بیت المقدس اس راہ پر کہاں!"

آپؒ پر پریشانی نے غلبہ کر لیا۔ اسی وقت اپنے سامنے سے ایک عورت آتی دکھائی دی، حواس باختہ، پریشان اور وحشت زدہ سی۔ آپؒ کو خیال گزرا کہ شاید یہ عورت بھی گم کردہ راہ ہے، آپ نے اس سے دریافت کیا۔" اے عورت! تجھے اس بات کا افسوس نہیں کرنا چاہیئے کہ میں تجھ سے مخاطب ہوں، بلکہ میں تو بس یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میری طرح تو بھی بیت المقدس کی راہ بھول چکی ہے کیونکہ بڑی دیر سے میں نے تیری پریشان حالی پر غور کیا تو اس امر کا انکشاف ہوا کہ میری طرح تو بھی راستہ بھول چکی ہے۔"

عورت نے ذرا تلخی سے جواب دیا۔" جناب محترم، میں اس بات پر خاصی پریشان بھی ہوں اور حیران بھی کہ تیرے جیسا مرد راہ نما بھی اپنی راہ سے بھٹک گیا حالانکہ یہ ایک بڑی حقیقت ہے کہ اس کا پہچاننے والا کبھی غلط راستے پر نہیں چل سکتا!"

آپؒ نے جواب دیا۔" لیکن میں واقعی راستہ بھول چکا ہوں اب اور کس طرح یقین دلاؤں۔"

عورت نے کہا۔" خواجہ واحدؒ بن زید! ایک بار پھر میری بات ذرا غور سے سُن۔" کچھ رُک کر بولی۔" اس کا پہچاننے والا کیونکر مسافر ہو سکتا ہے اور جس کے دل میں اس کی محبت ہوگی وہ گمراہ کس طرح ہو سکتا ہے!"

پھر واحدؒ سے کہا۔" میری لاٹھی کی موٹھ پکڑ کر میرے ساتھ چل۔"

واحدؒ نے اس کی لاٹھی پکڑ لی۔ عورت نے کہا۔" تو میرے آگے آگے چل۔"

آپؒ نے لاٹھی کا سرا پکڑ کر آگے آگے چلنا شروع کر دیا۔ ابھی

بمشکل سات آٹھ ہی قدم چلے ہوں گے کہ عورت نے کہا۔" زید کے بیٹے واحدؒ ! ذرا سامنے تو دیکھ، وہ کیا نظر آرہا ہے !"

آپؒ نے سامنے جو دیکھا تو بیت المقدس کی مسجد اقصیٰ کے مینار واضح دکھائی دینے لگے۔ آپؒ کو ان میناروں پر شک و شبہہ گزرا، سوچا اتنی جلدی بیت المقدس کس طرح آسکتا ہے۔ عورت سے پوچھا۔" محترم خاتون ! یہ مینارے کس مسجد کے ہیں ؟"

عورت نے جواب دیا۔" بیت المقدس کی مسجد اقصیٰ کے۔ کیوں، تجھے شک کیوں ہوا ؟"

آپؒ نے کہا۔" اس لیے کہ میں اتنی جلدی بیت المقدس پہنچ جانے کا دل میں خیال تک نہیں لا سکتا۔"

" آخر کیوں ؟ یہ کیوں ؟"

" آپؒ نے جواب دیا۔" کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جس جگہ میں نے تیری لاٹھی کو پکڑا تھا، وہاں سے بیت المقدس کا فاصلہ کئی ہفتوں کا تھا۔ پھر میں سات آٹھ قدم چل کر اتنی طویل مسافت کس طرح طے کر سکتا تھا۔"

عورت نے کہا۔" واحدؒ، زید کے بیٹے ! تیری سیر و سیاحت زاہدوں کی سیر و سیاحت ہے اور میری سیر عارفوں کی سیر ہے اور یہ نکتہ یاد رکھ کہ زاہد چلتا ہے اور عارف اڑتا ہے اور اب تو خود ہی فیصلہ کر لے کہ ایک چلنے والا کسی اڑنے والے کا کس طرح مقابلہ کر سکتا ہے۔" اس کے بعد وہ عورت غائب ہو گئی اور دوبارہ کہیں بھی نظر نہ آئی۔

∴ ∴ ∴

واپسی میں ایک جگہ آپؒ نے ایک حبشی کو سر پر لکڑیوں کا بوجھ

اٹھائے دیکھا۔ اس وقت آپؒ کے ساتھ ایک اور صاحب ایوب بھی سفر کر رہے تھے۔ آپؒ نے ازراہ مذاق اس حبشی سے دریافت کیا "اے حبشی! کیا تو بتا سکتا ہے کہ تیرا رب کون ہے؟"

حبشی نے افسوس سے کہا "تو مجھے نادان اور جاہل سمجھ کر اس قسم کا سوال کر رہا ہے یا کوئی اور بات ہے؟"

آپؒ نے جواب دیا "میں نے نہایت سنجیدگی سے یہ سوال کیا ہے۔"

حبشی نے لکڑیوں کا گٹھا زمین پر رکھ دیا اور آسمان کی طرف دیکھتا ہوا بولا "الٰہ العالمین! یہ مجھ سے میرے ایمان کا امتحان لے رہا ہے، تو اپنی قدرت کاملہ سے ان کے سوال کا کوئی ایسا جواب دے دے کہ اس کی زبان گنگ ہو جائے اور مجھ سے پھر کبھی ایسا لونگا سوال نہ کرے۔"

اسی وقت واحدؒ بن زید اور اس کے ساتھی ایوب نے یہ دلچسپ تماشا دیکھا کہ پورا گٹھا سونے کا بن چکا تھا۔ اس نے اس گٹھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "دیکھ میرا خدا وہ ہے جس نے لکڑیوں کو سونا بنا دیا، اب بول کیا کہتا ہے؟"

آپ نے پوچھا "کوئی اور ثبوت ہے؟"

اس نے اسی وقت دعا کی "خدایا! ان کو پہلے جیسا بنا دے۔"

لکڑیاں پھر لکڑیاں بن گئیں۔ حبشی نے آپؒ سے کہا "واحدؒ! عارفین سے سوال کرتے ہو، یاد رکھو ان کے عجائب فنا نہیں ہوتے۔"

واحدؒ اور ان کے ساتھی حبشی سے سوال کرنے پر شرمندہ ہو گئے۔

حبشی نے ان دونوں سے اچانک سوال کیا "تم دونوں کے پاس کچھ کھانے کو ہے؟"

جواب ملا، "نہیں"۔
حبشی نے پوچھا، "کچھ کھانے کی خواہش محسوس ہو رہی ہے؟"
خواجہ واحدؒ کے ساتھی ایوب نے جواب دیا، "ہاں بھوک تو محسوس ہو رہی ہے"۔
حبشی نے اپنے دامن میں ہاتھ ڈال کر جو باہر نکالا تو اس میں ایک پیالہ دبا ہوا تھا۔ پیالہ شہد سے لبالب بھرا ہوا تھا جس کا رنگ برف کی طرح سفید اور خوشبو مشک سے زیادہ تیز تھی۔ حبشی نے یہ پیالہ ان دونوں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، "اسے کھالو، یہ شہد کی مکھیوں کا نہیں ہے"۔
ان دونوں نے اسے کھایا تو پتہ چلا، اس سے بہتر شہد نہ تو انہوں نے پہلے کبھی کھایا تھا اور نہ آئندہ کھانے کا خیال تک لایا جا سکتا تھا ان دونوں کے چہروں پہ چھایا ہوا استعجاب حبشی نے بھی محسوس کر لیا۔ بولا، "تم تو مجھ سے خدا کی بابت سوال کر رہے تھے اور اب جو کچھ تم نے دیکھا اس پہ حیرت کر رہے ہو"۔
واحدؒ کے ساتھی ایوب نے کہا، "میں تمہاری کرامت پہ حیرت زدہ ہوں"۔
حبشی نے جواب دیا، "تو میرا یہ نکتہ بھی سن لو۔ جس نے کرامتوں پر حیرت کی، وہ عارف نہیں ہو سکتا اور جس نے تعجب کیا، سمجھ لو کہ وہ اللہ سے بہت دُور ہے"۔
ایوب نے کہا، "اور اگر کوئی شخص ان کرامتوں کو دیکھ کر خدا کی عبادت میں مشغول ہو جائے اس کی بابت تمہارا کیا خیال ہے؟"

حبشی نے جواب دیا "ان کرامتوں کو دیکھ کر جس نے اللہ کی عبادت شروع کی، وہ کرامتوں سے واقف ہے نہ اللہ سے۔"

خواجہ واحدؒ اور ایوب اس حبشی کی باتوں سے نہ صرف مرعوب ہوئے بلکہ اس کے مقام اور مرتبے کے آگے عقیدت اور احترام سے خود کو خم کر دیا۔

آپ نے اپنے ہمسفر ایوب سے کہا "اس دنیا میں عارفوں کی کمی نہیں اور انہیں پہچاننا ہی بہت بڑا عرفان ہے۔"

دونوں آگے بڑھے تو ان کا گزر ایک مسیحی عبادت گاہ میں ہوا۔ انہوں نے سوچا گرجے کے مسیحی عبادت گزار سے بھی بات کر لی جائے۔ جب یہ دونوں گرجے کے دروازے پر پہنچے تو وہاں راہب کو اپنے استقبال کے لیے کھڑا دیکھا۔ راہب کی وضع قطع سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ بڑی مدت سے گوشہ نشیں رہا ہوگا۔ بال بڑھے ہوئے تھے اور چہرے اور اعصاب میں ایک مُردنی سی چھائی ہوئی تھی۔

خواجہ واحدؒ اپنے ساتھی سمیت راہب کی خانقاہ میں چلے گئے۔

راہب نے عاجزی سے پوچھا "میں تم دونوں کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

واحدؒ نے جواب دیا "تمہارا اخلاق اور محبت سے پیش آجانا ہی ہمارے لیے بہت کچھ ہے۔"

راہب نے کہا "تم لوگ کہاں سے آرہے ہو؟"

آپ نے جواب دیا "بیت المقدس سے۔ ہم وہاں مسجد اقصیٰ کی زیارت اور انبیائے کرام کی سرزمین کے دیدار کو گئے تھے چنانچہ ان کی

زیارت سے روحانی خوشی حاصل ہوئی اور اب ہشاش بشاش بصرے واپس جا رہے ہیں۔"

راہب نے ایک سرد آہ بھری، بولا "تم خوش قسمت ہو کہ اس پاک سرزمین کی زیارت کرکے آ رہے ہو اور ایک میں ہوں کہ اس خانقاہ کے علاوہ کچھ جانتا ہی نہیں۔"

خواجہ واحدؒ نے پوچھا "تم اس خانقاہ میں کتنے عرصے سے رہ رہے ہو؟"

راہب نے جواب دیا "چوبیس سال سے۔"

پوچھا "یہاں تمہارا کوئی دوست، ہمدرد ہے؟"

جواب دیا "خدا، کیونکہ وہ سب سے بڑا اور قابلِ اعتبار دوست ہے اور یکتا اور بے نیاز بھی ہے۔"

آپؒ نے پوچھا "میں خدا کی بابت کوئی سوال نہیں کر رہا ہوں۔ مخلوق میں سے تمہاری کسی سے دوستی ہے؟"

اس نے ہنس کر جواب دیا "وحشی جانور۔"

آپؒ نے پوچھا "اس ویرانے میں تم کھاتے کیا ہو؟"

اس نے جواب دیا "اللہ کا ذکر، اس کی یاد۔"

آپؒ نے کہا "میں ماکولات میں سے پوچھ رہا ہوں۔"

اس نے جواب دیا "درختوں کے پھل اور زمین کی نباتات!"

آپؒ نے پوچھا "تمہیں خدا کی مخلوق میں سے کسی کی ملاقات کا بھی شوق ہوا کبھی؟"

جواب دیا "بس عارفین سے ملاقات کرنے کو جی چاہتا ہے، تم

دونوں کی پیشوائی اور ملاقات کے پیچھے بھی میرا یہی شوق کارفرما ہے۔"
آپ نے پوچھا "تم نے دنیا سے علیحدگی کیوں اختیار کرلی ہے؟"
جواب دیا "دنیا گمراہی اور ہدایت کی راہ میں ایک قزاق جیسی حیثیت رکھتی ہے۔"
آپؒ نے پوچھا "تمہارے خیال میں آدمی ہدایت کی راہ پر کب پہنچتا ہے؟"
راہب نے جواب دیا "جب وہ اللہ کے سوا، ہر شے کا خیال دل سے نکال دیتا ہے اور ہر وقت اللہ کی یاد میں محو ہو جاتا ہے۔"
آپؒ نے اپنے ساتھی سے کہا "تم نے اس راہب کی باتیں سنیں؟ کیا ان میں عرفان کی راہ کی نمائی نہیں پائی جاتی۔" پھر راہب سے کہا "تمہاری ساری باتیں دُرست ہیں لیکن اس میں اک ذراسی تبدیلی کر لو۔ تم یہ بھی کہتے ہو کہ محبّت خدا ہے اور خدا محبت ہے تو اس محبّت کو عام کر دو۔ اس خانقاہ سے باہر نکل کر اللہ کی مخلوق کی خدمت اور محبت کرو۔ دنیا مخلوق کے لیے بنی ہے اور خدا کی مخلوق میں سب سے بڑا درجہ انسان ہی کو حاصل ہے۔ اب اگر یہ انسان ہی اس دنیا کو بے کار سمجھ کر لات مار دے، گویا اس طرح انسان خدا کی کاریگری پہ عملاً یہ اعتراض کرے گا کہ اس نے دنیا جیسی بے کار چیز بنا ڈالی۔"
راہب آپ کی صورت دیکھتا رہا۔ پلک جھپکائے بغیر۔ تھوڑی دیر بعد ان دونوں نے اپنی راہ لی اور راہب نے وہ خانقاہ چھوڑ دی، باہر نکل آیا۔

دورانِ سفر آپؒ کا ایک جگہ بھی گزر ہوا جہاں برف کی تہیں جمی ہوئی تھیں، وہاں آپؒ نے ایک شخص کو دیکھا جو برف پر پڑا سو رہا تھا۔ آپؒ کچھ دیر اس کے سرہانے کھڑے رہے۔ جب وہ بیدار ہوا تو آپؒ نے پوچھا۔ "تو اس برف پہ نہایت بے نیازی سے سو رہا ہے، کیا تجھے سردی نہیں لگ رہی ہے؟" اس نے ہنس کر جواب دیا۔ "بابا عبدالواحد! یہ سوال تم کر رہے ہو! تم خود ہی سوچو کہ جس کے دل میں اللہ کی یاد اور محبت کی گرمی موجود ہو اس کا جسم سردی کس طرح محسوس کرے گا۔"

آپؒ بصرے واپس پہنچ کر وعظ و ارشاد میں مشغول ہو گئے۔

ایک دن آپؒ صدقات اور اللہ کی راہ میں مال و متاع دینے کے فضائل بیان فرما رہے تھے۔ آپؒ نے فرمایا۔ "لوگو! جب تم اللہ کے لیے اس کی مخلوق پہ خرچ کرو گے تو جانتے ہو اللہ تمہیں اس کا کیا اجر دے گا؟ وہ اس کے عوض تمہیں جنت میں ایسا گوشہ مرحمت فرمائے گا جہاں آنکھوں میں کھب جانے والی حور اس کے انتظار میں بیٹھی ہوگی۔"

اسی مجلس میں چار متمول بھائی بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک بھائی کے دل پر اس وعظ کا بڑا اثر ہوا۔ اس نے وعظ کے خاتمے پر گھر پہنچ کر اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں دے ڈالا اور فارغ ہو کر آپؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ "آپ نے جو کچھ فرمایا تھا۔ میں نے اس پر بہ خلوصِ دل عمل کر ڈالا، اب آپ مجھے ذکرِ الٰہی میں مشغول فرما دیں۔"

آپؒ نے اسے چند دعائیں بتائیں اور ہدایت کی کہ جب تک میں ان کے ورد سے منع نہ کروں تو انہیں پڑھتا رہے۔

وہ آپؒ ہی کے پاس رہنے لگا۔

ایک دن درود و وظائف کے بعد جب وہ سویا، اس نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔

اس نے دیکھا، وہ ایک سرسبز و شاداب باغ میں داخل ہو گیا ہے باغ میں ایک زمرد کا خوبصورت محل کھڑا ہے۔ اس محل میں بہت ساری حسین و جمیل عورتیں جمع ہیں۔ انہوں نے اس نوجوان کو دیکھ کر آپس میں چہ میگوئیاں شروع کر دیں۔ انہوں نے نوجوان کی صورت دیکھتے ہی ایک دوسرے سے کہنا شروع کر دیا "دیکھنا، وہ حور عین المرضیہ (آنکھوں کو اچھی لگنے والی حور) کا شوہر آ رہا ہے۔"

اس نوجوان نے ان کے قریب پہنچ کر دریافت کیا "ذرا بتانا تو تم میں میری بیوی عین المرضیہ کون سی ہے؟"

عورتوں نے جواب دیا "اللہ اللہ اے نوجوان تو کیسی بات کر رہا ہے کہاں ہم اور کہاں حور عین المرضیہ۔ ہم تو ان کی لونڈیاں تک ہونے کے لائق نہیں ہیں۔"

نوجوان نے پوچھا "پھر وہ کہاں ہے؟"

عورتوں نے جواب دیا "اگر تم اسے دیکھنا ہی چاہتے ہو تو اور آگے جاؤ۔"

یہ شخص اور آگے بڑھ گیا۔ وہاں ایک اور محل نظر آیا اور یہ محل پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت تھا۔ اس محل میں بھی نہایت حسین اور پری جمال دوشیزائیں موجود تھیں۔ انہوں نے بھی اس نوجوان کو دیکھ کر آپس میں کہنا شروع کر دیا "دیکھنا تو، وہ دیکھو شاید یہی وہ نوجوان ہے جسے

حور عین المرضیہ کا شوہر بنایا گیا ہے۔"

اس نوجوان نے آگے بڑھ کر پوچھا "معزز خواتین! کیا تم بتاؤ گی کہ تم میں حور عین المرضیہ کون ہے؟"

انہوں نے جواب دیا "اگر تم عین المرضیہ سے ملنا چاہتے ہو تو آگے جاؤ۔ ہم تو اس کی لونڈیاں بھی نہیں بن سکتیں۔"

وہ نوجوان اور آگے بڑھ گیا۔ آگے ایک اور باغ نظر آیا۔ اس باغ میں ایک نہایت حسین محل کھڑا تھا۔ یہ محل ان دونوں سے زیادہ خوبصورت تھا۔ یہ نوجوان اس محل میں داخل ہو گیا۔ یہاں پچھلی عورتوں سے زیادہ حسین دوشیزائیں جمع تھیں، اس نوجوان نے یقین کر لیا کہ ان میں حور عین المرضیہ ضرور موجود ہو گی۔ یہ ان کے قریب پہنچا اور نہایت نرمی سے سوال کیا۔ "معزز خواتین! کیا آپ بتائیں گی کہ آپ میں عین المرضیہ کون ہے؟"

ایک نہایت حسین عورت نے جواب دیا "جناب! ہم تو عین المرضیہ کی لونڈیاں ہیں اور آپ شاید آپ ہی ان کے شوہر ہیں۔"

نوجوان نے کہا "میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

عورت نے جواب دیا "اندر تشریف لے جائیے۔"

نوجوان کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ سامنے ایک زرتار پردہ لٹک رہا تھا۔ نوجوان پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔ وہاں ایک نہایت خوبصورت دوشیزہ بنی سنوری بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ نوجوان اشتیاق میں آگے بڑھا اور فرطِ بیقراری میں اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی لیکن دوشیزہ نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ نوجوان نے نہایت دلدوز چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر اس کے قدموں میں گر گیا۔ کچھ دیر بعد جب اسے ہوش

آیا تو اس دوشیزہ نے مسکراتے ہوئے اسے اپنے قریب بلایا۔ یہ اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اس نے ایک طرف کھسکتے ہوئے کہا "تم یہاں میرے پاس بیٹھ جاؤ۔"

وہ اس کے برابر ہی بیٹھ گیا۔ دوشیزہ کے پاس سے خوشبو کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ یہ نوجوان اسے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر یارائے دید نہ تھا۔ رُعب حسن نے اُسے مرعوب مگر بے اختیار کر رکھا تھا۔ آخر جب یارائے صبر نہ رہا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے اپنی آغوش میں لے لینا چاہا۔ وہ ذرا سمٹ کر دُور ہٹ گئی اور انداز دل رُبائی اور نرمی سے کہنے لگی "جناب! آپ اتنے بے قرار اور بے چین کیوں ہو رہے ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ہیں اور ہمیں ایک ہو جانے میں بس تین ساعتیں باقی ہیں۔ تین ساعتوں بعد ہماری وصل کی گھڑی آ جائے گی۔"

نوجوان نے خوشامدانہ درخواست کی "مرضیہ! تین ساعتیں بہت ہوتی ہیں۔ کیا یہ سب کچھ اس سے پہلے ممکن نہیں ہے؟"

"اگر یہ بات پہلے ممکن ہوتی تو میں آپ کی آغوش میں پڑی ہوتی۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ تین ساعتیں کتنی جلدی گزر جائیں گی۔ اللہ نے چاہا تو یہ دیکھتے ہی دیکھتے گزر جائیں گی۔"

نوجوان نے پوچھا "پھر اس کے بعد کیا ہو گا؟"

عین المرضیہ نے جواب دیا "پھر ہم دونوں شادکام ہو جائیں گے۔"

نوجوان نے ایک بار پھر اسے آغوش میں لے لینے کی کوشش کی لیکن وہ اُٹھ کر دُور چلی گئی "بس تین ساعتیں۔"

اس کے بعد نوجوان کی آنکھ کھل گئی۔ عین المرضیہ کی صورت اب بھی

اس کی آنکھوں میں گھوم رہی تھی۔ اس کی بے چینی اتنی بڑھی کہ وہ بے قراری میں ادھر اُدھر چلنے پھرنے لگا۔ کسی مرید نے اس کی بے قراری کی خبر خواجہ عبدالواحدؒ کو پہنچا دی۔ وہ فوراً اس کے پاس پہنچے اور بے چینی کی وجہ پوچھی۔ "او بے وقوف! یہ بے قراری کیسی ہے؟ آخر تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

نوجوان نے اپنا خواب سُنا کر کہا۔ "حضرت! اب میں عین المرضیہ سے کس طرح ملوں گا؟"

آپ نے اس کے کان میں کہا۔ "لیکن کیا تو یہ بھول گیا کہ اس نے تین ساعتوں بعد ملنے کا وعدہ کیا ہے!"

نوجوان نے کہا۔ "بیشک اس نے تین ساعتوں بعد ملاقات کا وعدہ کیا ہے۔ کیا اس کا یہ وعدہ واقعی درست ہے؟"

آپؒ نے جواب دیا۔ "عالمِ بالا میں جھوٹ نہیں بولا جاتا۔ تو اپنی بے چینی اور بے قراری سے پیچھا چھڑا اور تین ساعتوں کے گزر جانے کا انتظار کر۔"

آپؒ اسے تسلی دے کر چلے گئے۔

اسی دن بصرے کے قرب و جوار میں کسی جگہ جنگ کا آغاز ہو گیا۔ یہ جنگ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان چھڑی تھی۔ شہر کے لوگ جہاد میں شرکت کی غرض سے نکل کھڑے ہوئے۔ اس نوجوان کو بھی جوش آگیا اور دل سے عین المرضیہ کا خیال نکال کر جہاد میں شریک ہو گیا اور کفار پر شیر کی طرح جھپٹ پڑا۔ بہت سے کافروں کو ہلاک کر کے شہید ہو گیا۔ اس جنگ کا خاتمہ مسلمانوں کی فتح اور غیر مسلموں کی شکست و ہزیمت پر ہوا۔

خواجہ واحدؒ شہدا کی لاشوں میں اس نوجوان کی لاش تلاش کرتے رہے

آخر جب یہ لاش مل گئی تو آپؒ نے اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کا جلال دیکھا۔ ایک ایسا جلال، جس میں جمال کی بھی آمیزش تھی۔ آپؒ نے اس کی تجہیز و تکفین اور تدفین خود اپنے ہاتھوں سے کی۔ نماز جنازہ بھی آپؒ ہی نے پڑھائی۔ آپ نے خواب سے بیداری اور شہادت کے درمیانی وقت کا حساب جو لگایا تو پتہ چلا تین ساعتیں پوری ہو چکی ہیں"۔

جب آپؒ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو کمزوری نے آپؒ پر اتنا غلبہ پالیا کہ اٹھنا بیٹھنا تک محال ہو گیا۔ ایک دن آپؒ کو اپنی اس حالت پر نہایت افسوس ہوا۔ آپؒ نے خدا سے دعا کی "خدایا! میں تجھ سے یہ نہیں کہتا کہ تو مجھے بالکل ہی صحت یاب کر دے، میں یہ بھی نہیں کہتا کہ تو میری زندگی میں مزید اضافہ فرما دے لیکن میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تو مجھ میں اتنی طاقت ضرور پیدا کر دے کہ میں اپنے خادم کی عدم موجودگی میں خود سے وضو کر لوں اور نماز پڑھ ڈالوں۔ اس کے بعد جیسی تیری مرضی ہو، کر تا رہ"۔

اس دعا کا فوری اثر یہ ظاہر ہوا کہ آپؒ میں اتنی طاقت واپس آگئی کہ خود سے وضو بھی کر لیا اور نماز بھی ادا کر لی۔ نماز پڑھ چکنے کے بعد آپؒ لیٹ گئے اور ایسا محسوس کیا گویا توانائی زائل ہوتی جا رہی ہے۔ یہ کمزوری اتنی بڑھی کہ ۷ صفر ۷۷ اھ میں آپؒ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

آپؒ کے مرتبے کا اندازہ لگانے کے لیے اتنا بتلا دینا کافی ہے کہ خواجہ فضیلؒ بن عیاض آپؒ ہی کے مُرید اور خلیفہ تھے اور یہ خواجہ فضیلؒ بن عیاض وہی بزرگ ہیں جنہیں حضرت ابراہیمؒ ادہم کے پیر و مُرشد ہونے کا شرف حاصل ہے۔

بہاءالدین نقشبند

مشہد کے نواح میں سماسی نامی ایک غیر معروف قریہ تھا لیکن آٹھویں صدی ہجری کے خواجہ محمد بابا کے وجود سے اس قریہ کو شہرت دوام عطا کی۔ خواجہ محمد بابا پہ اکثر و بیستر استغراق و محویت کی کیفیت طاری رہتی، یہ حالتِ جذب میں ادھر اُدھر نکل جاتے۔ اسی حالت میں ایک دن وہ بخارا سے ایک فرسنگ دور کوشک ہنداں نامی جگہ سے گزر رہے تھے کہ ان کے قدم چلتے چلتے ایک دم رُک گئے، ان کی قوت شامہ وہاں کچھ محسوس کر رہی تھی، وہ زور زور سے سانس لینے لگے۔ اُن کے مریدوں نے ڈرتے ڈرتے دریافت کیا۔

"حضرت کیا محسوس فرمارہے ہیں؟ خیریت تو ہے؟"

بابا سماسی نے جواب دیا "ازیں خاک بوئے مردے می آید، زود باشد کہ کوشک ہنداں قصرِ عارفاں شود" (اس سرزمین سے ایک مرد کی خوشبو آتی ہے۔ جلد ہی ایسا ہوگا کہ کوشک ہنداں قصرِ عارفاں بن جائے گا۔)

مرید اور ارادت مند نادانوں کی طرح آپ کی شکل دیکھنے لگے۔ وہ اس کی وضاحت چاہتے تھے لیکن سماسی بابا نے سکوت اختیار کیا، اس بات کو ایک

عرصہ گزر گیا، بابا سماسی اپنے وطن میں ریاضت و مشقت میں لگے رہے، ان کے خلیفہ خواجہ امیر کلال نے ان سے کئی بار پوچھا۔ "حضرت! کوشک ہنداں سے متعلق جس مردِ حق آگاہ کی آپ نے بشارت دی تھی وہ ہنوز ہم سب کے دل و دماغ میں سوال کی طرح کھٹک رہا ہے، اس سے متعلق کچھ اور ارشاد فرمائیں۔"

بابا سماسی نے پُر کیف نظروں سے امیر کلال کو دیکھا اور جواب دیا۔
"بابا کلال! پریشان نہ ہو اس مردِ حق آگاہ کی تربیت کا فریضہ تمہیں کو انجام دینا ہوگا ہم خود اس کے منتظر ہیں۔"

امیر کلال خاموش ہو رہے۔

ایک عرصے کے بعد بابا سماسی کا گزر پھر کوشک ہنداں کے قریب سے ہوا اور آپ کے قدم ایک بار پھر رک گئے آپ کی قوت شامہ پھر تیز تیز کام کرنے لگی۔ آپ زور زور سے سانسیں لینے لگے۔ امیر کلال نے پوچھا۔
"حضرت! اب آپ کیا محسوس فرما رہے ہیں، کوئی خاص بات ہے؟"

بابا سماسی نے جواب دیا۔ "ہاں بابا امیر کلال! اب وہ خوشبو بہت تیز ہو چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ مرد اب پیدا ہو چکا ہے۔"

امیر کلال نے پوچھا۔ "حضرت! اگر وہ مردِ حق آگاہ پیدا ہو چکا ہے، تو وہ کہاں ہے اور اس کا دیدار کس طرح کیا جا سکتا ہے؟"

بابا سماسی نے آنکھیں بند کر لیں۔ نرمی سے بولے۔ "صبر، بابا امیر کلال صبر! اب زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔"

رات خاصی تاریک تھی، آسمان پر چاند کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا، ستارے ٹم ٹم کر رہے تھے، چاروں طرف سکوت طاری تھا اور اس

"گھُپ سکوت کے عالم میں بھی کسی کسی لمحے کہیں دور سے گیدڑوں کی آوازیں سنائی دے جاتیں۔ آس پاس کی بستیوں کے ٹمٹماتے چراغ انسانی وجود کی گواہی دے رہے تھے۔ اس سناٹے میں کسی نے بابا سماسی کے دروازے تھپتھپائے

آپ نے پوچھا "کون ہے؟"

کسی عمر رسیدہ بزرگ نے جواب دیا "دروازہ کھولیے ایک نووارد مہمان باریابی کا خواہشمند ہے!"

بابا سماسی نے امیر کلال سے کہا "بابا امیر کلال! ذرا دروازہ تو کھولنا۔ اس کے بعد آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی بولے "تمہیں جس کا انتظار تھا وہ دروازے پر کھڑا اجازت طلب کر رہا ہے!"

امیر کلال نے اضطراب و اضطرار میں فوراً ہی دروزاہ کھولدیا، ایک ادھیڑ عمر چند روزہ بچے کو گود میں لیے اندر داخل ہوگیا، اس نے اندر موجود لوگوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور بابا سماسی کی طرف بے اختیار بڑھا بچے کو ان کی گود میں ڈال دیا اور ادب سے عرض کیا "بابا! بندے کو سید بُرہان کہتے ہیں بارہ واسطوں سے میرا سلسلہ نصب حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام سے مل جاتا ہے۔" پھر بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ میرا پوتا ہے آپ کی بزرگی اور عظمت کا دُور دور تک شہرہ ہے، اس ناچیز کی درخواست ہے کہ اسے گود میں لے کر اس کے حق میں دُعا فرمائیں!"

بابا سماسی نے اشتیاق سے ہاتھ پھیلا دیے اور بچے کو گود میں لے کر سینے سے لگا لیا اور اس کی پیشانی کو چومتے ہوئے دریافت کیا۔

اس کی کیا عمر ہوگی؟"

بچے کے دادا نے جواب دیا "صرف تین دن۔"

بابا سماسی نے کہا "بابا محمد بہاؤ الدین! تم اس کی فکر نہ کرو، یہ میرا فرزند ہے، پھر اپنے مریدوں اور بطور خاص امیر کلال کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا "لوگو! یہ وہی بچہ ہے جس کی ہم خوشبو محسوس کیا کرتے تھے۔" پھر بابا کلال سے کہا۔ "بابا کلال! یہ بچہ بڑا ہو کر اپنے وقت کا قطب اور پیشوا ہوگا، یہ بہاؤ الدین ہے، دین کا نور، اس کی تربیت ہم تمہارے ذمہ کی۔ تم نہایت شفقت اور توجہ سے اس کی تربیت کرو گے۔ اگر اس میں کسی قسم کی کوتاہی ہوئی تو ہم تمہیں معاف نہ کریں گے۔"

امیر کلال نے ادب سے سر جھکا دیا۔ بولے "حضرت کے حکم کی خلاف ورزی کر کے مجھے اپنا دین اور دنیا تو خراب کرنی نہیں ہے۔"

کچھ دیر بعد دادا نے پوتے کو گود میں لے لیا اور اپنے گھر واپس چلے گئے۔

بہاؤ الدین کی عمر چار سال کی رہی ہوگی ان کا مزاج عام بچوں سے مختلف تھا، یہ تنہائی میں گھنٹوں گزار دیتے، اور معلوم نہیں کیا سوچا کرتے۔ ماں بچے کی عجیب و غریب عادتوں کا حیرت اور محبت سے مشاہدہ کرتی رہتیں گھر میں ایک گائے پلی ہوئی تھی، یہ چار سالہ بچہ گھنٹوں گائے پر نظریں جمائے دیکھتا رہتا، ایک دن ماں نے اس محویت کو ختم کر دیا بولیں۔

"بیٹے بہاؤ الدین! گائے میں کیا دیکھتے رہتے ہو؟"

بہاؤ الدین نے جواب دیا "اماں! میں اس بچے کو دیکھ رہا ہوں جو ابھی پیدا نہیں ہوا۔"

ماں نے گائے کے پھولے ہوئے پیٹ کو غور سے دیکھا اور دریافت کیا، "تو اس بچے کو کس طرح دیکھ رہا ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوا، تو بچہ دیکھ رہا ہے یا گائے کے پیٹ کو؟"

بہاؤالدین نے جواب دیا "اماں! میں اس کے بچے کو دیکھ رہا ہوں"
ماں کی حیرت اب بھی باقی تھی، پوچھا "کیا تو اس کے بچے کو دیکھ رہا ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوا ہے؟"

بہاؤالدین نے کہا "اماں میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کا وہی مطلب ہے جو آپ سمجھنے کے بعد بھی سمجھنا نہیں چاہتیں"

ماں نے پوچھا "اچھا یہ بتا کہ اس بچے کا رنگ کیسا ہے۔ اس کے رنگ و روپ میں کوئی خاص بات ہے؟"

"ہاں ایک خاص بات بھی ہے اس کے رنگ و روپ میں" بہاؤالدین نے جواب دیا "اماں بچے کا رنگ تو دھندلا سیاہی مائل ہے، لیکن اس کی پیشانی بالکل سفید ہے"

ماں خاموش ہو گئیں اور بہاؤالدین کی بات ذہن میں بٹھا لی، بچے کی یہ بات خاندان کے بعض دوسرے لوگ بھی سُن چکے تھے، ان سب کو بچے کی پیدائش کا انتظار تھا، آخر وہ گھڑی بھی آ گئی جب گائے درد سے بھیں بھیں کرنے لگی، خاندان کے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ بچہ پیدا ہوا اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی، وہ سنبھلا اور زمین پر گر گیا، پھر اٹھا اور پھر گرا۔ پورا خاندان اس سیاہی مائل اور سفید پیشانی والے بچے کو حیرت اور اشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔

بہاؤالدین سب سے دُور اور ان کی حیرتوں سے بے نیاز ایک گوشے میں فکر و محویت میں ڈوبے معلوم نہیں کیا سوچ رہے تھے۔

بہاؤالدین اٹھارہ برس کے ہو چکے تھے، ان کے والد سید جلال الدین ان کی شادی کر دینا چاہتے تھے لیکن یہ خود اس سے بچنا چاہتے تھے باپ

نے بیٹے کے ارادے کو بھانپ لیا اور کہا۔" تم بابا سماسی کی خدمت میں چلے جاؤ۔"

بیٹے نے پوچھا۔" وہاں میرا جانا کیا ضروری ہے؟"

" ہاں!" باپ نے جواب دیا۔" یہ میری خواہش ہے کہ تم وہاں جاؤ۔"

بہاؤالدین اسی وقت سماسی روانہ ہوگئے، مغرب کے بعد سماسی پہنچ گئے۔ بابا سماسی نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور ان کے چہرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔" کیا بات ہے بہاؤالدین؟"

بہاؤالدین نے شرمیلے لہجہ میں گردن جھکا کر جواب دیا۔" قبلہ والد صاحب کے حکم پر آپ کی خدمت میں حاضر ہوگیا، میں نہیں جانتا کہ آپ کی خدمت میں کیوں بھیجا گیا ہوں۔"

بابا سماسی نے کہا۔" اچھا تم رات بسر کرو۔ صبح بات ہوگی!"

بہاؤالدین رات کو بابا سماسی ہی کے حجرے میں پڑ رہے، رات کے پچھلے پہر چپکے سے اٹھے اور پاس کی مسجد میں چلے گئے، پہلے دو رکعت نماز پڑھی اس کے بعد سجدے میں گر کے گڑگڑانے لگے۔" الہ العالمین! تو خوب جانتا ہے کہ میں کتنا بوجھ اٹھا سکتا ہوں، میں نہیں جانتا کہ میں کتنی مصیبت کا بوجھ اٹھا سکتا ہوں۔ تو عالم الغیب ہے، مجھے اپنی مصیبتوں کا بوجھ اٹھانے کی مزید قوّت عطا فرما۔"

صبح بابا سماسی نے بہاؤالدین سے کہا۔" بیٹے! کیا تونے اپنے دعائیہ الفاظ پر غور کیا؟"

بہاؤالدین حیران تھے کہ رات کی دُعا کا بابا سماسی کو کیسے علم ہوگیا۔ آہستہ

سے بولے "ہاں میں نے مصیبتوں کا بوجھ اٹھانے کی مزید قوت اپنے خدا سے طلب کی تھی!"

بابا سماسی نے بہاؤالدین کو پیار و محبت کی نظروں سے دیکھا اور کہا۔ "بیٹے! یاد رکھو، ہمیشہ دُعا میں یہ کہنا چاہیئے۔ کہ الٰہی جو تیری رضا ہو اپنے اس ضعیف بندے کو اسی پہ قائم رکھ، خدا کی تو یہی مرضی ہوتی ہے کہ اس کے بندے پر مصیبت نہ آئے، لیکن اگر کسی مصلحت سے وہ بندے پر کوئی مصیبت نازل کر بھی دے تو یاد رکھو اسے اٹھانے اور برداشت کرنے کی قوت بھی عطا فرما دیتا ہے، اس لیے اختیار سے بلا نہیں طلب کرنا چاہیئے یہ گستاخی ہے۔"

بابا سماسی کی خدمت میں رہنے کا یہ اثر ہوا کہ وہ شادی سے بچ گئے۔ جب تک بابا سماسی زندہ رہے بہاؤالدین کی شادی نہیں ہوئی، ان کے بعد یہ سمرقند چلے گئے اور وہاں کے بزرگوں سے فیض حاصل کرتے رہے، سمرقند سے بخارا چلے گئے۔ اب کوشک ہنداں قصرعارفاں بن چکا تھا، انہوں نے قصرعارفاں میں سکونت اختیار کی اور یہیں شادی بھی کر لی، یہاں آپ نے ذریعہ معاش کی خاطر قالین بافی کا کارخانہ قائم کیا۔ ان قالینوں پہ طرح طرح کی نقشبندی ہوتی تھی، اس نسبت سے لوگوں نے آپ کو نقشبند کہنا شروع کر دیا۔

قصرعارفاں میں سید امیر کلال تشریف لائے اور بہاؤالدین سے کہا۔ "بہاؤالدین! میں تمہاری تربیت کے لیے آیا ہوں، کیونکہ جب تم تین دن کے تھے میں نے اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ محمد بابا سماسی کی ہدایت پہ یہ وعدہ کر لیا تھا کہ تمہاری تربیت میں کرونگا، سو میں آ گیا ہوں۔"

بہاؤالدین نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور تربیت حاصل کرنے لگے۔ تربیت کے خاتمے پر بابا کلال نے کہا۔" بہاؤالدین! میں نے اپنا عہد تو پورا کر دیا ہے لیکن مجھے یہ احساس بھی ہے کہ تمہاری استعداد بہت اعلیٰ ہے اس لیے میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ جس سے بھی فیض حاصل کرنا چاہو کرو۔"

بہاؤالدین سوچ میں پڑ گئے کہ اب کس سے تربیت حاصل کرنی چاہیئے ایک دن خواب میں دیکھا کہ مشہور بزرگ شیخ آنا ایک شخص کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہے ہیں کہ بہاؤالدین! ان کو پہچان لے اور مزید تربیت ان سے حاصل کر۔"

بہاؤالدین نے اس شکل کو اچھی طرح ذہن میں محفوظ کر لیا اور صبح ہوتے ہی اس کی تلاش میں نکل گئے، صبح سے شام ہو گئی اور شام سے دوسری صبح۔ اس طرح ایک عرصے تک اس شخص کو تلاش کرتے رہے لیکن وہ نہیں ملا۔ اس دوران یہ کئی بار امیر کلال کی خدمت میں بھی گئے، وہاں جہر باآواز بلند ہوا کرتا تھا، بہاؤالدین ذکر جہر سے بچتے تھے، اس لیے ایسے موقعوں پر یہ امیر کلال کے مریدوں کا ساتھ نہیں دیتے تھے، اور وہاں سے چُپ چاپ اٹھ آتے تھے، ان کی یہ روش امیر کلال کے مریدوں کو ناگوار گزرتی تھی، وہ اپنے پیر سے شکایت کرتے تھے۔" حضرت بہاؤالدین آپ کی اطاعت وانقیاد نہیں کرتے۔" امیر کلال سُنی ان سُنی کر دیتے، اسی طرح ایک دن امیر کلال کی خدمت میں تقریباً پانچ سو آدمی جمع تھے اور زور شور سے ذکر جہر جاری تھا، بہاؤالدین اٹھ کر چلے گئے۔ مخالفوں نے شکایت کی۔" حضرت آپ نے اس گستاخی کو ملاحظہ فرمایا۔ ہم سب کے لیے بہاؤالدین کا یہ طریقہ

ناقابلِ برداشت ہے۔"

امیر کلال نے غصے میں جواب دیا "بے شک ذکر جہر کو میں جائز قرار دیتا ہوں لیکن میں تمہیں سرزنش کرتا ہوں کہ تم میرے فرزند بہاؤالدین کے حق میں بدگمانی سے بچو، کیونکہ تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کی نظرِ خاص بہاؤالدین پر رہی ہے۔ اور اس معاملے میں میرا کوئی اختیار نہیں۔" پھر بہاؤالدین کو بُلا کر ارشاد فرمایا۔

"بہاؤالدین! کیا میں نے تمہیں یہ اجازت نہیں دے دی تھی کہ تم کسی اور سے مزید تربیت حاصل کرو۔"

بہاؤالدین نے کہا "حضرت! میں بہت دنوں سے اس پیرِ و مرشد کی تلاش میں ہوں جس کو میری مزید تربیت کے لیے خدا نے مقرر فرمادیا ہے۔"

امیر کلال نے کہا "بابا بہاؤالدین! بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا، جاؤ اس پیرِ مرد کو بخارا کے بازار میں تلاش کرو۔"

بہاؤالدین اسی وقت بخارا کے بازاروں میں چلے گئے اور ایک بازار میں خواب جیسی شکل و صورت کا آدمی مل گیا، آپ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پوچھا۔

"حضور والا کا نام!"

ان بزرگ نے جواب دیا "خلیل! کیوں کوئی کام ہے؟"

بہاؤالدین نے کہا "میں ایک عرصے سے آپ کو تلاش کر رہا تھا، یہ میرے لیے بڑی سعادت کی بات ہے کہ آپ یوں مل گئے۔"

بابا خلیل نے انہیں اپنی صحبت میں رکھ لیا اور یہ ان کی خدمت میں بارہ سال تک رہے، اس دوران خلیل کو ماوراء النہر کی حکومت مل گئی۔ مجلس

عام میں بہاؤالدین ان کے آداب سلطنت بجالاتے اور تنہائی میں محرم خاص بن جاتے۔ پھر خلیل کی سلطنت ان کے ہاتھ سے نکل گئی جس کا بہاؤالدین کو بڑا صدمہ ہوا اور ان کے دل سے دنیا کی قدر و قیمت بالکل ہی اٹھ گئی، یہ دل برداشتہ ہو کر بخارا کے ایک قصبے میں رہنے لگے۔

بہاؤالدین افتاں و خیزاں کہیں چلے جارہے تھے اچانک ایک طرف سے ایک مست الست رند نمودار ہوا اور بولا "بابا! تم تو ہمیں آشنا نظر آتے ہو۔"

بہاؤالدین نے جواب دیا "ہاں بابا، میں اس بات کا امیدوار ضرور ہوں کہ خدا کے دوستوں کی نظر کی برکت سے حق آشنا ہو جاؤں۔"

اس مست الست رند نے مزید پوچھا "تم رزق کس طرح حاصل کرتے ہو اور اس کے استعمال میں کیا طریقہ استعمال کرتے ہو؟"

بہاؤالدین نے جواب دیا "بابا! ابھی تک تو یہ طریقہ رہا ہے کہ جو کچھ مل جائے کھا لیتا ہوں، ورنہ صبر کر لیتا ہوں۔"

اس شخص نے طنزاً ہنس کر کہا "یہ کام تو بہت آسان ہے لیکن اصل کام تو یہ ہے کہ نفس کو توبہ کے مقام میں لے آؤ، کیونکہ ایسا کرنے میں بڑے فائدے ہیں اور اس کی پہچان یہ ہے کہ ان حالات میں اگر روٹی نہ ملے تو نفس سرکشی نہ کرے۔"

بہاؤالدین نے کہا "حضرت میں کسی نصیحت کا طالب ہوں۔"

اس شخص نے جواب دیا "بہاؤالدین! تم جنگل کی راہ لو اور اس دنیا اور اہلِ دنیا سے نفس کی خواہشات بالکل منقطع کر لو، تم تین دن تک اس راہ پر چلتے رہو۔ چوتھے دن تمہیں ایک پہاڑی کے دامن میں گھوڑی کی ننگی پشت پر ایک سوار بیٹھا دکھائی دے گا۔ تم اسے سلام کر کے آگے بڑھ جانا ابھی

تم اسے چھوڑ کر چند ہی قدم چلو گے کہ وہ تمہیں آواز دے گا اور پکار کے کہے گا کہ بہاؤالدین ذرا رکنا تو! میرے پاس ایک روٹی ہے اسے تم لیتے جاؤ۔ لیکن اس آواز پہ تم کوئی توجہ نہ دینا اور آگے بڑھ جانا۔

بہاؤالدین نے اسی وقت جنگل کی راہ لی اور آگے بڑھتے چلے گئے۔ چاروں طرف ہُو کا عالم تھا۔ یہ تین دن تک چلتے رہے، آخر یہ ایک پہاڑی کے دامن میں داخل ہو گئے۔ وہاں واقعی ایک شخص گھوڑی کی برہنہ پیٹھ پہ بیٹھا ہوا تھا اس نے انہیں دیکھتے ہی آواز دی "بہاؤالدین ذرا سننا تو!"

بہاؤالدین نے کوئی توجہ نہ دی اور برابر چلتے رہے۔ اس شخص نے کہا "بہاؤالدین میری طرف ایک نظر دیکھ تو لو"

بہاؤالدین نے پیچھے مڑ کر دیکھا وہ شخص روٹی ہاتھ میں لیے انہیں دکھا رہا تھا۔ بولا "سفر کی حالت میں ہو زادِ راہ بھی تو ساتھ لے لو"

بہاؤالدین نے پھر کوئی جواب نہیں دیا اور اپنا سفر جاری رکھا۔ یہ سوار گھوڑی کو دوڑا کر ان کے قریب پہنچ گیا اور ان کی راہ روک کر بولا۔

"بہاؤالدین! تم ایک بے غرض انسان ہو اور بے طمع، اگر مجھ سے کچھ نہیں لینا چاہتے تو میری نصیحتیں تو لیتے جاؤ"

بہاؤالدین نے کہا "ہاں تیری یہ چیز گوارا ہے، بول کیا نصیحتیں کرتا ہے؟"

اس شخص نے کہا "بہاؤالدین! اس دنیا کے لوگ کمزوروں، خستہ حالوں اور دردو مصیبت میں مبتلا لوگوں کی دلجوئی نہیں کرتے تمہیں ان کی طرف توجہ کرنی چاہیئے اور تکبّر اور غرور سے بچنا چاہیئے لوگوں سے عاجزی سے پیش آنا چاہیئے"

بہاؤالدین نے یہ نصیحتیں گرہ میں باندھ لیں اور زندگی بھر ان پر کاربند رہے۔

ایک دن صبح ہی صبح یہ کہیں جا رہے تھے، سامنے لق ودق میدان تھا، انہوں نے ایک گرگٹ کو دیکھا جو آفتاب پر نظریں جمائے اپنے آس پاس سے بے خبر محو نظارہ تھا، بہاؤالدین نے خود سے کہا۔" بہاؤالدین تو اس گرگٹ سے سبق حاصل کر، اس کی محویت پر غور کر اور سوچ کہ کیا تجھ پر بھی یہ حالت ذوق کبھی طاری ہوئی ہے۔"

آپ نے گرگٹ کو مخاطب کیا۔" اے ذات باری تعالیٰ میں گم ہو جانے والے بے زبان! تو میرے لیے بھی خدا سے دعا کر کہ وہ مجھے بھی یہی جذب و مستی عطا فرمادے۔"

گرگٹ نے پیچھے مڑ کر دیکھا، اس نے اپنی پشت زمین سے ٹکادی اور پھر منہ آسمان کی طرف اٹھادیا، بہاؤالدین نے خوش ہو کر کہا۔" میں تیرا شکرگزار ہوں کہ تو نے میرے لیے دعا کرنا قبول کر لیا۔"

اس رات بہاؤالدین نے زیورتون نامی مقام میں اقامت اختیار کی، وہ مسجد میں ایک ستون کے پاس قبلہ رو ہو کر بیٹھ گئے، اچانک انہیں ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ان پر خود فراموشی طاری ہوتی جا رہی ہے، ان کی نفی ہوتی جا رہی ہے۔ ان کا مادی وجود کثافت سے پاک ہوتا چلا گیا، وہ ہوا سے زیادہ ہلکے ہوتے گئے، ان کا جسم خوشبو کی طرح لطیف ہوتا چلا گیا۔ پھر ایسا لگا جیسے وہ اپنے وجود جسمانی کے ساتھ وہاں موجود ہی نہ ہوں ہر قسم کے احساس سے عاری وہ کافی دیر تک اس عجیب و غریب کیفیت میں مبتلا رہے، اس عالم میں انہوں نے ایک غیبی آواز سنی، کوئی کہہ رہا تھا۔

"بہاؤالدین! تو نے اپنا مقصود پا لیا۔ تجھے فنائے کامل عطا کی گئی فنائے کامل یعنی عدم شعور، تجھے ذات احد میں غرق کر دیا گیا کہ اب تیرے لیے ہوش کا کہیں وجود تک نہ رہا۔"

ان پر کافی دیر تک یہ کیفیت طاری رہی، جب یہ کیفیت دور ہوئی تو انہیں اس بات کا اطمینان ہو گیا کہ انہیں فنائے کامل عطا کی جا چکی ہے تصوف کا وہ اعزاز جو بہت کم لوگ ہی حاصل کر پاتے ہیں یہ سیدھے امیر کلال کی خدمت میں چل دیے۔ اس وقت ان کا عجیب حال تھا، ان کے جسم پر پوستین تھی، سردی کا موسم تھا اور امیر کلال وہاں سے کافی دور تھے چلتے چلتے ان کے پیروں میں چھالے پڑ گئے، یہ ابھی راہ ہی میں تھے کہ سرد ہوا چلنے لگی، موسم کی سختی کا خیال کیے بغیر یہ امیر کلال کی خدمت میں پہنچ گئے، امیر کلال کے گرد بہت سارے درویش بیٹھے تھے، انہوں نے بہاؤالدین کو سرسری نظر سے دیکھا اور مضحکہ خیز مسکراہٹوں سے ان کا استقبال کیا۔

بہاؤالدین نے ان طنزیہ مسکراہٹوں کے تیر اپنے دل میں پیوست ہوتے ہوئے محسوس کیے۔ امیر کلال نے بہاؤالدین کو دیکھے بغیر تند و تیز آواز میں پوچھا، "کون ہے؟"

بہاؤالدین کو یہ توقع نہیں تھی کہ امیر کلال انہیں پہچان بھی نہ سکیں گے، ان کا خیال تھا کہ امیر کلال اور ان کے مُریدان کا پُر تپاک خیر مقدم کریں گے کیونکہ وہ فنائے کامل حاصل کر چکے تھے لیکن یہاں لوگوں کا انداز ہی کچھ اور تھا کسی نے امیر کلال کے سوال کا لاپرواہی سے جواب دیا۔ "بہاؤالدین آیا ہے!"

امیر کلال نے غصہ سے حکم دیا۔ "اسے ہماری محفل سے فوراً نکال دو!"

مریدوں نے انہیں ذلیل کر کے محفل سے نکال دیا، یہ باہر نکل کے ذرا

پریشان ہوئے، باہر برفباری ہو رہی تھی اور سرد ہواؤں کے جھونکے جسم میں سوئیوں کی طرح چبھ رہے تھے۔ ان کے جی میں آئی کہ جس آستانہ تک پہنچنے کے لیے انہوں نے دُور دراز کا سفر اختیار کیا تھا اور جس ذات کے لیے انہوں نے اپنے تلووں میں آبلوں کے تارے سجائے تھے اس نے کسی بات کا لحاظ اور خیال کیے بغیر اپنی محفل سے ذلیل کر کے نکال دیا تھا، انہیں افسوس تھا کہ امیر کلال نے موسم کا بھی خیال نہ کیا تھا، انہوں نے ارادہ کیا کہ اب وہ اس در پر کبھی بھی نہ آئیں گے لیکن اسی وقت کسی نے دل میں کہا، بہاؤالدین! یہ ذلت امیر کلال کی طرف سے نہیں تھی بلکہ یہ خدا کی طرف سے تھی، مشیت ایزدی یہی تھی کہ امیر کلال انہیں ذلیل کریں۔ پھر ایک ایسی بات کے لیے جس کا امیر کلال سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اپنے پیر و مرشد کو مورد الزام ٹھہرانا کہاں کی دانائی اور ہوشمندی ہے اس خیال کے ساتھ ہی انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو انہیں اسی در پر زندگی گزار دینی ہے۔ برفباری انہیں ہمیشہ کے لیے اپنی آغوش میں لے کر عدم کے حوالے تو کر سکتی تھی لیکن انہیں ان کے ارادوں میں متزلزل نہیں کر سکتی تھی، سرد ہواؤں کے جھونکے جسم کے آر پار ہو کے انہیں ٹھٹھر دلا کر رہے تھے لیکن یہ ہمت ہارنے کو تیار نہ تھے۔

بہاؤالدین نے خود کو امیر کلال کے دَر پر ہی پڑا رہنے دیا اور دل میں ٹھان لیا کہ کچھ بھی ہو اس در سے سر نہ اٹھاؤں گا۔ صبح فجر کی اذان کے بعد امیر کلال باہر نکلے اور بہاؤالدین کو اندر لے گئے نہایت محبت سے فرمایا۔

" اے فرزند! سعادت کا لباس تیرے ہی جسم پر سجتا ہے۔"

پھر پیروں کے چھالے دیکھے اور افسوس کرتے ہوئے کہا۔" مجھے دُکھ ہے کہ تو نے یہاں تک آنے میں اتنی مصیبتیں برداشت کیں، اور ہماری محفل

میں داخل ہوا تو ذلیل کر کے نکال دیا گیا۔" پھر آبلوں پہ مرہم رکھا۔

یہ کچھ عرصہ امیر کلال کی خدمت میں رہ کر بخارا چلے گئے، کچھ دنوں بعد امیر کلال کی یاد نے پھر ستایا اور یہ ان کی طرف روانہ ہو گئے، راستے میں ایک نقاب پوش سوار سامنے آ گیا اور اس نے بہاؤالدین سے کہا۔

"بہاؤالدین! ذرا رُکنا، مجھے تم سے چند باتیں کرنی ہیں۔"

بہاؤالدین نے اس پُرکشش سوار کو سرسری نظروں سے دیکھا اور رُکے بغیر چلتے رہے، سوار نے ایک بار پھر ان کا راستہ روک لیا اور اپنی سحرانگیز آنکھیں ان کی آنکھوں میں ڈال کر بولا "میں کہتا ہوں رُک جاؤ۔ میں تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

بہاؤالدین نے منہ پھیر لیا اور اس سے بات کیے بغیر امیر کلال کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اس وقت امیر کلال کا بیٹا برہان ان کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ امیر کلال نے بہاؤالدین کو مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہا "بہاؤالدین! کیا تم اس سوار سے واقف ہو جو ابھی راہ میں ملا تھا؟"

بہاؤالدین نے جواب دیا "ہاں واقف ہوں، وہ خضرؑ تھے!"

امیر کلال نے شفقت سے پوچھا "پھر تم نے ان پر توجہ کیوں نہ دی؟"

بہاؤالدین نے سعادت مندی سے جواب دیا "میں آپ کی خدمت میں آرہا تھا، میری منزلِ مراد آپ تھے اس لیے میں خضرؑ پر کوئی توجہ نہ دے سکا۔"

امیر کلال اس جواب سے بہت خوش ہوئے، اپنے بیٹے برہان الدین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "تم اس سے واقف ہو؟"

"خوب اچھی طرح! یہ مرشد زادے ہیں!"

امیر کلال نے کہا: "یہ ابھی تک تعلیم معنوی سے محروم ہے۔ میں نے تمہیں جو تعلیم دی ہے، اب اس کا امتحان لینا چاہتا ہوں، ہر استاد کی طرح میری بھی یہی خواہش ہے کہ جو کچھ میں نے تمہیں تعلیم دی ہے، اس کا اثر دیکھوں تم میرے سامنے میرے بیٹے برہان الدین کو تعلیم معنوی دو۔"

بہاؤالدین کو اس میں کچھ تامل ہوا، لیکن امیر کلال نے کہا: "تمہیں اس معاملے میں توقف نہیں کرنا چاہیئے!"

بہاؤالدین نے برہان الدین کو گہری نظروں سے دیکھا، برہان الدین کے دل و دماغ میں یہ نظریں نشتے کی طرح اتر گئیں اور وہ سکر و حال میں مبتلا ہو گیا۔

ایک شخص آپ کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہتا۔ لیکن پھر ایسا ہوا کہ وہ کئی دنوں کے لیے غائب ہو گیا، آپ نے مریدوں سے پوچھا: "کیا تم لوگ جانتے ہو کہ میرا مخلص کہاں غائب ہے؟"

کئی مریدوں نے بیک آواز جواب دیا: "حضرت! وہ اپنے گھر کے باہر دیکھا تو گیا ہے۔ لیکن یہ نہیں معلوم کہ وہ یہاں آ کیوں نہیں رہا۔"

آپ نے حکم دیا: "تم میں سے کوئی اس کے پاس جائے اور اسے اپنے ساتھ لے آئے!"

لوگوں نے اپنے ساتھ لانے کا وعدہ تو کر لیا لیکن لا نہیں سکے، پھر ایک دن وہ شخص خود ہی آگیا اور اس نے آتے ہی ایک درہم نذرانے کے طور پر پیش کیا، آپ نے اسے قبول کر لیا اور کہا: "تم اس قدر کیوں پریشان ہو؟ ارے بھائی خالی خولی پریشانی کسی مسئلے کا حل تو نہیں ہے تم کو اپنا مسئلہ لے کر ہمارے پاس تو آنا چاہیئے تھا۔"

مخلص ارادت مند نے عرض کیا: "حضرت! میرے والد تو ہر روز اس

پر مصر تھے کہ میں دشت قبچاق چلا جاؤں۔ اور اپنے گم شدہ بھائی کو تلاش کر لاؤں۔ لیکن میں حضور سے ملے بغیر نہیں جانا چاہتا!"

آپ نے وہ درہم واپس کر دیا۔ بولے "اسے اپنے پاس رکھو، یہ تمہارے بہت کام آئے گا!" پھر پوچھا "کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہارا بھائی ابھی تک زندہ ہے؟"

ارادت مند نے جواب دیا "مجھے یہ سب تو معلوم نہیں لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ میرا بھائی دشتِ قبچاق میں غنیموں سے شکست اٹھا کر کہیں روپوش ہو گیا ہے اور میرے والد بار بار اس بات پر مصر ہیں کہ تم دشت قبچاق چلے جاؤ اور اپنے گم شدہ بھائی کو تلاش کر لاؤ۔ لیکن کیا یہ کام واقعی میرے بس کا ہے؟"

بہاؤالدین نے کہا "اب تم اپنے باپ کے حکم کی تعمیل کرو اور بھائی کی تلاش میں نکل جاؤ۔ یہ درہم اپنے پاس رکھو اور جب کبھی کسی مصیبت میں پھنسو، تو مجھے یاد کر لینا، میں تمہاری مدد کروں گا!"

یہ شخص یہاں سے دشتِ قبچاق کی طرف چلا گیا، یہ ساتھ میں کچھ تجارتی سامان بھی لیتا گیا۔ جس سے اسے نفع پہنچا، یہ شخص تلاش کرتا ہوا خوارزم کی طرف نکل گیا۔ وہاں کسی محنت و مشقت کے بغیر اس کا بھائی مل گیا۔

یہ دونوں ایک کشتی کے ذریعہ واپس ہوئے، اس کشتی میں بہت سے قیدی بھی تھے، ان لوگوں نے ان دونوں کو دیکھا تو ان کی نیت خراب ہونے لگی اور قیدیوں کے مالکان نے ان دونوں کو بھی غلام بنانا چاہا اور انہوں نے دونوں کو دھونس دینا شروع کیا اور دھمکی دی کہ اگر ان دونوں نے اپنی مرضی استعمال کی تو اس کا انجام بہت برا ہو گا۔ دونوں بہت ڈرے کہ یہ اچھی مصیبت پڑی۔

چپٹی ناک اور چھوٹی آنکھ، تنگ پیشانی والا پستہ قامت ان دونوں کے سروں پر ہتھوڑا لے کر کھڑا ہوگیا بولا "اگر تم دونوں نے نکل بھاگنے، یا دریا میں چھلانگ لگانے کی کوشش کی تو اس ہتھوڑے سے تمہارا سر توڑ دیا جائے گا۔"

بہاؤالدین کے ارادتمند کو یاد آیا کہ اسے اس موقع کے لیے ایک خاص ہدایت کی گئی ہے۔ اس نے فوراً بہاؤالدین کو یاد کیا اور دل میں کہا "حضرت! میں موذیوں کے چنگل میں پھنس گیا ہوں، ہمیں ان کے شر سے نجات دلائیے۔"

یکایک تیز و تند ہوائیں چلنا شروع ہوگئیں اور کشتی کا توازن بگڑنے لگا۔ کشتی والے آہ و واویلا کرنے لگے، کشتی اس بری طرح ہچکولے کھا رہی تھی کہ کشتی کے لوگ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے، کسی کا سر دوسرے کے سر سے ٹکرا گیا۔ کسی کی کھوپڑی کسی کے پیٹ میں گھس گئی، کسی کی کہنی کسی دوسرے کی پسلی میں اتر گئی، کوئی منہ کے بل کشتی کے اندر گر گیا، کوئی کسی کی آغوش میں ایسا گرا کہ اپنا سارا بوجھ اس کے حوالے کر کے گویا مطمئن ہوگیا۔ اس عالم میں بہاؤالدین کے ارادتمند نے دیکھا کہ اس کشتی میں بہاؤالدین خود بھی موجود ہیں اور چپٹی ناک والے سے باتیں کر رہے ہیں، یہ شخص بھی ان دونوں کے قریب چلا گیا۔ بہاؤالدین کو اس نے ادب سے سلام کیا۔ انہوں نے لاپرواہی سے سلام کا جواب دیا۔ اس نے سنا بہاؤالدین اس چپٹی ناک والے سے کہہ رہے تھے "کیا تو جانتا ہے کہ تیری کشتی گرداب بلا میں کیوں پھنسی ہے؟"

چپٹی ناک والے نے کپکپاتے ہوئے لہجے میں جواب دیا "نہیں تو۔

لیکن آپ کون ہیں؟"

بہاؤالدین نے جواب دیا "میں ان دونوں کا نجات دہندہ ہوں۔ میں

انہیں لینے آیا ہوں اگر تو نے ان دونوں کے بارے میں اپنے ارادے نہیں بدلے تو یہ کشتی ڈبو دی جائے گی اور دو کے سوا سبھی غرق کر دیے جائیں گے!"

چپٹی ناک والے نے گڑگڑاتے ہوئے کہا، "حضرت! میری توبہ، مجھے معاف دیجئے۔ انہیں جہاں کہئے میں اتارنے کو تیار ہوں۔ لیکن کشتی کو ڈوبنے سے بچا لیجئے۔"

بہاؤالدین نے کہا، "میں اسی شرط پر تیری کشتی کو طوفان سے نکالنے کو آمادہ ہوں لیکن خبردار جو تو نے وعدہ شکنی کی، یاد رکھ اگر تو نے وعدہ شکنی کا ذرا سا خیال بھی کیا تو اس کی تجھے عبرتناک سزا ملے گی۔"

چپٹی ناک والا گڑگڑاتا ہوا بہاؤالدین کے قدموں میں گر گیا اور ان کے پیر پکڑ لیے۔ اسی وقت ایک سخت جھونکے نے ان کی آنکھیں بند کر دیں اور جب دوبارہ آنکھ کھلی تو لوگوں نے دیکھا کہ چپٹی ناک والا کشتی کے مستول کو پکڑے بیٹھا ہوا ہے اور بہاؤالدین کا کہیں پتہ نہیں۔

ہوا آہستہ آہستہ کم ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ معمول پر آ گئی، ان دونوں کو چپٹی ناک والے نے بخارا کے قریب اتار دیا۔ یہ دونوں گھر جانے کے بجائے قصرِ عارفاں پہنچے اور بہاؤالدین کی خدمت میں حاضری دی۔ "حضرت! آپ کی مہربانی اور نوازشات کام آئیں کہ ہم دونوں اس وقت آپ کے سامنے کھڑے ہیں!"

آپ نے نظریں نیچے کیے ہوئے جواب دیا، "ہاں ہم نے تمہارے سلام کا جواب تو دے دیا تھا لیکن ذرا لاپرواہی سے۔ تمہیں ہماری روش ناگوار تو نہیں گزری!"

ارادت مند نے جواب دیا، "نہیں حضرت! ہم دونوں اور ہمارا خاندان بال

بال آپ کا احسان مند ہے، ہم کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کریں۔"

آپ نے کہا۔"شکریہ ہمارا نہیں، خدا کا ادا کرو، ہم تو جو کچھ کرتے ہیں اس کی ایما اور منشا پہ کرتے ہیں۔"

آپ کا ایک مرید، ایک دن حسب معمول آپ کی خدمت میں نہیں پہنچا، آپ نے دوسرے مریدوں سے پوچھا۔"آج یہ شیخ کہاں رہ گیا، ابھی تک آیا کیوں نہیں ہے؟"

شیخ حسن کے ایک پڑوسی نے عرض کیا۔"حضرت! شیخ حسن بہت پریشان ہیں انہوں نے پچیس دینار رکھے تھے، جو اب نہیں مل رہے ہیں، انہوں نے گھر کا کونہ کونہ چھان مارا، لیکن دیناروں کا کہیں پتہ نہ چلا۔"

بہاؤالدین نے مسکرا کے فرمایا۔"شیخ حسن ان دیناروں کو خواہ مخواہ تلاش کر رہا ہے، اس سے کہہ دو، ان دیناروں کو اپنی لونڈی سے طلب کرے۔"

جب مرید شیخ حسن کے گھر جانے لگا تو آپ بھی اس کے ساتھ ہو لیے شیخ حسن نے آپ کو اپنے در پر دیکھ کر ننگے پاؤں، ننگے سر باہر نکل کر استقبال کیا۔ آپ ان کے ساتھ گھر کے اندر تشریف لے گئے اور لونڈی کو حکم دیا۔"وہ پچیس دینار جو تو لے گئی ہے شیخ حسن کو واپس کر دے۔"

لونڈی تھر تھر کانپنے لگی۔ آپ نے شیخ حسن سے کہا۔"اگر لونڈی نہیں دینار واپس کر دے تو تم بھی اسے معاف کر دینا اور اس کا چرچا نہ کرنا۔" پھر لونڈی سے کہا۔"اب تو بھی وہ دینار شیخ حسن کو واپس لا دے۔"

لونڈی نے مرتعش آواز میں جواب دیا۔"انہیں میں نے اپنے صحن میں گاڑ دیا ہے، آپ انہیں نکلوا لیجئے۔"

آپ نے تلخی سے کہا۔"تو خواہ مخواہ کیوں جھوٹ بول رہی ہے۔ صحن میں

تو نے محض تین دینار گاڑ رکھے ہیں، وہ تو کھود کر نکال لیے جائیں گے۔ لیکن بقیہ بائیس بھی لے آئے۔"

لونڈی کا ڈر کے مارے بہت بُرا حال ہو گیا۔ شیخ حسن نے لونڈی کے گھر پہنچ کر جب صحن کو کھودا تو وہاں سے واقعی تین ہی دینار نکلے اور بقیہ بائیس دینار اس نے ایک دوسری جگہ سے لا کر دیے۔ شیخ حسن نے بھی اپنے مرشد کی ہدایت کے بموجب لونڈی کو معاف کر دیا اور اس کی اس حرکت کا چرچا نہیں کیا۔

آپ کا شہرہ دور دور تک پہنچ چکا تھا ان دنوں آپ کا سرخس میں قیام تھا، ہرات کے حکمراں شاہ معزالدین حسینی نے آپ کی خدمت میں اپنا قاصد روانہ کیا۔ ہرات کے حکمراں نے آپ کو ایک خط لکھا تھا جس کا مختصراً مفہوم یہ تھا کہ "ہمیں درویشوں کی صحبت کا اشتیاق ہے۔"

آپ حکمرانوں سے ملاقات کے عادی نہیں تھے لیکن پھر بھی شاہ ہرات سے ملاقات کرنے چلے گئے۔ شاہ ہرات کے آس پاس بڑا ہجوم تھا، مملکت ہرات کے اعیان وارکان اور نوکروں چاکروں کی ایک بڑی جماعت وہاں موجود تھی، شاہ ہرات نے سب کے سامنے سوالات کرنے شروع کر دیے پوچھا "حضرت آپ کی درویشی موروثی ہے؟"

آپ نے جواب دیا "نہیں، .... (ایک جذبہ پہنچا اور میں اس سعادت سے مشرف ہو گیا)"

شاہ نے ایک اور سوال کیا "کیا آپ کے طریقے میں ذکر جہر اور سماع (خلوت ہے؟"

آپ نے جواب دیا "نہیں!"

پھر شاہ نے پوچھا "پھر آپ کا کیا طریقہ ہے؟"

آپ نے کہا "ظاہر با خلق، باطن با حق، خلوت میں شہرت ہے اور شہرت میں آفت۔ ہمارے خواجگان کا اصول ہے، خلوت در انجمن، سفر در وطن، ہوش در دم، نظر در قدم!"

شاہ نے کہا "میں ظاہر با خلق اور باطن با حق کا مطلب نہیں سمجھا۔"

آپ نے جواب دیا "ظاہر میں خلق کے ساتھ اور باطن میں حق کے ساتھ۔"

شاہ نے ذرا سا تامل اختیار کیا، پھر پوچھا "بعض مشائخ نے کہا ہے کہ ولایت نبوت سے افضل ہے، آخر وہ کون سی ولایت ہے جو نبوت سے افضل ہے؟"

آپ نے جواب دیا "اسی نبیؐ کی ولایت اس کی نبوّت سے افضل ہے۔"

ان سوال و جواب کے بعد شاہ ہرات نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

آپ قصر عارفاں میں قیام فرما تھے کہ ایک نامی گرامی درویش آپ سے ملنے آیا۔ اس وقت آپ ایک حوض کے کنارے کھڑے ہوئے تھے، یہ درویش اسی حوض کے پاس پہنچ گیا۔ آپ نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا "کیا تم خوارزم جانا چاہتے ہو؟"

درویش نے جواب دیا "ہاں جناب میں خوارزم جانے کا ارادہ کر تو رہا ہوں۔"

آپ نے فیصلہ کن انداز میں کہا "لیکن ہم تمہیں خوارزم نہیں جانے دیں گے۔"

درویش نے پلکیں جھپکائے بغیر کہا "جناب ایسا تو نہ ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ میں خوارزم جا کے رہوں گا۔ اور اگر تم ہمیں روک سکتے ہو تو ضرور روکو!"

اس وقت مولانا حمید الدین شاشی بھی آ گئے، آپ نے مولانا شاشی کو پورا قصّہ سنا کر کہا "مولانا! آپ اس بات کے گواہ رہیئے کہ میں نے یہ شرط لگائی ہے، اگر میں شرط ہار جاؤں گا تو......"

درویش نے بات کاٹ دی، بولا "میں خوارزم پہنچ کے رہوں گا۔ تم اگر روک سکو تو روکو۔"

بہاؤالدین نے کہا "ہم بار بار یہی کہیں گے کہ ہم تمہیں خوارزم نہیں جانے دیں گے۔"

درویش کچھ دیر وہاں اور ٹھہرا اور اس کے بعد ناراض اور سینے میں کینہ لیے واپس چلا گیا۔ کچھ دنوں بعد وہ واقعی خوارزم جانے والے راستے پر ہو لیا۔ کچھ دنوں بعد یہ درویش اقشتیہ نامی پڑاؤ پر اترا۔ وہیں بادشاہ کے ہرکارے بھی پہنچ گئے اور انہوں نے درویش کو بادشاہ کا یہ حکم پہنچا دیا کہ سردست خوارزم کا راستہ بند کر دیا گیا ہے اس لیے خوارزم کا ارادہ ترک کر دیں۔

درویش کے ہوش اڑ گئے اور اس نے قافلے والوں سے مل ملا کے ایک دوسری راہ اختیار کی اور ان میں طے یہ پایا تھا کہ ایک دوسری راہ اختیار کریں گے اور پھر لوگوں کی نظروں سے بچ کے خوارزم میں داخل ہو جائیں گے۔ درویش حسب منصوبہ قافلے والوں کے ساتھ تھا، یہ لوگ لمبا چکر کاٹ کے ایک دم خوارزم کی طرف مڑے، ابھی یہ لوگ خوارزم میں داخل بھی نہ ہوئے تھے کہ پیچھے سے شاہی ہرکارہ سپاہیوں کے ساتھ پہنچ گیا اور اس نے حکم دیا "سپاہیو! آگے بڑھو۔ اور ان لوگوں کو گرفتار کر لو۔"

سپاہی آگے بڑھے اور ان کو گرفتار کرنے لگے، انہوں نے کسی قسم

کی بھی خوشامد نہیں کی۔ شاہی سپاہی انہیں گرفتار کر کے بخارا کی طرف لے گئے۔ درویش نے ان کی خوشامد کی کہ کچھ مال لے کر اسے چھوڑ دیں لیکن وہ کسی طرح بھی اس پر نہیں تیار ہوئے، آپ اسی پریشانی کے عالم میں درویش سے ملنے پہنچ گئے اور اس سے دریافت کیا "کہو بھائی! کیا تم خوارزم ہو آئے؟"

اس درویش نے جل کر کہا "خوارزم کیا خاک جاؤں، اب اگر ان کی قید سے رہائی پاؤں تو سمجھوں گا خوارزم ہو آیا"

آپ نے کہا "کیا ہم نے تمہیں پہلے ہی یہ نہیں بتا دیا تھا کہ تم خوارزم نہیں جا سکتے"

درویش نے رحم طلب نظروں سے بہاؤالدین کی طرف دیکھا اور بولا۔ " ہاں آپ نے منع تو کیا تھا لیکن میں نے غلط زعم میں آپ کا کہنا نہیں مانا تھا میرا خیال ہے کہ اس پورے معاملے میں آپ کی مرضی اور ایما کار فرما رہی ہے"

آپ نے کہا "توبہ کرو توبہ، تم درویش ہو کے ایسی بات کہہ رہے ہو خدا کی مرضی اور مشیت کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں، ہاں یہ الگ بات ہے کہ خدا اپنے کسی بندے کی دلجوئی پر آمادہ ہو جائے"

درویش نے آپ کے جانے کے بعد شاہی ہرکاروں کو اور سپاہیوں کو رشوت دے کر رہائی حاصل کی۔

آپ کے سامنے مریدوں اور ارادت مندوں کا ایک مجمع لگا ہوا تھا آپ ان کے سامنے معرفت کے رموز و اسرار بیان فرما رہے تھے کسی نے سوال کیا "حضرت وہ کون سے اسباب ہیں جن سے ایک عارف خدا کی راہ حاصل کر لیتا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "تین!"

سائل نے پوچھا "تین کون کون ہے"

آپ نے جواب دیا "مراقبہ، مشاہدہ اور محاسبہ!"

سائل سوالیہ نظروں سے آپ کو دیکھنے لگا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ ان تین لفظوں کی شرح کس طرح کرے۔ آپ نے اس کی الجھن کو محسوس فرمالیا، بولے "تم کیا سوچ رہے ہو؟"

سائل نے کہا "میں مراقبے، مشاہدے اور محاسبے کی تشریح سننا چاہتا ہوں۔"

آپ نے حاضرین مجلس کو سرسری نظر سے دیکھا اور بولنا شروع کر دیا۔ "مراقبے کی تعریف ہے .... یعنی خالق پر ہمیشہ اس طرح نظر جمی رہے کہ مخلوق پر نظر پڑے ہی نہیں، مشاہدے سے مراد ہے، واردات غیبیہ کا دل پر نازل ہونا، چونکہ گزرنے والے لمحات کی طرح اسے بھی قیام نہیں اس لیے کوئی ان کا ادراک نہیں کر سکتا لیکن اگر یہ قبض و بسط کی صورت میں ہو تو ان کا ادراک ممکن ہے۔ قبض کیا ہے؟ واردات غیبی کے ورود کا بند ہو جانا، چنانچہ حالتِ قبض میں ہم جلالی صفت کا مشاہدہ کرتے ہیں، اسی طرح بسط کیا ہے؟ واردات غیبی کا قلب پر وارد ہونا، اس حالت میں ہم صفت جمال کا مشاہدہ کرتے ہیں، یاد رکھو قبض و بسط کا تعلق امور حاضرہ سے ہے، اب رہا محاسبہ، تو محاسبہ یہ ہے کہ ہم ہر پل کا محاسبہ کرتے ہیں۔ یعنی یہ معلوم کرتے رہیں کہ گذرا ہوا لمحہ حضوری میں گزرا، یا غیر حضوری میں۔ اگر غیر حضوری میں گزرا تو گویا نقصان ہی نقصان رہا۔ ہمیں بازگشت کرنا چاہیئے اور از سر نو عمل شروع کر دینا چاہیئے، عمل کرنے میں اپنے دل میں یہ خیال نہیں پیدا ہونا

چاہیئے کہ ہم نے کوئی عمل کیا ہے، بلکہ اپنے آپ کو ہمیشہ حقیر اور پر از تقصیر سمجھنا چاہیئے۔"

کسی نے سوال کیا کہ "جس شخص نے خود کو اللہ کے سپرد کر دیا ہو، برا وقت پڑنے پر کیا وہ کسی انسان سے مدد کا طالب ہو سکتا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "ہرگز نہیں۔ کیونکہ اس کا غیر سے التجا کرنا شرک میں داخل ہے، یہ شرک عام لوگوں کے لیے قابل مواخذہ نہیں لیکن خاص لوگوں کے لیے قابلِ مواخذہ ہے۔"

کسی اور نے سوال کیا "نفلوں کا ترک کن حالات اور کن لوگوں کے لیے جائز ہو سکتا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "دل میں اللہ کے سوا کسی اور شئے یا خواہش کو جگہ دینا سالک کے لیے جائز نہیں ہے، عادت سے لگاؤ رکھنے کا یہ مطلب ہے کہ دل میں اللہ کے سوا ایک شئے کو دل میں بسا لینا۔ نفلوں کی عادت کا بھی یہی حال ہے۔ اس لیے ایک سالک کے لیے کبھی کبھی نفلوں کا ترک کرنا جائز ہے تاکہ اسے عادت سے اُنس نہ ہو جائے۔"

کسی نے ایک اور سوال کیا "درویش کی خاص علامات ارشاد ہوں؟"

آپ نے جواب دیا "باہر سے بے رنگی اور اندر سے بے جنگی!"

ایک اور سوال کیا گیا "مجاز اور حقیقت میں سے کون سی چیز عوام اور کونسی خواص کے لیے کتنی ضروری ہے؟"

آپ نے فرمایا "......... (مجاز حقیقت کا پل ہے) تمام عبادتیں وہ ظاہری ہوں یا باطنی، قولی ہوں یا فعلی سب مجاز ہے، جب تک سالک ان سے نہ گزر جائے حقیقت کو نہیں پہنچ سکتا۔"

پوچھا گیا" اگر اللہ تعالیٰ کسی فقیر سے حال چھین لے تو اسے کیا کرنا چاہیئے ؟"

جواب دیا" اگر فقیر میں ذرہ بھر بھی حال باقی ہے تو اسے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ فقیر سے تضرع اور نیاز مطلوب ہے اور اگر اس میں کچھ بھی باقی نہیں رہا ہے تو اس سے صبر و رضا مطلوب ہے ۔ وظیفۂ محبت میں یہ لازم ہے کہ محب محبوب کو تلاش کرتا رہے اور یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیئے کہ محبوب جتنا عزیز ہوگا اتنی ہی اس کی طلب کی راہ میں مصائب بھی زیادہ ہوں گے اور طلب کا کمال یہ ہے کہ طالب بے قرار و بے آرام رہے ۔"

کسی نے پوچھا" شریعت اور طریقت میں کیا تعلق ہے ؟"

آپ نے جواب دیا" شریعت چھلکا ہے اور طریقت اس کا مغز ۔ مغز کی حفاظت چھلکے سے ہوتی ہے ، اگر چھلکے پر کوئی خلل آجائے تو اس کا اثر مغز پر بھی پڑتا ہے ، گویا اگر شریعت میں خلل ہوگا تو اس کا اثر طریقت پر ضرور پڑے گا ۔"

آپ کی عمر تہتر سال کی ہو چکی تھی ، جب وصال کا وقت قریب آیا تو آپ کے ایک خاص مرید نے سورہ یٰسین پڑھنی شروع کر دی ، ابھی نصف سورۃ پڑھی گئی تھی کہ ایسا محسوس ہوا جیسے آسمان سے انوار کی بارش ہو رہی ہو ۔ لوگوں نے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا ۔ اس دوران آپ کے سانس کا سلسلہ منقطع ہو گیا اس دن آپ تہتر سال سے گزر کر چوہترویں سال میں داخل ہو چکے تھے ۔ دوشنبہ کا دن تھا اور ربیع الاوّل کی تین اور سن ۷۹۱ ہجری تھا ۔ آپ کی ولادت بھی قصر عارفاں میں ہوئی تھی ۔ اور وصال

بھی وہیں فرمایا اور آپ یہیں ابدی نیند سو گئے۔ آپ کے فیوض و برکات آج بھی جاری و ساری ہیں اور سلسلہ نقشبندیہ نے آپ کے چرچے۔ شہرت اور فیوض و برکات کو قیامت تک کے لیے عام کر دیا ہے۔

جو خود کو اللہ کے لیے فنا کر دیتے ہیں وہ کبھی نہیں مرتے اور جو ان سے وابستہ ہو جاتا ہے ان کی طرح وہ بھی حیات ابدی پا جاتا ہے۔

ابوالحسن نوری

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب بغداد میں ہر قسم کے صاحب کمال جمع تھے۔ جنید بغدادی، سری سقطی، ابوبکر شبلی، حسین بن منصور حلاج ان سب کے نام اور کارنامے بغداد کی حدود سے نکل کر ایران اور ماوراالنہر سے بھی آگے پہنچ چکے تھے۔ ان حضرات کی دنیا ہی الگ تھی، ان کے نظریات، عقائد اور علوم ظاہری اور باطنی ایسے نہیں تھے کہ انہیں عوام الناس سمجھ سکتے۔ عوام تو عوام، علماء تک ان کی اسرار و رموز سے پُر باتیں سمجھنے سے قاصر رہتے اور یہ وہ لوگ تھے جن کی عزیمت و استقامت کا پھر کوئی جواب ہی نہ پیدا ہو سکا۔ انہیں بزرگوں میں ایک صاحب احمد بن محمد بھی تھے۔ ان کی کنیت ابوالحسن تھی۔ یہ نہایت خاموشی سے، لوگوں سے الگ تھلگ اللہ سے لو لگائے رہتے تھے۔ ویرانے میں ایک جھونپڑی ڈال رکھی تھی۔ اسی میں عبادت وریاضت فرماتے رہتے تھے۔

شام گزر چکی تھی اور رات نے غلبہ جما رکھا تھا۔ آپ عشاء کی نماز سے فارغ ہوئے تھے کہ جھونپڑی کے باہر لوگوں کی موجودگی محسوس ہوئی، اُسی وقت کسی نے جھونپڑی پہ دستک دی، آپ نے پوچھا "کون ہے؟"

باہر سے جواب ملا "چند مسافر، رات ہو چکی ہے اور ہم رات کے اندھیرے اور اس ویرانے میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ کیا آپ خدا کے لیے ایک رات اپنی اس جھونپڑی میں بسر کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں گے؟"

آپ اٹھے اور جھونپڑی کا دروازہ کھول دیا۔ یہ تین مسافر تھے انہوں نے اپنے گھوڑے جھونپڑی کے باہر درختوں سے باندھ دیے تھے۔ آپ نے ان تینوں سے دریافت کیا "کچھ کھاؤ گے؟"

مسافروں نے جواب دیا "ہمارا کھانا ہمارے ساتھ ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔"

ایک مسافر آپ کے منہ اور چہرے کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ آپ نے ان سے دریافت کیا "کوئی اور ضرورت؟"

تینوں نے بیک آواز کہا "شکریہ جناب، آپ کی یہی مہربانی کیا کم ہے کہ آپ نے شب بسری کے لیے ہم اجنبیوں کو اپنی جھونپڑی میں ٹھہرا لیا۔"

آپ نے ان تینوں کے لیے بستر بچھا دیا اور خود ایک گوشے میں چلے گئے، جاتے جاتے فرمایا "میں یہاں اس کونے میں بیٹھا ہوں، کوئی ضرورت ہو تو ابوالحسن کہہ کر بلا لینا۔"

جو شخص آپ کے منہ اور چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا اس نے اپنے ساتھیوں سے سرگوشی میں کہا "بھائیو! تم دونوں نے اس شخص میں کوئی غیر معمولی بات محسوس کی ہے؟"

ایک نے جواب دیا "میں وہ غیر معمولی بات اس شخص میں نہیں اس جھونپڑی میں محسوس کر رہا ہوں۔"

تیسرے نے پوچھا "وہ کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا: "وہ یہ کہ اس جھونپڑی میں چراغ یا شمع تو کہیں نظر نہیں آتی، پھر یہ روشنی کہاں سے آرہی ہے؟"

دوسرے نے کہا: "بھائی! یہی بات تو میں بتانے جا رہا تھا کہ تم درمیان میں بول دیے۔"

تیسرے نے کہا: "ہاں تم کیا بتا رہے تھے، ذرا وہ بھی بتانا۔"

دوسرا بولا: "میں یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ جھونپڑی کا مالک کہیں جن وِن تو نہیں کیونکہ جب یہ بات کرتا ہے تو اس کے منہ سے ایک روشنی سی خارج ہوتی ہے۔"

پہلے نے کہا: "تم منہ کی بات کرتے ہو، میں کہتا ہوں کہ اس کے سارے وجود سے روشنی پھوٹ رہی ہے اور اسی روشنی نے اس جھونپڑی کو منور کر رکھا ہے۔"

اب جو دونوں نے ان بزرگ کی طرف دیکھا تو بات صحیح نکلی۔ روشنی کی ہلکی ہلکی شعاعیں سی جسم سے خارج ہو رہی تھیں جن سے اس جھونپڑی میں چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ مسافروں کے ہوش و حواس اڑ گئے۔ ڈرتے ڈرتے آپ کے قریب پہنچے اور عرض کیا: "حضور والا! کیا ہم آپ کا تعارف حاصل کر سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں، بالکل حاصل کر سکتے ہو، میرا تعارف یہ ہے۔ نام احمد بن محمد اور کنیت ابوالحسن ہے، بغداد میں پیدا ہوا اور شاید اسی بغداد میں پیوند خاک ہو جاؤں گا۔"

"خوب!" ایک نے ذرا سہمے سہمے لہجے میں کہا: "خدا کرے جو آپ فرما رہے ہوں، وہ درست ہو۔"

آپ نے جواب دیا: "میں جھوٹ نہیں بولتا، جھوٹ سے میں نفرت

کرتا ہوں۔"

ایک نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "حضرت یہ جھونپڑی میں روشنی کہاں سے آرہی ہے؟"

آپ نے متبسم ہو کر فرمایا "تمہیں کہاں سے آتی محسوس ہو رہی ہے؟"

ایک نے کہا "اگر میں اس کا اظہار کردوں گا تو کیا آپ اس کی وضاحت فرمادیں گے کہ ایسا کیوں ہے؟"

آپ نے جواب دیا "ہاں شاید میں اس کی وضاحت کردوں۔"

ایک نے کہا "حضرت جب آپ گفتگو فرماتے ہیں تو آپ کے منہ سے ایک نور سا خارج ہوتا ہے اس کے علاوہ اس جھونپڑی میں نہ تو کوئی چراغ ہے نہ دیا، پھر یہ منور کیوں ہے۔ یہ روشنی کہاں سے آرہی ہے؟"

دوسرے نے دبے لفظوں میں کہا "کہیں آپ جن تو نہیں؟"

آپ نے زیرِ لب تبسم فرمایا "بولے۔ میں جن نہیں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں لیکن ہو سکتا ہے میرے خدا نے مجھ میں اپنے نور کا کچھ حصہ منتقل فرمادیا ہو۔ میری زبان ہر وقت وردِ الٰہی میں لگی رہتی ہے، یہ اسی کا اثر ہو سکتا ہے۔"

مسافروں کو آپ کی باتوں پر کچھ یقین آیا اور کچھ نہ آیا۔ وہ رات بھر سو نہیں سکے۔ صبح ہوتے ہی انہوں نے اپنی راہ لی اور بغداد میں خوب اچھی طرح گھوم پھر کر اور لوگوں سے ان کٹیا نشین بزرگ کے بارے میں معلومات کرکے جب یہ یقین کرلیا کہ وہ جن وغیرہ نہیں ہیں، ایک انسان ہیں اور ہر وقت یادِ الٰہی میں مشغول رہتے ہیں تو انہیں ابوالحسن نوری کہنا شروع کردیا۔ اور یہ تاریخ تصوف میں بھی ابوالحسن نوری ہی کہلائے جانے لگے۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

آپ دن کو محنت مشقت اور رات کو عبادت کرتے تھے آپ جس دکان پہ کام کرتے تھے وہاں کے آدمیوں کا یہ کہنا تھا کہ کام میں جس مشغولیت اور محویت کا آپ اظہار کرتے تھے، وہ اپنی جگہ بے مثال تھی۔ صبح جو کھانا ساتھ لے کر جاتے، وہ دکان تک نہیں پہنچتا تھا بلکہ راستے میں مستحقین کو کھلا دیتے تھے۔

ایک دن آپ کی نظر سے انبیاء کرام کا یہ قول گزرا کہ اگر عبادت میں ریا شامل ہو جائے تو اس عبادت کا خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلے گا۔ آپ نے آنکھیں بند کر لیں اور دیر تک اپنا محاسبہ فرماتے رہے کہ ان کی عبادت میں ریا شامل ہے یا نہیں؟ آخر میں پتہ چلا، ریا شامل ہے۔ اس دن سے آپ نے ہر کام نفس کے خلاف کرنا شروع کر دیا۔

ایک عرصہ بعد آپ نے آہستہ سے اپنے نفس سے سوال کیا "اب تو کیا کہتا ہے؟ میں نے تیرا کتنا کہنا مانا ہے؟"

نفس نے جواب دیا "بالکل نہیں، ایک عرصے سے میں اپنی کوئی مراد بھی حاصل نہ کر سکا۔"

اس جواب آپ بہت خوش ہوئے اور یہ احساس پیدا ہوا کہ اب وہ کوئی بلند مرتبہ حاصل کر چکے ہیں۔ اپنے اس خیال کا انہوں نے اس طرح امتحان لیا کہ مچھلی پکڑنے کی چھڑ لے کر دجلہ کے کنارے پہنچ گئے اور پانی میں چھڑ ڈال کر دعا کی "اے اللہ! جب تک اس میں مچھلی نہ پھنسے گی۔ میں یہیں اسی حال میں کھڑا رہوں گا۔"

اسی وقت ایک مچھلی پھنس گئی۔ آپ کو یقین ہو گیا کہ خدا نے آپ کا مرتبہ بلند کر دیا ہے۔ آپ خوش خوش حضرت جنید بغدادی کے پاس پہنچے اور

پورا واقعہ بیان کر کے عرض کیا۔ "کیا خدا نے میرے مرتبے میں کوئی بلندی نہیں فرما دی ہے"

حضرت جنید نے جواب دیا۔ "تمہارے نفس نے مچھلی کی خواہش کی تم نے نفس کی خواہش میں خدا سے مچھلی کا مطالبہ کر دیا۔ میں تو جانتا ہوں کہ اگر نفس مچھلی کی خواہش کر رہا تھا تو خدا اسے سانپ طلب کرتے۔ مچھلی تو ایک غذا ہے جس سے نفس کو لذت حاصل ہوگی لیکن سانپ تو زہریلا ہوتا ہے، بالکل انسانی نفس کی طرح، اسے پاکر ہلاک کر دیتے تو میں اسے تمہاری کرامت سمجھتا، یہ کرامت نہیں ایک فریب تھا۔ تم ابھی درمیانی منزل میں ہو، اور محنت کرو اور ریاضت کرو۔"

جنید کے جواب نے ابوالحسن کو مضطرب اور بے چین کر دیا۔ بولے "جنید تم درست کہتے ہو، شیطان نے کس خوبصورتی سے میرے نفس کو شکار کر لیا۔ میں حیران اور پشیمان ہوں۔"

کچھ دنوں بعد لوگوں نے حضرت جنید سے کہا۔ "حضرت! ابوالحسن کا عجیب حال ہے، ان کی کچھ مدد فرمائیے۔"

جنید نے پوچھا۔ "کیا حال ہے؟ ذرا صاف صاف بتاؤ۔"

لوگوں نے کہا۔ "آج تین دن اور تین راتیں گزر چکی ہیں، ابوالحسن ایک پتھر پر بیٹھے باآواز بلند اللہ اللہ کہہ رہے ہیں۔ وہ نہ تو کچھ کھاتے ہیں اور نہ کچھ پیتے ہیں۔ سب کچھ بند کر رکھا ہے!"

جنید نے دریافت کیا۔ "اور نماز پڑھنے کا کیا طریقہ اختیار کر رکھا ہے یعنی نمازیں پڑھتے ہیں یا نہیں؟"

لوگوں نے جواب دیا۔ "ہاں نمازیں نہایت پابندی سے پڑھتے ہیں۔"

لوگوں کے اس جواب پر جنید کے کسی ارادت مند نے کہا۔ "اگر یہ

بات ہے تو اس میں فنائیت کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ اس میں تو ہوشیاری پائی جاتی ہے۔ فانی کو تو زمانہ تک کا ہوش نہیں رہتا۔"

جنید نے کہا: "ایسا مت کہو، ابوالحسن پر عالم وجد طاری ہے اور صاحبِ وجد کی خدا حفاظت کرتا ہے۔"

اس کے بعد آپ اٹھے اور اسی وقت ابوالحسن کے پاس پہنچ گئے دیکھا ابوالحسن، اللہ اللہ کی آوازیں بلند کر رہے ہیں۔

جنید نے پوچھا: "یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

ابوالحسن نے جواب دیا: "مجھے اللہ کی رضا پسند ہے، شاید اسے یہی پسند ہو!"

جنید نے کہا: "اگر تمہیں اللہ کی رضا پسند ہے تو اس کے لیے شور غوغا مت کرو۔ دل کی تہہ سے اللہ اللہ، کی آواز ابھرے اور وہیں کہیں گم ہو جائے۔ اللہ تک یہ آواز بھی پہنچ جاتی ہے۔ پھر سامع حقیقی کے سامنے شور وغل کرنا یہ کہاں کی دانائی ہے۔"

ابوالحسن اسی وقت ہوش میں آ گئے۔ احسان مندی سے جنید کی طرف دیکھا اور کہا: "بخدا جنید! تم میرے بہترین استاد ہو۔"

ایک عجیب وضع قطع کا انسان آپ کے پاس آکر بیٹھ گیا اس کے چہرے اور جسم پر زخموں کے نشان تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے کہیں سے بڑی مار کھا کر آیا ہے۔ یہ ابوالحسن کے روبرو بیٹھ گیا۔ لوگ اس شخص کو حیرت سے دیکھنے لگے۔

اس شخص نے ابوالحسن کے کان میں کچھ کہنا شروع کر دیا اور کافی دیر بعد جب ابوالحسن کے کان کے پاس سے اپنا منہ ہٹایا تو بے اختیار رونا

شروع کر دیا۔ پہلے تو ابوالحسن خاموش رہے اس کے بعد یہ خود بھی رونے لگے اور اتنا روئے کہ ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ لوگ ان دونوں کی اس عجیب وغریب روش پہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

روتے روتے وہ شخص اٹھا اور اچانک نظروں سے غائب ہوگیا۔

کسی ارادت مند نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا "حضرت! یہ شخص کون تھا اور آپ سے کیا کہہ رہا تھا، پھر یہ رونے کیوں لگا اور اس کے ساتھ ہی آپ بھی تو رو رہے تھے۔ یہ کیوں ہے؟"

آپ نے کہا "تم لوگوں نے اسے نہیں پہچانا؟"

لوگوں نے جواب دیا "نہیں"

آپ نے جواب دیا "یہ ابلیس تھا۔ اس کے چہرے اور جسم پر زخموں کے نشان لاحول کی ضرب سے لگے تھے۔ وہ اپنی حالت سے عاجز و نالاں میرے پاس آیا اور اپنی سابقہ عبادت اور مقام کا ذکر کر کے رونے لگا۔ اسے روتے دیکھ کر میں بھی رونے لگا۔ اور خدا اس دن سے محفوظ رکھے جس میں یہ ابلیس لعین مبتلا اور گرفتار ہوا۔

آپ وفورِ شوق میں مکہ معظمہ روانہ ہوگئے۔ وہاں طوافِ کعبہ کے دوران گریہ طاری ہوگیا۔ اس گریہ میں جو لذت تھی اور اس رونے میں جو مزہ تھا اس نے ابوالحسن کی زبان سے بے اختیار یہ دُعا نکالی "اے اللہ! مجھے وہ مقام و وصف عطا فرمادے جس میں کبھی تغیّر ہی نہ آئے۔"

اس وقت بیت اللہ سے آواز آئی "ابوالحسن! تو کیسی دعا مانگ رہا ہے؟ کیا تو ہمارے مساوی آنا چاہتا ہے کیونکہ جس وصف اور مقام کا تو ذکر کر رہا ہے صرف ہمارا ہے کیونکہ ہماری صفات میں کبھی بھی تغیّر و تبدل

رونما نہیں ہوتا۔"
ابوالحسن نے پوچھا "پھر ہم بندوں میں یہ تغیّر و تبدل کیوں رکھا ہے؟"
جواب ملا "اس لیے کہ عبودیت و ربوبیت میں فرق ظاہر ہو، اور اس کا برملا اظہار ہوتا رہے۔"
ابوالحسن کا روتے روتے بُرا حال ہو گیا۔ بولے "اے خدا! پھر تُو نے یہ جہنم کیوں بنا دیا؟ جب انسان میں تغیّر و تبدل لازمی شے ہے تو اس میں عاجز انسان کا کیا قصور؟ اور تو اپنے ہی تخلیق کردہ بندوں کو جہنم کے عذاب میں دھکیل دے گا؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔"
آواز آئی "گستاخ ابوالحسن! تو کیا چاہتا ہے؟"
ابوالحسن نے جواب دیا "اے اللہ! تو قادر مطلق ہے اگر تو چاہے تو صرف میرے وجود سے جہنم کو لبریز کر دے اور اہلِ جہنم کو بہشت میں داخل فرما دے۔"
جواب ملا "ابوالحسن! ہم نے مخلوق کی محبت کے صلے میں تمہاری مغفرت فرما دی۔"
ابوالحسن پر ایسی گریہ طاری ہوئی کہ گھنٹوں ہوش ہی نہ آیا۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

آپ مراقبے میں بیٹھے تھے، اسی عالم میں ابوبکر شبلی داخل ہوئے انہوں نے دیکھا۔ ابوالحسن اس طرح دم بخود بیٹھے ہیں کہ انہیں کسی بات کا ہوش ہی نہیں۔ یہاں تک کہ شبلی کی آمد تک کا انہیں احساس نہ تھا۔ ابوالحسن کے بال تک ساکن تھے۔ رُواں رُواں غیر متحرک تھا۔ شبلی کچھ دیر

کھڑے انہیں دیکھتے رہے پھر پوچھا "ابوالحسن! میں تمہارا مہمان ہوں۔ اپنے مہمان سے ایسی بے اعتنائی ہے!"

آپ نے جواب دیا "میں اپنے مہمان کی خاطر مراقبہ ختم کرتا ہوں، اور مہمان کی اس سے بڑی عزت افزائی اور کیا ہو سکتی ہے؟"

شبلی نے پوچھا "ابوالحسن! ہمیں ایک بات تو بتاؤ۔"

"پوچھو"

"میں نے ابھی ابھی یہ خاص بات محسوس کی کہ جب تم مراقبے میں تھے تو تمہارا رواں رواں ساکت تھا، تمہارے بال تک غیر متحرک تھے تم نے یہ محویت کس سے حاصل کی؟ کس سے سیکھی؟"

ابوالحسن نے جواب دیا "شبلی! میرے جواب پہ تم ہنسو گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سبق میں نے بلّی سے سیکھا ہے۔ ایک دن میں نے ایک بلّی کو چوہے کے بل کے سامنے بیٹھے دیکھا، تم تعجب کرو گے کہ وہ مجھ سے بھی زیادہ بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔"

شبلی نے کہا "سبحان اللہ۔ اس کی آیتیں ہر طرف بکھری پڑی ہیں اس کی نشانیاں ہر جگہ موجود ہیں۔ بشرطیکہ دیکھنے والی آنکھ ہو، اور غور کرنے والے دل و دماغ ہوں۔"

آپ غسل فرما رہے تھے، کپڑے باہر رکھے تھے۔ ایک شخص کی نیت خراب ہو گئی۔ اس نے سارے کپڑے اپنے قابو میں کیے اور اپنی راہ لی۔ غسل فرما چکنے کے بعد آپ کو کپڑوں کی حاجت ہوئی۔ بولے "یا اللہ! یہ کیسا اندھیر ہے، اپنے کپڑے تو میں تیری نگہبانی میں رکھ گیا تھا۔" آپ تھوڑی دیر یوں ہی بیٹھے رہے۔ پھر کسی شخص نے آپ کو آواز دی "ابوالحسن!

اپنے کپڑے لے لو۔"

ابوالحسن نے کپڑے لے لیے اور باہر نکل کر اپنے محسن کی شکل دیکھنا چاہی۔ وہاں ایک ایسا شخص کھڑا تھا جس کے دونوں ہاتھ مفلوج تھے۔آپ نے اس کا شکریہ ادا کیا لیکن وہ شخص خاموش رہا۔

آپ نے پوچھا" مجھ سے کوئی کام ہے؟ یا تم اپنی اس خدمت کا مجھ سے صلہ چاہتے ہو؟"

"حضرت! میں اپنی خدمت کا صلہ کیا مانگوں گا کیونکہ یہ سرے سے خدمت تھی ہی نہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ جس نے آپ کے کپڑے چرائے تھے وہ بدبخت میں ہی ہوں۔ خدا نے اس گناہ کی وجہ سے میرے دونوں ہاتھ مفلوج کر دیے۔"

اس کے بعد اس نے اپنے مفلوج ہاتھ آپ کی طرف بڑھا دیے آپ نے اس کے حق میں دُعا فرمائی۔" یا اللہ! اس شخص سے غفلت اور نادانی میں ایک گناہ سرزد ہو گیا تھا۔ اب یہ اس پر پشیمان ہے اور اس نے میرے کپڑے واپس کر دیے ہیں، اس لیے میری تجھ سے یہ استدعا ہے کہ اسے معاف فرمادے اور اس کے دونوں ہاتھ درست فرمادے۔"

اس شخص نے آپ کو دعا مانگتے سُنا۔ دونوں ہاتھ اب بھی ویسے ہی تھے۔ اس نے مایوسی سے کہا۔" حضرت! میں گھر جا رہا ہوں، میرے ہاتھوں کے حق میں دُعا فرماتے رہیں مجھے یقین ہے کہ آپ کی دُعا ضرور قبول ہوگی اور خدا آپ کو مایوس نہیں کرے گا۔"

آپ نے جواب دیا۔" میں دُعا تو کرتا ہی رہوں گا۔ لیکن تم کل مجھ سے ملنا ضرور!"

"ضرور ملوں گا۔" وہ شخص یہ کہہ کر چلا گیا۔
دوسرے دن صبح ہی صبح وہ شخص دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اپنے تندرست و توانا ہاتھوں کو ادھر ادھر حرکت دیتا ہوا بولا۔"حضرت میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں، آج صبح جب میں سو کر اٹھا تو مجھے اس کا احساس ہی نہ ہوا کہ میرے دونوں ہاتھ بیکار ہیں۔ یہ اس لیے کہ اس وقت میرے دونوں ہاتھ کام کر رہے تھے لیکن جیسے ہی مجھے یہ یاد آیا کہ کل میرے دونوں ہاتھ مفلوج ہو گئے تھے۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو خوب گھما پھرا کر دیکھا، یہ دونوں کام کر رہے تھے۔ میں فرطِ خوشی میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر آپ کے پاس بھاگا چلا آیا۔ اور یہ سب کچھ آپ کی دعاؤں کے طفیل ہوا۔ میں سوچتا ہوں کہ آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔"
آپ نے محبت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر فرمایا۔"شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، بس تیرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ تو نے اپنی غلطی کا احساس کیا اور نادم ہو کے میرے پاس آ گیا۔ اب جا اور خیال رکھ کہ ایسی غلطی دوبارہ سرزد نہ ہو!"
وہ شخص وعدہ کر کے چلا گیا۔ یہ واقعہ چاروں طرف مشہور ہو گیا اور بعض کو تو اس پر یقین ہی نہ آیا۔ ایک سرکش اور جاہل نوجوان نے ازراہِ مذاق یہ سوچا کہ ابوالحسن کی بزرگی اور کرامت کو لوگ بلاوجہ شہرہ دے رہے ہیں میں بھی ایک ایسی حرکت کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ ابوالحسن میرے خلاف کیا کرتے ہیں؟"
اس طرح ایک دن آپ جیسے ہی غسل فرمانے لگے اس نوجوان نے

آپ کے کپڑے پار کر دیے۔ آپ نے غسل فرما چکنے کے بعد باہر ہاتھ بڑھا کر کپڑے اٹھانا چاہے تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ آپ نے زیرِ لب کہا "کیا آج پھر کسی کی شامت نے زور مارا ہے؟"

ابھی کچھ ہی دیر گزری ہوگی کہ وہ نوجوان آپ کے کپڑے لے کر واپس آگیا اور نہایت عقیدت اور محبت سے آپ کے کپڑے واپس کر دیے اور کہا "حضرت! میں وہی ہوں جس نے آپ کے کپڑے چرائے تھے"

آپ نے جواب دیا "جزاک اللہ۔ یعنی تمہی نے میرے کپڑے چرائے تھے اور وہ کپڑے واپس لے بھی آئے، یہ کیوں؟"

اس نے کہا "جب سے میں آپ کے کپڑے لے گیا ہوں، اندر سینے میں ایک بھٹی سی سلگنے لگی ہے، میں نے بڑی کوشش کی کہ یہ سوزش کم ہو جائے لیکن ناکام رہا۔ بلکہ لمحہ بہ لمحہ اس میں اضافہ ہوتا رہا۔ عاجز آکر میں طبیب کے پاس گیا۔ اس نے خوب اچھی طرح دیکھا بھالا اور کہا کہ بظاہر تو کوئی مرض محسوس نہیں ہوتا۔ پھر بھی دوا دیے دیتا ہوں، اسے پیو، اگر افاقہ نہ ہو تو دوبارہ آجانا، دوا بدل دوں گا۔"

آپ توجہ سے اس کی روداد سنتے رہے، پوچھا "پھر کیا ہوا؟"

نوجوان نے جواب دیا "مرض اور زیادہ بڑھ گیا۔ اسی پریشانی میں کسی آواز نے مجھے حکم دیا۔ ابوالحسن کے کپڑے واپس کر دے ورنہ سینے کی یہ آگ تجھے پھونک دے گی۔ اس آواز پر میں آپ کے کپڑے واپس لے کر آگیا ہے"

آپ نے کہا "تو نے یہ خوب کیا کہ میرے کپڑے واپس لے آیا، ورنہ وہ آگ تجھے ہلاک کر دیتی۔"

نوجوان نے پوچھا۔ آپ اپنے کپڑوں کی حفاظت کے لیے کسی کو بٹھا کیوں نہیں دیتے ہے"

آپ نے جواب دیا۔" میں بٹھا کر کیا کروں گا کسی کو۔ میرے کپڑوں کی حفاظت تو خود خدا کرتا ہے اور اس سے بڑا محافظ اور کون ہو سکتا ہے"

نوجوان نے عرض کیا۔" حضرت! میرے حق میں کوئی دُعا فرمائیں"

آپ نے دُعا فرمائی۔" خداوند! اسے پاک و راستباز رکھ اور ایسے اوصاف سے متصف فرما جو دوسری دنیا میں بھی کام آئیں"

وہ نوجوان چلا گیا اور اس دعا کے طفیل ہمیشہ نیکو کار رہا۔

✢ ✢ ✢ ✢ ✢ ✢

آپ کہیں جا رہے تھے کہ ایک طرف سے آگ کے شعلے اٹھتے دیکھے لوگوں کے شور و غل نے دور دور تک قیامت اور نفسا نفسی کی کیفیت طاری کر رکھی تھی۔ آپ تیز تیز قدم اٹھاتے وہاں پہنچ گئے اور آگ کے جہنمی شعلوں کو عبرت سے دیکھنے لگے۔ یہ بغداد کے نامی گرامی امیر کا مکان تھا جو اس وقت جہنم زار بنا ہوا تھا۔ اس کے غلام اندر سے سامان نکالنے میں مشغول تھے لوگ آگ کا تماشہ دیکھنے میں مشغول تھے پھر آگ اس حد تک پھیل گئی کہ صدر دروازہ بھی اس کی زد میں آگیا، اور آنے جانے کا راستہ ہی بند ہو گیا۔

اچانک امیر نے چیخنا چلّانا شروع کر دیا۔" ہائے ہائے میرے دونوں غلام اندر ہی پھنس کر رہ گئے۔ اب میں کیا کروں، انہیں کیسے نکالوں ہے"

کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ امیر کی مدد کے لیے آگے بڑھتا۔ امیر نے مجمع کی طرف مخاطب ہو کر اعلان کیا۔" جو میرے دونوں غلاموں کو اندر سے نکال لائے گا، میں اسے ایک سو دینار انعام دوں گا"

مجمع پر کوئی اثر نہ ہوا۔ آگ پھیلتی جا رہی تھی۔

امیر نے پھر اعلان کیا۔ "میں انعام کی رقم میں دو سو کا اضافہ کرتا ہوں میرے دونوں غلاموں کو آگ سے نکال لانے والے کو تین سو دینار انعام دیے جائیں گے۔"

مجمع میں ذرا سی بے چینی پیدا ہوئی۔ لوگ مکھیوں کی طرح بھنبھنانے لگے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ امیر نے پھر اعلان کیا۔ "پانچ سو دینار۔ کیا اس مجمع میں ایک شخص بھی صاحب ہمت نہیں جو آگے بڑھے اور میرے دونوں غلاموں کو باہر نکال لائے۔ میں پانچ سو دینار اسی وقت اس کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔"

اس اعلان نے لوگوں میں حرص و طمع کو کچھ زیادہ ہی بیدار کر دیا۔ کئی آدمی ہمت کر کے آگے بڑھے اور امیر سے کہا۔ "کیا انعام اسی وقت دیا جائے گا؟"

امیر نے بے چینی سے جواب دیا۔ "اجی اسی وقت کیا معنی ہیں کہیے تو پانچ سو دینار فوراً ہی کسی شخص کے پاس رکھوا دیے جائیں۔ میں غلط اعلان نہیں کر رہا۔"

دو آدمی ایک ساتھ آگ کی طرف بڑھے اور اس میں گھس جانے کی کوشش کی لیکن آگ کے شعلوں نے ان کو جھلسا کر رکھ دیا۔ وہ گھبرا کر واپس آ گئے اور کراہتے ہوئے کہا۔ "دونوں غلاموں کو باہر نکال لانا ناممکن ہے۔ اگر تم پانچ سو نہیں پانچ ہزار دینار دو تب بھی کوئی اس آگ میں نہیں گھسے گا۔ کس کی جان فالتو ہے جو اس جہنم کے حوالے کر دے۔"

امیر نے اعلان کیا۔ "ایک ہزار دینار۔ دونوں غلاموں کو نکال لاؤ اور

اور ایک ہزار دینار کھرے سے حاصل کر لو۔"

ابوالحسن نے مجمع سے پوچھا "تم میں کوئی صاحب ایسے ہیں کہ اس امیر کے دونوں غلاموں کو آگ سے نکال لانے کی ہمت رکھتے ہوں ؟"

چند آوازیں سنائی دیں "کس کی جان فالتو ہے جو ایک ہزار دینار کی خاطر ہلاکت میں ڈال دے۔"

آپ نے کہا "پھر میں ہمت کروں۔"

امیر کی جان میں جان آئی۔ بولا "جناب فوراً۔ اسی وقت یہ آپ ابھی تک سوچ کیا رہے تھے ؟"

کسی نے ازراہِ مذاق کہا "انعام کی رقم میں اضافہ کا انتظار کر رہے تھے۔"

آپ نے اس مذاق کی کوئی پروانہ کی آگے بڑھے اور بسم اللہ کہہ کر آگ میں داخل ہو گئے۔ لوگ دم بخود یہ ہولناک منظر دیکھتے رہ گئے۔ ہر ایک کا یہی خیال تھا کہ ابوالحسن بھی جل بھن کر خاک ہو جائیں گے۔ بعض اس بات پر دم بخود تھے کہ یہ درویش لالچی کب سے ہو گیا۔

کئی لمحے گزر گئے لیکن ابوالحسن واپس نہیں آئے۔ لوگ سمجھے ابوالحسن بھی گئے۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد لوگوں نے یہ عجیب و غریب منظر دیکھا کہ ابوالحسن دونوں غلاموں کو، دونوں بغلوں میں دبائے چلے آرہے ہیں اور ان پر آگ اثر نہیں کر رہی ہے۔ جو کچھ نظر آرہا تھا اس پر کسی کو یقین کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا، لیکن جب دونوں غلام صحیح سلامت امیر کے سامنے کھڑے کر دیے تو یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ ہی نہ تھی۔ امیر نے شکر گزار نظروں سے ابوالحسن کی طرف دیکھا اور کہا "جناب! میں آپ کے اس احسان کا کس

زبان سے شکریہ ادا کروں؟ میں نے ایک ہزار دینار کا تو اعلان کیا تھا لیکن اگر آپ فرمائیں تو میں دو ہزار دینار ادا کر دوں۔"

آپ نے حقارت سے جواب دیا "بے وقوف انسان! تو نے یہ کس طرح سمجھ لیا کہ میں نے تیرا یہ کام ایک ہزار دینار کے لالچ میں کیا ہے؟ میں نے یہ کام سوداگری میں نہیں کیا۔ فی سبیل اللہ، دو قیمتی جانوں کو بچانے کی خاطر کیا ہے، اپنے دینار اپنے ہی پاس رکھ، مجھے نہیں چاہئیں۔"

امیر ششدر و حیران کھڑا صورت دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد بولا۔ "لیکن حضرت! یہ تو بتائیے کہ اتنا اہم کام آپ نے انجام کس طرح دیا؟ اور آگ نے آپ پر یا ان دونوں غلاموں پر اثر کیوں نہیں کیا؟"

آپ نے جواب دیا "اگر میں سوداگری شروع کر دوں تو میں اپنی اس غیر معمولی قوت کو بھی زائل کر دوں گا۔ میں نے یہ صفت اس طرح پیدا کر لی ہے کہ میں لوگوں کی خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں لیتا۔"

آپ کے آگ میں نہ جلنے کا شہرہ چاروں طرف پھیل گیا۔ گھر میں ایک خادمہ بھی موجود تھی۔ اس نے بھی یہ واقعہ سنا تو اسے اس پر یقین نہ آیا اس نے دل میں سوچا کہ یہ معمولی سا شخص جو دن میں کام دھندے سے لگا رہتا ہے اور رات کو شب بیداری کرتا ہے اتنا بڑا آدمی نہیں ہو سکتا کہ آگ اسے جلانے سے باز رہے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ آپ نے ایک جلتا ہوا انگارا ہتھیلی پر رکھ لیا اور پھر اسے یوں مسل کر پھینک دیا گویا وہ مٹی کا ڈھیلا تھا۔ ہتھیلی پر سیاہی سی دوڑ گئی۔ خادمہ نے اس واقعہ پر بھی کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اس نے اسی وقت آپ کے سامنے دودھ کا پیالہ اور روٹی لا کر رکھ دی۔ آپ نے ہاتھ بھی نہیں دھوئے اور اسی طرح

کھانا شروع کر دیا۔ خادمہ کو یہ بات بہت زیادہ بُری لگی اور اس نے دل میں سوچا کہ یہ کیسا بدتمیز شخص ہے کہ کھانے سے پہلے ہاتھ بھی نہیں دھوئے۔"

اسی وقت کسی نے دروازے پر دستک دی۔ آپ نے دروازہ کھولا، دیکھا، باہر کئی سپاہی کھڑے ہیں۔ ایک سپاہی نے پوچھا۔ "آپ کے گھر میں کوئی خادمہ بھی رہتی ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں ہے تو ضرور اور وہ بھی امیرالمومنین کی عطا کردہ ہے!"

شاہی سپاہی نے کہا۔ "ہمیں اس سے ملا دیجئے۔ ہمیں امیرالمومنین ہی نے بھیجا ہے۔"

آپ نے خادمہ کو سپاہیوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ ایک سپاہی نے خادمہ کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ "سچ بتا کیا تو نے امیرالمومنین کا زیرجامہ چرایا تھا؟"

خادمہ دونوں ہاتھ کانوں پہ رکھے بولی۔ "بخدا میں نے چوری نہیں کی۔"

ایک سپاہی نے خادمہ کے منہ پہ طمانچہ رسید کر دیا۔ "سیدھی طرح چوری کا اقرار کر لے، ورنہ مار مار کر ہلاک کر دی جائے گی۔"

آپ نے مداخلت کی۔ "تم لوگوں نے اسے مارنے کے لیے تو نہیں بلایا تھا، پھر کیوں مار رہے ہو؟"

سپاہی نے کہا۔ "حضرت جی! آپ خاموش رہیں یہ امیرالمومنین کا زیرِ جامہ چرا لائی ہے اور ہم وہ زیرِ جامہ لے کر ٹلیں گے۔ اگر یہ سیدھی طرح اقرار نہیں کرے گی تو ہم طاقت استعمال کریں گے!"

اور ایک تھپڑ اور رسید کر دیا۔ خادمہ زار و قطار رونے لگی۔
آپ نے سپاہی کا ہاتھ پکڑ لیا، بولے "وہ اسے ناحق کیوں مارتے ہو؟
تمہیں زیر جامہ درکار ہے وہ مل جائے گا۔"
سپاہی نے پوچھا "کہاں ہے وہ زیر جامہ؟ اگر آپ کے پاس ہے
تو یہ آپ کے پاس کہاں سے آیا؟"
آپ نے جواب دیا "میرے پاس نہیں ہے، بلکہ میں نے اسے منگوایا
ہے وہ آدمی لے کر پہنچنے ہی والا ہے۔"
سپاہی نے کہا "عجیب باتیں ہیں آپ کی بھی۔ وہ زیر جامہ کہاں
سے منگوایا ہے؟ کون لا رہا ہے؟"
اسی وقت ایک اجنبی نے دروازے کے اندر جھانک کر کہا "حضرت
یہ زیر جامہ شاہی محل کے باہر پڑا ہوا تھا۔ غالباً سوکھنے کے لیے ڈالا گیا ہو
گا اور تیز ہوا نے اسے باہر میدان میں پہنچا دیا۔"
سپاہیوں نے زیر جامہ قبضہ میں کیا اور ابوالحسن سے معذرت چاہی۔
"جناب! ہمیں افسوس ہے کہ غلطی اور بدظنی میں ہم سے ایسی زیادتی ہوگئی
براہ کرم معاف فرما دیجئے۔"
آپ نے بیزاری سے فرمایا "بس اب تم لوگ یہاں سے چلے
جاؤ۔ یہاں رکو مت!"
جب سپاہی چلے گئے تو آپ نے دیکھا خادمہ کے دونوں رخسار
تھپڑوں کی وجہ سے سرخ ہو گئے ہیں اور وہ ایک کونے میں بیٹھی آنسو
بہا رہی ہے۔ آپ نے اسے تسلی دی "لڑکی! چپ ہو جا، صبر کر، خدا
صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے!"

لڑکی نے روتے ہوئے کہا "مجھے چور کہہ کر مارا گیا ہے، میں شرم سے پانی پانی ہوئی جا رہی ہوں!"

آپ نے کہا "تو نے مجھے بدتمیز سمجھا تھا تو میں نے تو تجھ سے اس کی شکایت کی نہیں، اب تو اللہ کی شکایت کیوں کرتی ہے؟"

خادمہ آپ کے قدموں میں گر گئی۔ بولی "اگر یہ اس بات کی سزا تھی کہ میں نے آپ کو اپنے دل میں بدتمیز سمجھا تھا تو میں معذرت خواہ ہوں اور معافی چاہتی ہوں، خدا کے لیے مجھے معاف فرما دیجئے۔"

آپ نے جواب دیا "میں نے تو تجھے اسی وقت معاف کر دیا تھا ہاں اب میں تجھے ایک نصیحت ضرور کروں گا اور وہ نصیحت یہ ہے کہ زندگی بھر بدگمانی سے بچنے کی کوشش کرنا، سوءِ ظنی بڑی بُری عادت ہے!"

خادمہ نے توبہ استغفار کی اور زندگی بھر بدگمانی سے بچنے کا وعدہ کر لیا۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

آپ بازار سے گزر رہے تھے کہ چند آدمی شراب کے دو مٹکے لیے ہوئے آپ کے پاس سے گزرے، آپ نے شراب کی بُو محسوس کر لی، اور قریب سے چند پتھر اٹھا کر ان مٹکوں کو توڑ دیا۔ شراب سڑک پر بہنے لگی ان آدمیوں نے آپ کو پکڑ لیا۔ اور پوچھا کہ تو نے ہمارے مٹکے کیوں توڑ دیے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "ان میں شراب بھری تھی، اس لیے میں نے انہیں توڑ دیا۔"

ان لوگوں نے کہا "لیکن تم توڑنے والے کون ہوتے ہو؟"

"اس کا جواب میں تمہیں کیوں دوں؟"

ان لوگوں نے انہیں سرکاری آدمیوں کے حوالے کر دیا۔ یہ المعتضد کا زمانہ تھا۔ المعتضد نے انہیں دربار میں طلب کر لیا۔ پوچھا "آپ کی شکایت ہم تک پہنچی ہے کہ آپ نے دو مٹکے توڑ دیے!"

"آپ نے کہا" لیکن آپ جانتے ہیں کہ ان مٹکوں میں کیا تھا؟"

المعتضد نے کہا "ان میں شراب تھی لیکن آپ انہیں توڑنے والے کون ہوتے ہیں؟"

آپ نے دلیری سے جواب دیا "میں محتسب ہوں"

"آپ محتسب ہیں!" خلیفہ نے حیرت سے پوچھا "یہ آپ کو محتسب کس نے بنا دیا؟"

آپ نے بے باکی سے جواب دیا "اس نے جس نے تجھے امیرالمومنین بنا دیا"

المعتضد پر اس جرأت و بے باکی کا بڑا اثر ہوا۔ اس نے مزید بازپرس کے بغیر آپ سے معافی چاہی اور کہا "حضرت! خلافت کے دروازے آپ کے لیے ہر وقت کھلے ہیں۔ جب اور جس کام سے چاہیں تشریف لائیں۔ ہمیں آپ جیسی ذات کی ضرورت ہے"

آپ وہاں سے چلے آئے اور سامانِ سفر باندھنا شروع کر دیا۔ جن لوگوں نے دربار میں آپ کی عزت افزائی دیکھی تھی انہوں نے گھر آ کر مبارکبادیں دینی شروع کر دیں۔ لیکن جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ابوالحسن ترکِ مکانی کر رہے ہیں تو بڑی حیرت ہوئی۔ پوچھا "حضرت! یہ کہاں کی تیاریاں ہو رہی ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔" میں بغداد چھوڑ رہا ہوں!"
کسی نے پوچھا۔" یہ کیوں ؟ امیر المومنین تو آپ کی بڑی عزت فرماتے ہیں!"
آپ نے جواب دیا۔" اسی لیے تو ترکِ مکانی پر مجبور ہوا ہوں، لوگ میرے پاس سفارشیں لے کر آئیں گے اور چاہیں گے کہ میں ان کی عرضداشت امیر المومنین تک پہنچا دوں۔ یہ کام میرے بس کا نہیں ہے کہ میں بار بار معتضد کی شکل دیکھوں بس ایک بار دیکھ لی۔ کافی ہے!"
آپ اسی دن بصرے چلے گئے۔
راستے میں ایک جگہ تھوڑی دیر ٹھہرے تو دیکھا کہ ایک شخص مرے ہوئے گدھے کے پاس بیٹھا رو رہا ہے، آپ اس کے پاس گئے اور پوچھا۔" بھائی! تم رو کیوں رہے ہو؟"
گدھے والے نے آپ کی شکل دیکھی اور مصیبت زدہ لہجہ میں بولا۔
"اپنی راہ لو بھائی، تمہیں کیا معلوم کہ اس وقت میں کس مصیبت میں گرفتار ہوں۔"
آپ نے کہا۔" بھائی! تم اپنی مصیبت مجھے بتاؤ۔ ممکن ہے میں کوئی مدد کر سکوں۔"
اس شخص نے پاس پڑے ہوئے مال و اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" یہ اتنا بہت سارا مال و اسباب لے کر مجھے گھر پہنچنا ہے اور یہ گدھا مر گیا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں گھر یہ سامان کس طرح لے جاؤں گا!"
" بس اتنی سی بات!" آپ نے بے پروائی سے کہا۔" یہ کوئی ایسا مسئلہ

تو نہیں کہ تم اس طرح زار و قطار روتے پھرو!"
گدھے والے نے غصّے میں کہا "میاں جی! اپنا راستہ ناپو ورنہ میں بُری طرح پیش آؤں گا!"
آپ گدھے کے قریب گئے اور اسے ٹھوکر مار کر فرمایا "گدھے! یہ سونے کا کون سا وقت ہے، اٹھ اور اپنے مالک کی مشکل آسان کر۔"
گدھا اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس کا مالک دونوں کو اس طرح دیکھنے لگا، گویا اسے گدھے کی دوبارہ زندگی اور ابوالحسن کے انسان ہونے میں کوئی شبہ ہے۔ وہ آپ کے قدموں میں گر گیا بولا "حضرت! میں نے آپ کی شان میں بڑی گستاخی کی ہے۔ خدا کے لیے مجھے معاف فرما دیجئے۔"
آپ نے کہا "کیسی اور کہاں کی گستاخی، تو اپنی راہ لے، بہت پریشان ہو رہا تھا۔"
گدھے والے نے جلدی جلدی سامان لادا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

* * * * *

آپ ایک عرصہ تک بصرہ ہی میں رہے اور بغداد کے لوگ آپ کی یاد میں پریشان، واپسی کے دن گنتے رہے۔ آخر جب انہیں یہ اطلاع ملی کہ معتضد کا انتقال ہو گیا تو آپ بغداد واپس چلے گئے۔
مسجد میں نماز کے لیے آپ بھی پہنچے اور نیا خلیفہ بھی۔ آپ نے نماز کے دوران اپنے پاس والے نمازی کو داڑھی پر بار بار ہاتھ پھیرتے جو دیکھا تو سلام پھیر کر سختی سے منع کیا "اپنا ہاتھ خدا کی داڑھی سے دور رکھ۔"
آپ کا یہ فقرہ فوراً ہی خلیفہ کے گوش گزار کر دیا گیا۔ خلیفہ نے اسی وقت جواب طلب کر لیا "کیوں جناب! آپ نے اس نمازی سے یہ کیوں

کہا کہ اپنا ہاتھ خدا کی داڑھی سے دُور رکھ ۔"
آپ نے پوچھا "اس میں قابلِ اعتراض بات کیا ہے ؟"
خلیفہ نے جواب دیا "خدا کی داڑھی ! آخر یہ داڑھی خدا کی کس طرح ہو گئی ؟"
آپ نے کہا "بس ذرا سمجھ کا قصور ہے ، جب بندہ خود خدا کی ملکیت ہے تو داڑھی کس شمار قطار میں ہے !"
خلیفہ نے شرمندگی سے کہا "خوب ۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے عجلت میں آپ کے قتل کا حکم نہیں دیا ۔"
آپ مسجد سے باہر آ گئے ۔
آپ نے جنید سے کہا " حضرت ! میں تیس سال سے ایک عجیب سی ادھیڑ بن میں مبتلا ہوں !"
جنید نے پوچھا " وہ کیا ؟"
آپ نے جواب دیا "حضرت ! جب اللہ تعالیٰ ظاہر ہوتا ہے تو میں گم ہو جاتا ہوں اور میں ظاہر ہوتا ہوں تو اس کی ذات گم ہو جاتی ہے ۔ یعنی میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ اس کی حضوری میری غیبت میں مضمر ہے اور جب میں یہ کوشش کرتا ہوں کہ دونوں موجود رہیں تو مجھے یہ حکم ملتا ہے کہ بس جس حال میں ہے اسی میں رہ ، یا تو تو رہے گا یا میں رہوں گا ۔"
جنید نے کہا "ابوالحسن ! تم اسی حالت پہ قائم رہو ۔ اس طرح ظاہر و باطن میں وہی نظر آتا رہے گا اور تم گُم رہو گے ۔"
آپ بیمار پڑے تو جنید عیادت کو حاضر ہوئے ۔ وہ اپنے ساتھ پھل وغیرہ لے کر پہنچے اور کہا "ابوالحسن ! انہیں کھا لینا ، یہ کمزوری کو دُور

کریں گے۔"

ابوالحسن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اچھے ہو جانے کے بعد پتہ چلا کہ جنید کی طبیعت خراب ہے۔ وہ صاحب فراش ہیں۔ یہ اپنے ارادت مندوں کو ساتھ لے کر ان کی عیادت کو پہنچ گئے۔

آپ نے جنید کو مخاطب کیا "جنید! تم میری بیماری میں پھل وغیرہ لے کر پہنچے تھے، لیکن میں خالی ہاتھ آ گیا ہوں۔ تم نے کچھ محسوس تو نہیں کیا؟"

جنید نے مسکرا کر کہا "تم کیا کہنا چاہتے ہو، میں جانتا ہوں لیکن مجھے شرمندہ نہ کرو۔"

آپ نے اپنے ارادت مندوں کو حکم دیا "جنید کی بیماری تقسیم کر لو!"

اور ذرا سی دیر بھی نہ گزری تھی کہ جنید صحت یاب ہو گئے اور ابوالحسن کے ارادت مندوں کو معمولی سی شکایتیں پیدا ہو گئیں۔ آپ نے جنید سے کہا "جنید عیادت پھلوں سے نہیں، اس طرح کی جاتی ہے۔"

جنید مسکرا کر خاموش ہو رہے۔

✢ ✢ ✢ ✢ ✢ ✢ ✢

بغداد میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو صوفیائے کرام کے سخت خلاف تھے، انہی میں خلیفہ کا غلام خلیل بھی شامل تھا۔ یہ وقتاً فوقتاً ان صوفیوں کے اقوال اور تعلیمات کو مسخ کر کے خلیفہ کے گوش گزار کرتا رہتا تھا۔ یہ باتیں آہستہ آہستہ خلیفہ کے ذہن میں بیٹھتی چلی گئیں۔ ایک دن خلیفہ نے خلیل سے پوچھا۔

"کیا ان مشائخ کے بارے میں اب تک جو کچھ تو نے کہا درست ہے؟"

خلیل نے جواب دیا "نہ صرف درست۔ بلکہ اب تک جو کچھ بھی امیر المومنین

کے علم میں آیا ہے وہ اس سے کچھ کم ہی ہے جس کے یہ مشائخ حضرات مرتکب قرار پاتے ہیں۔"

خلیفہ نے پوچھا۔" مثلاً ؟"

غلام خلیل نے عرض کیا۔" یہ لوگ رقص و سرود بھی کرتے ہیں اور اشاروں کنایوں میں بات کرتے ہیں اور زبان سے ایسے کلمات نکالتے ہیں جو گردن زدنی ہوتے ہیں۔"

خلیفہ نے مشتعل ہو کر فرمان جاری کر دیا۔" جملہ مشائخ کو قتل کر دیا جائے۔"

جلّاد کا فی الفور انتظام ہو گیا۔ جملہ صوفیائے کرام کو قطار میں بٹھا دیا گیا۔ ان میں ابو الحسن بھی تھے۔ شبلی بھی اور جنید بھی۔ قتل کیے جانے والوں میں سب سے پہلا نمبر ارقام نامی صوفی کا تھا۔ ابو الحسن نے ارقام کو ہٹا کر اس کی جگہ خود لے لی۔ سامنے خلیفہ بھی یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے قاضی سے کہا۔" اس شخص سے یہ معلوم کیا جائے کہ جب ابھی اس کا نمبر نہیں آیا تھا تو یہ ارقام کو ہٹا کر اس کی جگہ کیوں بیٹھ گیا ہے؟"

قاضی نے جب یہی سوال آپ کے سامنے دہرایا تو آپ نے جواب دیا۔

"میری بنیادِ طریقت جذبۂ ایثار ہے!"

خلیفہ نے کہا۔" اس سے کہو، یہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس کی وضاحت کرے۔"

قاضی نے ابو الحسن سے کہا۔" امیر المومنین تمہارے جواب کی وضاحت طلب فرما رہے ہیں۔"

آپ نے جواب دیا۔" میں مسلمانوں کی جان کے بدلے اپنی جان دے دینا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔"

خلیفہ نے قاضی کے توسط سے پوچھا۔" یہ کیوں ؟"

آپ نے جواب دیا۔" میرے نزدیک دنیا کا ایک لمحہ محشر کے ہزار سال سے افضل ہے کیونکہ دنیا مقام خدمت ہے اور عقبیٰ مقام قربت اور یہ طے ہے کہ خدمت کے بغیر قربت کا حصول ناممکن ہے۔"

خلیفہ نے قاضی سے کہا۔" ان کی باتیں کچھ عجیب سی ہیں، بتاؤ ان کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟"

قاضی نے جواب دیا۔" امیر المومنین! میں ان سے چند سوال کروں گا ان کے جوابات پر شرعی فیصلے کا انحصار ہے۔"

خلیفہ نے کہا۔" کرو سوال، میں بھی سنتا ہوں۔"

قاضی نے اس مجمع میں ابوبکر شبلی کو سب سے زیادہ دیوانہ تصور کیا۔ ان سے پوچھا۔" بتائیے بیس [20] دینار پر کتنی زکوٰۃ واجب آتی ہے؟"

شبلی نے جواب دیا۔" ساڑھے بیس [20] دینار۔"

اس عجیب و غریب جواب پر خلیفہ اور قاضی چونک پڑے۔ قاضی نے کہا۔" یہ کیسا مہمل جواب تم دے رہے ہو، آخر کس حساب سے؟"

شبلی نے جواب دیا۔" بیس [20] دینار ادا کر کے نصف دینار اس جرم میں دے کہ اس نے بیس دینار جمع کیوں کیے؟"

قاضی نے پوچھا۔" اس کی کوئی سند؟"

شبلی نے جواب دیا۔" حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس چالیس دینار تھے۔ آپ نے یہ سارے دینار زکوٰۃ میں دے دیے تھے۔"

شبلی کے بعد قاضی نے چند سوالات ابوالحسن سے بھی کیے۔ آپ نے ان کے جوابات دے کر قاضی سے کہا۔" تم لوگ ہم سے جرح بحث کر کے خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ میں تمہیں چند نکات سمجھاتا

ہوں۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جو لوگ دربار سرکار یا محض دنیادار نظر آتے ہیں اللہ نے صرف ان ہی کو تخلیق فرمایا ہے، سُن لو، اللہ نے ایسے بندے بھی تخلیق فرمائے ہیں جن کی حیات و ممات اور قیام و کلام سب کچھ اس کے اپنے مشاہدے سے وابستہ ہے۔ اور یہ لوگ اگر ایک لمحے کے لیے بھی مشاہدے سے محروم ہو جائیں تو ان کی موت واقع ہو جائے اور یہی وہ لوگ ہیں جو اس کے سامنے رہتے ہیں۔ اسی سے سوتے ہیں، اسی سے کھاتے ہیں اسی سے سنتے ہیں اور اسی سے طلب کرتے ہیں۔"

قاضی اس گفتگو سے اتنا بے قابو اور وارفتہ ہوا کہ خلیفہ سے بے جھجک عرض کیا "امیر المومنین! اگر یہ لوگ بھی ملحد و زندیق قرار دے دیے جائیں گے تو پھر میں یہ فتویٰ دوں گا کہ پورے عالم میں ایک بھی موحّد موجود نہیں۔"

خلیفہ بھی ان کی باتوں سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اس نے ان سب سے کہا "آپ حضرات مجھ سے کچھ طلب کیجئے۔ کچھ دے کر میں خوشی محسوس کروں گا۔"

ان سب نے متفقہ طور پہ جواب دیا "اگر آپ ہمیں کچھ دے سکتے ہیں تو یہ وعدہ دیجئے کہ آپ ہمیں بھول جائیں گے اور آئندہ کبھی بھی ہمیں یاد نہیں فرمائیں گے۔"

خلیفہ ان کے اس جواب پر رونے لگا اور اس پر دیر تک رقّت طاری رہی اس نے ان سب کو احترام کے ساتھ رخصت کر دیا۔

* * * * *

ابوبکر شبلی منبر پہ چڑھے وعظ فرما رہے تھے آپ اُدھر سے

گزرے اور کہا "السلام علیکم یا ابی بکر!"

ابو بکر نے جواب دیا "وعلیکم السلام یا امیر القلوب!"

آپ نے کہا "ابی بکر! بے عمل عالم سے اللہ خوش نہیں ہوتا اگر تم باعمل عالم ہو تو اپنا وعظ جاری رکھو ورنہ منبر سے نیچے اتر آؤ۔"

شبلی سوچ میں پڑ گئے۔ ابوالحسن، جنہیں صوفیائے ہم عصر نے امیر القلوب اور نوری کا خطاب دیا تھا، غلط بیانی نہیں کر سکتے تھے۔ شبلی نے سوچا، یقیناً عمل میں کسی قسم کی کوتاہی پائی جاتی ہے ورنہ ابوالحسن ایسی بات نہ کہتے۔ یہ منبر سے اتر آئے اور گوشہ نشینی اختیار کر لی اور عبادت میں مشغول ہو گئے۔

کچھ عرصہ بعد لوگوں نے شبلی کو گوشہ تنہائی سے باہر نکال لیا اور وعظ گوئی پہ مجبور کر دیا۔ شبلی منبر پہ چڑھے اور وعظ فرمانے لگے۔ ابوالحسن کو جیسے ہی اطلاع ملی، شبلی کے پاس پہنچے۔ فرمایا "شبلی! ذرا اس نکتے پر تو غور کرو کہ تم نے مخلوق سے چھپنے کی کوشش کی تو تمہیں تعظیماً دوبارہ منبر پر لے آئے اور ایک میں ہوں کہ میں نے مخلوق سے رابطہ قائم رکھا اور انہیں راستہ دکھانا چاہا تو انہوں نے میری پتھروں سے تواضع کی۔"

شبلی نے دریافت کیا "حضرت! میری پوشیدگی اور آپ کی ہدایت کا کیا مفہوم ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ مفہوم نہایت واضح اور صاف ہے۔ تم جو کچھ بھی کہتے ہو، اس کی صداقت پہ دنیا داری کا ہلکا سا حجاب ضرور موجود رہتا ہے گویا تم خالق و مخلوق کے مابین حجاب و واسطہ ضرور بنے رہتے ہو حالانکہ تمہیں یہ حق حاصل نہیں ہے کہ خالق و مخلوق کے مابین حجاب و واسطہ بن سکو۔

لیکن مجھے کسی واسطہ کی ضرورت نہیں اسی لیے مخلوق کے پتھر برداشت کرتا ہوں، اسی فرق کی وجہ سے میں تمہیں کچھ زیادہ کارآمد نہیں سمجھتا۔"

آپ کا شہرہ اتنا پھیل چکا تھا کہ دور دراز علاقوں سے لوگ آپ کی زیارت کو آیا کرتے تھے۔ اصفہان کے ایک نوجوان کے دل میں آپ کی ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔ اس نے اپنے دوستوں سے اپنی اس خواہش کا ذکر کیا۔ یہ خبر اصفہان کے حکمران تک پہنچ گئی۔ اس نے اس نوجوان کو طلب کیا اور کہا۔"کیا تم ابوالحسن نوری سے ملنے جا رہے ہو؟"

نوجوان نے جواب دیا۔" ہاں میں ان کی قدم بوسی کرنے جا رہا ہوں"

حکمران نے کہا۔"ہم نے سنا ہے کہ یہ شخص صاف صاف باتیں کرتا ہے اور جو شخص بھی ان کی صحبت سے اٹھتا ہے وہ حق گو اور بے باک ہو جاتا ہے۔ یہ حق گو اور بے باک لوگ حکومتوں کے لیے غیر مفید اور ضرر رساں ہوتے ہیں اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ تم ان سے ملنے نہ جاؤ۔"

نوجوان نے اصرار کیا۔" نہیں جناب میں نے وہاں جانے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے اسے بدل نہیں سکتا۔"

حکمران نے کہا۔"اگر تم اپنا ارادہ بدل دو تو میں اس صلے میں تمہیں ایک محل جو ساز و سامان سے آراستہ ہو گا اور چند قیمتی زیورات سے لدی پھندی کنیزیں دے سکتا ہوں۔"

نوجوان نے جواب دیا۔" نہیں جناب، میں اس لالچ میں اپنا ارادہ نہیں بدل سکتا۔"

یہ نوجوان حکمران سے بچکر خاموشی سے بغداد روانہ ہو گیا، اس نے احتراماً جوتے بھی اتار دیے اور ننگے پاؤں پیدل سفر کرتا رہا اس کے پیروں

ہیں کئی بار چھالے پڑے اور پھوٹے، یہ آبلے زخم بن گئے۔ جن سے ٹیسیں اٹھنے لگیں لیکن اس کے شوق میں کوئی فرق نہ آیا۔

ادھر ابوالحسن نوری نے اپنے ارادت مندوں کو حکم دیا" بغداد کے شمالی دروازے سے باہر نکلو، اور ایک میل تک راستے کو کانٹوں اور کنکروں پتھروں سے صاف کر دو۔"

ارادت مندوں نے پوچھا "کیا حضرت سفر فرمانے کا قصد فرما رہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا" نہیں، بلکہ ہمارا ایک مرید اصفہان سے پیدل چل کر آرہا ہے۔ اس کے پیروں میں آبلے اور زخم پڑ چکے ہیں اور ہم نہیں چاہتے کہ بغداد کے کانٹے اور پتھر بھی اسے اذیت پہنچائیں۔"

ارادت مندوں نے حسب الحکم ایک میل تک کا راستہ صاف کر دیا اور انہوں نے دیکھا ایک شخص نشے میں جھومتا بھاگا چلا آرہا ہے اس کا حال شرابیوں جیسا تھا، میلے کپڑے، جن پر راہ کی گرد وغبار کی تہہ جمی ہوئی تھی اور وہ جگہ جگہ سے پھٹ بھی گئے تھے۔ اس نے ابوالحسن کے ارادتمندوں پر نظر بھی نہ ڈالی۔

ایک ارادت مند نے آگے بڑھ کر پوچھا "کیا آپ ابوالحسن نوری کی زیارت کو جا رہے ہیں؟"

نوجوان نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس ارادت مند کی طرف دیکھا اور جواب دیا "ہاں، لیکن یہ بات تمہیں کس نے بتائی ہے؟"

ارادت مند نے جواب دیا "اس نے، جس سے تم ملنے جا رہے ہو۔"

نوجوان نے فرطِ جوش میں کہا "وہ کہاں ہیں مجھے ان کے پاس فوراً

لے چلو۔"

جب یہ ارادت مند اس شخص کو لے کر ابوالحسن کے پاس پہنچے تو آپ نے اس نوجوان سے کہا۔" کہو، کیا تمہیں اصفہان کے حکمران کا ساز و سامان سے آراستہ مکان اور نہ زیورات سے لدی کنیزیں واقعی پسند نہیں آئیں ؟"

اس شخص نے آپ کو حیرت سے دیکھا اور پوچھا۔" یہ سب آپ کو کس نے بتایا ؟"

آپ نے جواب دیا۔" اس نے، جس نے تیرے دل میں میری زیارت اور محبت کا شوق پیدا کیا۔"

پھر آپ نے قدرے تامل اور سکوت کے بعد فرمایا۔" سچے مرید اور طالب کی پہچان ہی یہی ہے کہ اگر سارے جہان کی نعمتیں بھی اس کے سامنے ڈھیر کر دی جائیں تو وہ ان کی طرف نگاہ بھی نہ ڈالے۔"

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

آخری عمر میں کسی نے آپ سے پوچھا۔" ابوالحسن! یہ نور جو تم میں پایا جاتا ہے، کیا ہے ؟"

آپ نے جواب دیا۔" میرا قلب چالیس سال سے نفس سے علیٰحدہ ہے جس کی وجہ سے میرے قلب میں گناہ کا تصور تک نہیں رہا۔ لیکن یہ نوری مقام مجھے اس وقت حاصل ہوا جب میں نے خدا کو پہچان لیا۔ ایک نور کا مشاہدہ کرتے کرتے میں خود نور بن گیا۔ میں نے ایک بار خدا سے دائمی حالت بھی طلب کی تھی تب کہیں مجھے یہ جواب ملا تھا کہ سوائے دائم رہنے والے کے دائمی حالت پر کوئی دوسرا بسر نہیں کر سکتا۔"

اتنا بلند مقام حاصل کر لینے کے باوجود آپ ایک طالب علم کی طرح تھے اور جاننے سیکھنے کا کوئی موقع ضائع نہیں جانے دیتے تھے۔ ایک دن شارع عام پر آپ نے ایک بوڑھے کمزور کو مار کھاتے دیکھا اسے سرکاری آدمی مارتے ہوئے قید خانے کی طرف لے جارہے تھے اور اس شخص کی برداشت کا یہ عالم تھا کہ اُف بھی نہیں کر رہا تھا۔ آپ اس کے پیچھے پیچھے قید خانے تک پہنچ گئے۔ سرکاری آدمیوں نے آپ کو روکنا چاہا تو آپ نے کہا "میں اس غیر معمولی قوتِ برداشت کے حامل شخص سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

سپاہیوں نے کہا "جاؤ کر لو سوالات۔"

آپ نے بوڑھے سے پوچھا "جناب! یہ تو بتائیے کہ اس قدر ضعف اور نقاہت کے باوجود آپ نے صبر و تحمل سے کس طرح کام لیا؟"

بوڑھے نے انہیں غور سے دیکھا اور جواب دیا "ابوالحسن! صبر و تحمل کا تعلق ہمت و شجاعت سے ہوتا ہے اس کا قوت اور صحت سے کوئی واسطہ نہیں، مجھ میں ہمّت اور شجاعت اتنی ہے کہ یہ شاہی سپاہیوں کی مارپیٹ کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی۔"

آپ کو بوڑھے کی گفتگو میں بڑا مزہ آیا۔ پوچھا "اور آپ کے نزدیک صبر کا کیا مطلب ہے؟"

بوڑھے نے جواب دیا "صبر کا مطلب، مصائب کو اس طرح خوشی کے ساتھ برداشت کر لو، جس مسرّت اور خوشی کا لوگ مصائب کے خاتمہ پر اظہار کرتے ہیں۔ ابوالحسن! کیا تم اس معمولی نکتے سے بھی آگاہ نہیں کہ آگ کے سات سمندر پار کرنے کے بعد معرفت حاصل ہوتی ہے اور جب یہ معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو اوّل و آخر کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔

ایک دوسرے صوفی ابو حمزہ کسی جگہ قرب، پر تقریر کر رہے تھے۔ آپ کھڑے سنتے رہے۔ پھر فرمایا" ابو حمزہ! کیا تم جانتے ہو کہ جس قرب میں ہم لوگ ہیں وہ حقیقت بُعد در بُعد ہے" پھر فرمایا "جب بندہ خدا کو پہچان لے اور اس میں وعظ گوئی کی صلاحیت بھی موجود ہو تو اس وقت وعظ کہنا مناسب ہے"

ابو حمزہ نے پوچھا" اگر خدا کو پہچانے بغیر وعظ گوئی کا سلسلہ شروع کر دیا جائے تو کیا ہو گا؟"

آپ نے جواب دیا" اس صورت میں وعظ گوئی کی وبار بندوں اور شہروں میں پھیل جاتی ہے" پھر مزید فرمایا" حقیقتِ وجد کا اظہار اس لیے ممنوع قرار دیا گیا ہے کہ وجد ایک ایسا شعلۂ جوالہ ہے جو سر کے اندر بھڑکتا ہے اور شوق کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے"

ابو حمزہ نے پوچھا" اس کی حصولیابی کا طریقہ؟"

آپ نے جواب دیا" اتباعِ سنت کے بغیر اسلام کا راستہ نہیں مل سکتا۔ صوفی کی تعریف یہ ہے کہ نہ تو یہ کسی کی قید میں ہو، اور نہ کوئی اس کی قید میں ہو" پھر فرمایا" ابو حمزہ! ارواحِ صوفیا غلاظت بشری سے آزاد، کدورتِ نفسانی سے صاف اور خواہشات سے مبّرا ہوتی ہیں۔ تصوف نہ تو رسم ہے نہ علم، کیونکہ اگر یہ رسم ہوتی تو مجاہدات سے اور علم ہوتا تو تعلیمات سے حاصل کر لیا جاتا۔ تصوف ایک اخلاقی شئے ہے جسے اللہ تعالیٰ کے اخلاق و عادات اختیار کرنے سے حاصل کیا جاتا ہے"

ان کے سامنے سے ایک نابینا گزرا۔ یہ اللہ اللہ کا ورد کر رہا تھا آپ نے اسے مخاطب کیا" اے شخص! تو یہ اللہ اللہ کیا کر رہا ہے؟ کیا تو اللہ سے

واقف ہے ، اگر اللہ کو جان لیتا تو زندہ نہ رہ سکتا۔"

یہ فرماتے ہی آپ غش کھا کر گر گئے اور کافی دیر بعد جب ہوش آیا تو ان پر اتنی وارفتگی طاری تھی کہ گھر چھوڑ کر جنگل چلے گئے۔ یہ بانسوں کا جنگل تھا۔ آپ اس جنگل میں گھس گئے۔ بانس کی پھانسیں آپ کے سارے جسم میں گھس گئیں۔ جگہ جگہ سے خون جاری ہو گیا۔ آپ کے مرید اور ارادت مند آپ کو تلاش کرتے ہوئے اس جنگل میں پہنچ گئے۔ انہوں نے آپ کو لہولہان دیکھا اور جہاں جہاں سے خون بہا تھا اس سے لفظ "اللہ" بنتا چلا گیا تھا۔ اس وقت آپ کی حالت اتنی غیر ہو چکی تھی کہ ارادت مند اور مریدوں نے سسکتے ہوئے کہا۔

"حضرت! لا الٰہ الا اللہ کہیئے۔"

آپ نے ہنستے ہوئے انہیں دیکھا اور فرمایا۔" میں اسی کے پاس جا رہا ہوں، تم لوگ میری فکر نہ کرو۔"

اس کے فوراً بعد آپ وصال فرما گئے۔

وصال کی خبر سُن کر حضرت جنید نے فرمایا" اپنے دور کے صدّیقین میں ابوالحسن سب سے بڑے تھے، ان کے بعد کسی اور نے اتنی حقیقی اور سچی بات نہیں کہی۔"

مظہر جانِ جاناں

ہمایوں جب ایران کی مدد لے کر ہندوستان واپس آیا تو ہندوستان میں چاروں طرف یہ غیر ہندوستانی پھیل گئے۔ انہی میں باباخان اور فجو خان نامی دو قزلباش بھی آئے تھے۔ انہیں سرکاری مناصب بھی مل گئے اور زندگی آرام سے گزرنے لگی۔ ان ہی دو بھائیوں میں سے ایک نے کسی موقع پر مغلیہ حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اکبر اعظم نے اس بغاوت کو کچل کر رکھ دیا۔ اور ان دونوں بھائیوں کے خلاف ایک ہنگامی حکمنامہ جاری کر دیا گیا جس کی رو سے ان دونوں کی اولادوں پر حکومت کے اعلیٰ مناصب کے دروازے بند کر دیے گئے۔ ایک عرصہ بعد اسی خاندان کے ایک بزرگ اورنگزیب کے ساتھ دکن کی مہموں میں شریک ہونے کے لیے تشریف لے گئے۔ ان بزرگ کا نام مرزا جان تھا۔ مرزا جان کی بیوی بھی ان کے ہمراہ تھیں۔

مرزا جان کو فوجی زندگی کچھ زیادہ پسند نہیں تھی۔ ہتھیاروں کو لے کر دشمن پر چڑھ جانا اور پھر اسے تباہ و برباد کر کے خوشی خوشی اپنے منصب پر بحال رہنا انہیں بہت ناگوار گزرتا تھا۔ ایک دن انہوں نے کسی جنگ

کے بعد اپنے مستقر سے ذرا دور دشمنوں کی عورتوں اور بچوں کو بین کرتے دیکھا۔ ان کے رونے میں بلا کا درد و سوز تھا۔ سپاہی ان رونے والوں کا مذاق اڑا رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے اعزا۔ اور دوسرے رشتہ دار ہمیشہ کے لیے جنگ کی تاریکیوں میں گم ہو چکے تھے اور ان کا مال و اسباب فاتحین نے لوٹ کر انہیں مفلس کر دیا تھا۔ مرزا جان سے یہ منظر دیکھا نہیں گیا۔ انہوں نے اپنے منصب سے استعفا دے دیا۔ اور اکبر آباد روانہ ہو گئے۔ اور نگزیب کو مرزا جان کے اس فیصلے اور اقدام پر افسوس ہوا لیکن انہیں فیصلہ بدلنے پر مجبور نہیں کیا۔

مرزا جان طویل فاصلہ طے کر کے مالوے میں کالا باغ نامی جگہ پر کچھ دنوں کے لیے مقیم ہو گئے۔ اندر بیوی کی حالت غیر ہو رہی تھی، یہ رمضان کے دن تھے۔ مرزا جان نے مشورتاً بیوی سے کہا "میں تمہیں روزے رکھنے سے منع تو نہیں کر سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ بچے کی پیدائش تک اگر تم متواتر روزے نہ رکھو تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔"

بیوی نے جواب دیا "روزے رکھنے میں مجھے کسی پریشانی سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔ اس لیے ترکِ صوم سے فائدہ؟"

مرزا جان نے خوش ہو کر کہا "یہ تو بہت اچھی بات ہے، خدا کرے یہ آنے والا بھی تمہاری ہی طرح متقی اور پرہیز گار ہو۔"

بیوی نے شرما کر سر جھکا لیا۔

۱۱ رمضان ۱۱۱۰ھ (۱۳ مارچ ۱۶۹۹ء) بروز جمعہ یہ بچہ پیدا ہو گیا۔

ان دنوں اورنگزیب بھی دکن سے واپس آتے ہوئے مالوے میں داخل ہو چکا تھا۔ اورنگزیب کی خدمت میں مرزا جان نے حاضری دی۔ بادشاہ

نے خوشی کا اظہار کیا۔ اور پوچھا۔" مرزا جان! خیریت تو ہے۔ تم ابھی تک اکبر آباد نہیں پہنچے؟"

مرزا جان نے جواب دیا۔" جناب والا! گھر میں ولادت ہونے والی تھی اس لیے یہاں رک جانا پڑا۔"

بادشاہ نے کہا۔" پھر کیا ہوا؟ ولادت ہوئی؟"

مرزا جان نے جواب دیا۔" ہاں ہوئی، بچہ پیدا ہوا۔"

بادشاہ نے خوشی کا اظہار کیا۔" بچہ یعنی لڑکا۔ بہت خوب۔ اس کا کوئی نام رکھا ہے؟"

مرزا جان نے کہا۔" جناب والا! ابھی اس کا نام نہیں رکھا گیا۔"

بادشاہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔" بیٹا باپ کی جان ہوتا ہے۔ تمہارا نام مرزا جان ہے، اس لیے ہم اس کا نام جانِ جاں تجویز کرتے ہیں۔"

مرزا جان نے بیٹے کا نام شمس الدین حبیب اللہ رکھا، لیکن عوام نے بعد میں اس بچے کو جانِ جاناں کے نام سے پہچانا۔ اس بچے نے بڑے ہو کر تصوف بھی اختیار کیا اور شاعری بھی کی اور اپنا تخلص مظہر رکھا۔ تصوف اور شاعری کی تاریخ میں انہوں نے مرزا مظہر جان جاناں کی حیثیت سے شہرت پائی۔

اکبر آباد پہنچ کر باپ نے ان کی پرورش پر خاصی توجہ دی۔ جب یہ ذرا سمجھدار ہوئے تو باپ نے انہیں آدابِ شاہی، فنونِ سپاہ گری اور دوسرے مروّجہ علوم سکھائے۔ ان دنوں تجوید و قرأت میں قاری عبدالرسول کو بڑا شہرہ حاصل تھا۔ یہ شیخ القرا۔ شیخ عبدالخالق شوقی کے شاگرد تھے۔ مرزا جانِ جاناں نے تجوید و قرأت کا علم قاری عبدالرسول سے

حاصل کیا۔ علم حدیث و تفسیر کی تحصیل حاجی محمد افضل سیالکوٹی سے کی۔ فن سپاہ گری باپ سے حاصل کیا۔

مرزا جان نے بیٹے کو حکم دیا "جانِ جاناں! میں اپنے پیر و مرشد شاہ عبدالرحمٰن قادری کی خدمت میں جا رہا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

بیٹے کو کیا عذر ہو سکتا تھا۔ جواب دیا "میں حاضر ہوں۔"

دونوں باپ بیٹے شاہ عبدالرحمٰن قادری کی خدمت میں پہنچ گئے پیر و مرشد نے ان دونوں کو نہایت شفقت و محبت سے اپنے پاس بٹھایا مرزا جان نے اپنے مرشد سے بیٹے کا تعارف کرایا "حضرت! یہ میرا بیٹا جان جاں ہے۔"

پیر و مرشد نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "جانِ جاں؟ یہ کیا نام ہوا؟ بھئی یہ کیسا مہمل نام رکھ دیا ہے!"

مرزا جان نے جواب دیا "حضرت! میں نے تو اس کا نام شمس الدین حبیب اللہ رکھا ہے۔"

"ہاں یہ نام ہوا۔ حالانکہ یہ بھی دو ناموں کا مرکب ہے۔ لیکن گوارا ہے مگر یہ جانِ جاں؟" پیر و مرشد زور زور سے ہنسنے لگے "عجیب سا نام ہے۔"

باپ نے عرض کیا "جب یہ بچہ پیدا ہوا تھا تو حضرت اورنگزیب خلد مکانی وہیں موجود تھے۔ اس کی ولادت کی خبر سن کر ارشاد فرمایا کہ مرزا جان! بیٹا اپنے باپ کی جان ہوتا ہے اور تمہارا نام ہے مرزا جان، اس لیے ہم نے اس کا نام جانِ جاں رکھ دیا ہے۔"

پیر و مُرشد اورنگزیب کا نام سُن کر چونکے اور ارشاد فرمایا "تو یہ کہو کہ یہ پاکیزہ نام حضرت اورنگزیب خلد مکانی کا تجویز کیا ہوا ہے۔ وہی تو ہم کہیں کہ اتنا بامعنی اور خوبصورت نام کوئی عام آدمی کس طرح رکھ سکتا ہے نام رکھنے کا واقعہ اور اس کی وجہ تسمیہ، دونوں نے حضرت خلد مکانی کی یاد تازہ کر دی۔ بخدا کیا خوبصورت اور بامعنی نام تجویز فرمایا تھا انہوں نے"

بیٹے پر اس قلابازی کا بہت بُرا اثر پڑا۔ اس کے دل سے باپ کے پیر و مرشد کی عزت و توقیر جاتی رہی۔

پیر و مرشد کے آس پاس مریدوں کا ہجوم تھا اور یہ مرید جس طرح جُھک جُھک کر ہاتھوں کو بوسہ دے دے کر ان کی عزت و تکریم کر رہے تھے۔ مرزا جانِ جاں کے لیے ناپسندیدہ تھا۔

رات کو محفل سماع جمی۔ پوری رات اسی میں گزر گئی۔ دوسرے دن بھی قوالیاں ہوتی رہیں۔ مرزا جانِ جاں نے دیکھا کہ سماع نے پیر و مُرشد کو بے خود اور بے حال کر دیا ہے۔ عصر کے وقت تک سکر و سماع نے ان پر اتنا غلبہ کر لیا کہ وہ نماز تک نہیں پڑھ سکے۔ پھر مغرب کا وقت آگیا اور یہ سکر و سماع ہی میں ڈوبے رہے۔ مرزا جانِ جاں نے دل میں سوچا کہ یہ کیسے پیر و مرشد ہیں جو قوالیوں میں فرض و سنت کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ان کے دل میں سے پیر و مُرشد کی رہی سہی وقعت بھی جاتی رہی۔

سکر و سماع سے فراغت حاصل کرنے کے بعد پیر و مرشد نے مرزا جان سے پوچھا "ہاں تو تم نے اب تک ہمیں یہ نہیں بتایا کہ ان صاحبزادے الملقب بہ مرزا جان جاں کو ہمارے پاس لانے کی غرض و غایت کیا ہے؟"

باپ نے جواب دیا "اس کے حق میں حضور کی دُعا درکار ہے"

بیٹے نے باپ کو پریشان نظری سے دیکھا۔ گویا باپ سے عرض کیا جا رہا ہو۔ "پدر محترم! یہ ناچیز ان سے بیعت کرنے کو ہرگز آمادہ نہیں ہے جو شخص سکر و سماع میں فرض و سنت تک کو بھلا دے وہ میرے نزدیک اس لائق نہیں ہے کہ اس کے ہاتھ پر بیعت کی جائے۔ اگر مجھے اس کی بیعت پر مجبور کیا گیا تو میں شدت سے انکار کر دوں گا۔"

پیر و مرشد نے مرزا جان سے پوچھا "اس کے حق میں صرف دُعا یا کچھ اور بھی ہے؟"

باپ نے ایک بار پھر بیٹے کی طرف دیکھا اور عرض کیا "حضرت! صرف دعا اور کچھ نہیں۔"

پیر و مُرشد نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ ہونٹ ہلانے لگے۔ گویا دعائیں دے رہے ہیں۔

* * * * * * * * *

مرزا جانِ جاں جب اپنے والد کے پیر و مرشد کے پاس سے گھر واپس آئے تو باپ نے ان سے پوچھا "بیٹے! کیا بات تھی؟ کیا تم ہمارے پیر و مُرشد سے مطمئن نہیں ہوئے؟"

بیٹے نے صاف صاف جواب دیا "پدر بزرگوار! صاف گوئی اور گستاخی معاف، جو شخص سکر و سماع میں مبتلا رہ کر فرض و سنّت تک کو بھلا بیٹھے اس سے کوئی کس طرح مطمئن ہو سکتا ہے؟"

باپ نے صفائی پیش کی "بیٹے! وہ اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں ہو سکتا ہے کہ وہ سکر و سماع میں بھی نماز ادا کر لیتے ہوں اور ہماری ناقص اور گناہ گار آنکھیں انہیں نہ دیکھ پاتی ہوں۔"

بیٹے نے جواب دیا "ایک مرید تو وہی کرے گا جو اس کا پیر کرے گا۔ اگر مرید کی گناہ گار آنکھیں واقعی پیرو مُرشد کو نماز پڑھتے نہیں دیکھ سکتیں تو گویا مُرید بھی اپنے پیرو مُرشد کے اتباع میں سکر و سماع میں مبتلا ہو کر تارکِ صلوٰۃ بن جائے گا۔ اب آپ ہی ارشاد فرمائیں کہ مرید کا یہ قدم اللہ کی نظر میں مرید کو گناہگار ٹھہرائے گا یا پیرو مُرشد کو۔"

مرزا جان بیٹے کی منطق سے لاجواب ہو گئے۔ پریشان ہو کر بولے "بہر حال بیٹے! پیر پیر ہی ہے۔ اس کے بارے میں اس قسم کے تردوات فضول اور بے معنی ہیں بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ وسوسۂ شیطانی ہے اور تمہیں اس سے بچنا چاہیئے۔"

بیٹے نے جواب دیا "پدر محترم! یہ وسوسۂ شیطانی نہیں، ضیائے رحمانی ہے۔ پیرو مرشد کو اپنے مرید کے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہونا چاہیئے۔ کیونکہ مغلق اور مشکوک کتاب، آخرت میں پیر اور مرید دونوں ہی کے حق میں بربادی اور تباہی کا سبب بن جائے گی۔"

باپ نے پوچھا "اگر میں تمہیں یہ حکم دیتا کہ تم پیرو مُرشد کے ہاتھوں پر بیعت کر لو تو تم کیا کرتے؟"

بیٹے نے جواب دیا "میں انکار کر دیتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرا یہ فعل خدا اور اس کے رسول کی خوشنودی میں ہوتا۔"

باپ نے حیرت سے، سر سے پاؤں تک بیٹے کی طرف دیکھا، اور آہستہ سے کہا "جانِ جاں! میں نے تمہارے ارادے کو قرائن سے سمجھ لیا تھا اسی لیے خاموشی اختیار کر لی تھی، ورنہ میں تمہیں وہاں لے کر اسی مقصد سے گیا تھا۔"

بیٹے نے جواب دیا۔ "مجھے خوشی ہے کہ آپ کی خاموشی نے مجھے آپ کی نافرمانی اور حکم عدولی سے بچا لیا۔"

باپ نے فرطِ محبت میں بیٹے کو اپنے سینے سے لگا لیا اور شفقت سے دیر تک سہلاتے اور تھپتھپاتے رہے۔

یہ ابھی سولہ سال کے تھے کہ باپ کا انتقال ہو گیا اس غم نے انہیں بہت پریشان کیا۔ ان کے دوست احباب دل جوئی کرتے رہتے لیکن انہیں قرار نہ ملتا۔ آخر چند دوستوں نے انہیں مشورہ دیا۔ "مرزا صاحب! اگر آپ ہمارا مشورہ قبول کریں تو مغل فرماں روا فرخ سیر کے دربار میں تشریف لے جائیں امید ہے کہ وہاں آپ کی خاطر خواہ پذیرائی ہو گی اور دربار کی مصروفیات میں آپ کا غم بھی غلط ہو جائے گا۔ اور یوں بھی آپ کا خاندان مغلیہ دربار میں خاصی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔"

مرزا جانِ جاں کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ یہ دوسرے دن فرخ سیر کے پاس پہنچ گئے۔ لیکن بادشاہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ بادشاہ نے ناسازیٔ طبع کا عذر کیا۔ یہ اپنے گھر چلے آئے۔

مرزا جانِ جاں بڑے نازک مزاج تھے۔ انہیں بادشاہ کے پاس جانے اور ملاقات نہ ہو سکنے کا بڑا دکھ ہوا۔ ان کا ضمیر انہیں ملامت کرنے لگا کہ آخر وہ گئے ہی کیوں ؟ انہوں نے واپسی کے بعد رات کو سونے سے پہلے تک کا سارا وقت فکر اور افسوس میں گزار دیا۔ رات کو نیند بھی بڑی مشکل سے آئی، صبح سے ذرا پہلے انہوں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اپنے مزار سے اس طرح نمودار ہوئے کہ ان کی کلاہ ان کے دونوں ہاتھوں میں ہے اور اسے لے کر وہ مرزا جانِ جاں کی طرف بڑھ رہے ہیں انہوں

نے مرزا کو حکم دیا "اپنا سر میری طرف لاؤ۔"
مرزا نے پوچھا "حضرت! یہ کیا ہے؟"
خواجہ بختیار کاکیؒ نے جواب دیا "ہم تمہیں اپنی کلاہ پہنانا چاہتے ہیں۔"
مرزا پر خواب ہی میں کپکپی طاری تھی۔ تذبذب میں بولے "کیا آپ مجھے اس لائق سمجھتے ہیں؟"
خواجہ کاکی نے کہا "اس لائق سمجھ ہی کے تو ہم اپنی کلاہ تمہارے سر پر رکھ رہے ہیں۔"
مرزا نے چپ چاپ اپنا سر اُن کے آگے جھکا دیا اور خواجہ کاکی نے اپنی کلاہ ان کے سر پر رکھ دی۔
اس خواب کے بعد صبح ان کی طبیعت میں اتنی تبدیلی آ چکی تھی کہ جب دوستوں نے ان سے کہا کہ "بادشاہ کے پاس چلنے کی تیاری کرو۔"
تو انہوں نے انکار کر دیا۔ بولے "اب وہاں جانے کی ضرورت نہیں رہی۔"
کسی دوست نے پوچھا "وہ کیوں؟ کیا بادشاہ نے آپ کو آپ کا موروثی منصب عطا فرما دیا؟"
مرزا نے جواب دیا "نہیں۔ بلکہ خواجہ بختیار کاکی نے مجھے اس سے بھی بڑا منصب عطا فرما دیا، جس کے ہوتے ہوئے اب کسی اور منصب کی ضرورت باقی نہیں رہی۔"
دوستوں کی سمجھ میں مرزا کی بات نہیں آئی۔ پوچھا "ہماری سمجھ میں آپ کی بات نہیں آئی۔ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

مرزا نے پورا واقعہ سنا کے جواب دیا "خواجہ بختیار کاکی نے خواب میں میری رہنمائی فرمادی ہے اور اپنی کلاہ میرے سر پہ رکھ کر صاف صاف بتا دیا ہے کہ میری شاہراہِ حیات سرکارِ دربار سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ فقر و درویشی میری منشارِ حیات اور مشیتِ ایزدی ہے۔"

دوستوں نے خاموشی اختیار کی۔

مرزا جانِ جاں ہمہ تن عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے انھیں ہر وقت ایک ایسے شخص کی ضرورت محسوس ہوتی جو اس راہ میں ان کی رہبری کر سکتا۔ وہ اٹھارہ سال کی عمر تک اسی جستجو میں رہے۔ اس دوران ان کے کانوں میں ایک ہی شخص کی عظمت اور بزرگی کا چرچا گونجتا رہا۔ یہ ذات تھی حضرت نور محمد بدایونی کی۔ آخر کار اس ذات نے مرزا جانِ جاں کو اتنا متاثر کیا کہ وہ ان سے ملنے اور بیعت ہو جانے —— کا مصمم ارادہ کر بیٹھے۔

بدایوں جانے سے پہلے انہوں نے اپنے دوستوں سے کہا "اللہ نے چاہا تو میں بہت جلد واپس آتا ہوں۔"

یہ بدایوں پہنچے اور نور محمد بدایونی کے حجرے کے باہر، بلائے جانے کے انتظار میں جا بیٹھے۔ نور محمد بدایونی کا قاعدہ تھا کہ ان سے جو بھی ملنا چاہتا پہلے یہ اس کا نام معلوم کرتے اور بعد میں اس سے ملنے یا نہ ملنے کا استخارہ دیکھتے۔ استخارہ واجب آتا تو مل لیتے اور واجب نہ آتا تو ملاقات سے انکار کر دیتے۔

ان کا خادم بار بار باہر آتا اور زیارت اور ملاقات کے مشتاق حضرات

کے نام معلوم کر کے اندر چلا جاتا۔ پھر کسی کو تو اندر ساتھ لے جاتا اور کسی سے صاف صاف کہہ دیتا "پھر تشریف لائیں، حضرت پیر و مرشد اس وقت نہیں ملیں گے۔"

مرزا جانِ جاں یہاں کی روش دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے کہ دیکھئے ملاقات ہوتی بھی ہے یا نہیں۔ یہ اسی سوچ میں تھے کہ اچانک خادم نے ان سے سوال کیا "تمہارا نام؟"

انہوں نے اٹک اٹک کر تامل سے جواب دیا "مرزا جان جاں۔"

خادم اندر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس بار حضرت نور محمد نے استخارہ نہیں دیکھا۔ نام سنتے ہی حکم دیا "بُلا لاؤ۔"

خادم باہر گیا اور عرض کیا "جانِ جاں کو حضرت اندر بلاتے ہیں۔"

یہ دھڑکتے دل سے اندر پہنچے اور ادب سے سلام و مصافحہ کر کے روبرو سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد عرض کیا "حضرت! اس وقت تو یہ ناچیز زیارت کی غرض سے حاضر ہوا تھا سو ہو گئی، اب اجازتِ رخصت دیجئے پھر حاضر ہو جاؤں گا۔"

نور محمد بدایونی نے انہیں محبت سے دیکھا اور حکم دیا "اپنی آنکھیں بند کر لو۔"

انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

پھر حکم ملا "اپنے دل کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔"

یہ تعمیل حکم میں یکسو ہو بیٹھے اور اچانک انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے جسم میں سارے مواضع ذاکر بن گئے ہیں اور ان پر فیوض و انوار و برکات کا نزول ہو رہا ہے۔ انہوں نے دریافت کیا "حضرت یہ کیا ہے؟"

پیر و مرشد نے جواب دیا۔ "ہم نے تیرے لطائف ستّہ کو ذاکر بنا دیا ہے۔ لطیفۂ قلبی جو سینے پہ دو انگل نیچے بائیں جانب ہے۔ لطیفۂ روحی یہ دو انگل نیچے دائیں طرف کے سینے پر ہے۔ لطیفہ نفس یہ زیر ناف ہے۔ لطیفہ سرّی یہ مابین سینہ ہے۔ لطیفہ خفی یہ بالائے ابرو ہے۔ میں نے ان سارے مواضع کو ذاکر بنا دیا ہے۔"

یہ بدایوں میں مزید ٹھہر گئے۔ نور محمد کی شخصیت نے انہیں بہت متاثر کر لیا تھا۔

دوسرے دن پھر پیر و مرشد کی خدمت میں جانے کی تیاری کرنے لگے انہوں نے جانے سے پہلے تیاریاں کیں اور آئینے کو سامنے رکھ کر اپنا حلیہ دیکھنا چاہا۔ انہیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ آئینے میں ان کے اپنے عکس کے بجائے حضرت نور محمد کی شبیہہ دکھائی دی۔ اس واقعے نے انہیں نور محمد سے اتنا زیادہ متاثر کر دیا کہ یہ بدایوں سے آ جانے کے بعد بھی جلدی جلدی واپس جانے کی کوششیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ پورے چار سال گزر گئے آخر انہوں نے مراتب علیا تک رسائی حاصل کر لی۔

ایک دن نور محمد بدایونی نے مرزا جانِ جاں سے کہا۔ "برخوردار! جو کچھ تمہیں ملنا تھا مِل چکا۔ اب تم اپنے گھر جا سکتے ہو، میری دُعائیں تمہارے ساتھ رہیں گی۔"

یہ واپسی کے لیے تیار ہو گئے۔ انہوں نے اپنے پیر و مرشد سے خرقہ حاصل کیا اور انہیں ہدایت ملی۔ "جان جاں! تمہارے لیے سنّت کافی ہے زندگی بھر سنت کا خیال رکھنا کیونکہ زندگی میں اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو

سکتی ہے کہ ایک انسان اپنے رب کے احکام بجالائے، بدعتوں سے گریز کرے۔"

انہوں نے سر جھکا کر وعدہ کرلیا۔

✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣

کچھ عرصے بعد نور محمد بدایونی کا وصال ہوگیا۔ مرزا جانِ جاں کو اس کا بہت دکھ ہوا اور یہ چھ سال تک متواتر آپ کے مزار پر حاضری دیتے رہے۔ حضرت نور محمد کا فیضان اب بھی جاری تھا۔ یہ عالم رویا میں جان جاں کو ہدایات دیتے "جان جاں، یاد رکھو، کمالاتِ الٰہی کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ میری قبر پہ بار بار حاضری دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کسی زندہ شخص کو تلاش کرو اس سے تم کوئی مقام حاصل کرسکو گے۔"

مرزا جان جاں اس عہد کے مشہور صوفی شاہ گلشن کی خدمت میں پہنچے اور حاضری کی غرض و غایت بتائی۔

شاہ گلشن نے انہیں غور سے دیکھا اور فرمایا "جانِ جاں! تم غلط جگہ پر آگئے ہو۔ تم کو تو مسیح زمانہ بننا ہے، میرا کیا ہے، میں تو آداب و طریقے کا چنداں پابند نہیں۔ کبھی سماع سنتا رہتا ہوں کبھی نماز بے جماعت پڑھ لیتا ہوں۔ تم کو کسی اور شخص کے پاس جانا چاہیئے۔"

مرزا جان جاں یہاں سے اٹھ کر حضرت خواجہ محمد زبیر قیوم رابع کی خدمت میں جا پہنچے۔ انہوں نے کہا "جانِ جاں! خوش آمدید۔ تم میرے ہو اور تمہاری آمد سے میں بہت خوش ہوں۔ لیکن تم ایک میری نصیحت بھی سنو تمہیں ایک ایسے بزرگ کی صحبت اختیار کرنی چاہیئے جو آداب ظاہر اور انوارِ باطن سے آراستہ ہو۔ جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ تم میرے ہو، لیکن

ہمارے طریقے میں ایک دشواری ضرور ہے۔"

مرزا جانِ جاں نے دریافت کیا۔" وہ کیا ؟"

انہوں نے جواب دیا۔" ہمارے طریقے میں صحبت شرط ہے اور تمہارا مکان یہاں سے بہت دور ہے تم روزانہ حاضری نہیں دے سکتے۔"

مرزا جانِ جاں نے مایوسی سے پوچھا۔" پھر مجھے کیا کرنا چاہیئے ؟"

انہوں نے جواب دیا۔" تمہیں نور محمد بدایونی سے جو کچھ ملا ہے اس کی حفاظت کرو۔ اور یہی کافی ہے۔"

یہ یہاں سے بھی دل برداشتہ ہو کر اٹھے اور حضرت حاجی محمد افضل کی خدمت میں جا پہنچے اور ان کے سامنے اظہار مدعا کیا۔ انہوں نے جواب دیا۔" جانِ جاں! تم نے سلوک بر سبیل بصیرت کیا ہے اور تمہیں کشفِ مقامات بھی ہے لیکن افسوس کہ ہمیں ذرا بھی کشف و علم مقامات نہیں ہے، اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ تم میرے بجائے کسی اور بزرگ کو تلاش کر لو۔"

مرزا جانِ جاں یہاں سے اٹھ کر حضرت خواجہ سعد اللہ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ یہ ہمت ہارنے والے نہیں تھے۔

حافظ سعد اللہ نے استخارہ دیکھا کہ جانِ جاں کی تربیت کی جائے یا نہیں۔ استخارہ واجب آیا۔ ان کی صحبت میں جانِ جاں بارہ سال تک رہے اور بہت سے فیوض و برکات حاصل کیے۔ یہاں سے تکمیل کے بعد جانِ جاں شیخ الشیوخ محمد عابد سنامی کی خدمت میں پہنچے اور یہاں سات سال تک تعلیم و تربیت حاصل کرتے رہے۔

ایک دن مرزا جانِ جاں نے شیخ سنامی سے عرض کیا۔" حضرت!

میں خاندانِ قادریہ میں شامل ہونا چاہتا ہوں اس سلسلے میں آپ کی اجازت درکار ہے۔"

شیخ سنامی نے جواب دیا "میری اجازت کیا معنی، میں تمہیں رسول اللہؐ سے اجازت دلائے دیتا ہوں۔"

اس کے بعد شیخ سنامی نے حکم دیا۔ "میں حضور سرورِ کونینؐ کی طرف متوجہ اور مراقب ہو کر بیٹھا جاتا ہوں، میری اتباع میں تم بھی ایسا ہی کرو۔"

چنانچہ دونوں مراقبے میں بیٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد مرزا جانِ جاں نے دیکھا۔ رسول مقبولؐ کی بارگاہِ عالی میں آپ کے صحابہ کرام و اولیائے عظام جلوہ افروز ہیں۔ یہیں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی بھی موجود ہیں۔ یہ حضورؐ کے روبرو مؤدب کھڑے ہوئے تھے۔

شیخ سنامی نے رسولؐ اللہ سے عرض کیا "یا رسولؐ اللہ مرزا جان جاں خاندانِ قادریہ میں شمولیت کے خواہشمند ہیں اور اس باب میں اجازت کے امیدوار ہیں۔"

رسول مقبولؐ نے ارشاد فرمایا "اس معاملے میں سید عبدالقادر سے اجازت طلب کرو۔"

شیخ سنامی نے حضرت غوث پاک کو مخاطب کیا "حضرت! مرزا جانِ جاں کیا چاہتے ہیں؟ آپ نے بھی سن لیا۔ اس بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟"

حضرت غوث پاک نے متبسم ہو کر جواب دیا "میری طرف سے اجازت ہے۔"

اس کے بعد آپ نے مرزا جان جاں کو اپنا خرقہ بھی عطا فرما دیا۔

مرزا جانِ جاں گیارہ سال تک شیخ سنامی کی خدمت میں موجود رہے ۱۸ رمضان ۱۱۶۰ ھ میں شیخ سنامی کا انتقال ہو گیا تو ان کی جگہ مرزا جانِ جاں مسندِ خلافت پر جلوہ افروز ہوئے۔ چاروں طرف سے طالبانِ حق کی آمد شروع ہو گئی۔ مرزا جانِ جاں کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی کہ طریقۂ محمدیہ مروج ہو جائے۔

* * * * * * *

مرزا جانِ جاں کی نازک مزاجی مشہور ہے، اپنا کام خود کرتے تھے کسی اور کا کام انہیں پسند نہ آتا تھا۔ استغنا کا یہ عالم تھا کہ بادشاہ اور امرائے وقت ہمیشہ خواہشمند رہتے کہ وہ کچھ قبول کر لیں لیکن مرزا جانِ جاں ہمیشہ انکار کر دیتے۔ غربا تو ان سے ہر روز ہی ملاقات کر سکتے تھے لیکن امرا اور رؤسا کے لیے بس ایک دن مقرر تھا۔ انہیں خانقاہ میں حاضر ہونے سے منع کر دیا گیا تھا۔ ہر جمعرات کو مرزا جانِ جاں بپابندی جامع مسجد پہنچ جایا کرتے تھے۔ یہیں شہر کے امرا اور رؤسا ان سے ملاقات کر سکتے تھے۔

حسبِ معمول وہ جیسے ہی مسجد میں داخل ہوئے انہیں شہر کے امیروں اور رئیسوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ایک امیر نے آپ کی خدمت میں روپوں کی تھیلی پیش کی۔ مرزا جانِ جاں نے پوچھا "اس میں کیا ہے؟"

امیر نے جواب دیا "نذرانہ۔ اس ناچیز کی طرف سے حقیر سا نذرانہ۔"

مرزا جانِ جاں نے پوچھا "کام کیا کرتے ہو؟"

امیر نے جواب دیا "مجھے بادشاہ کی طرف سے ایک منصب امارت حاصل ہے۔"

مرزا جانِ جاں نے سوال کیا "شہر میں تمہاری کتنی جائداد ہے؟"

امیر نے جواب دیا "یہ جائداد اتنی ہے کہ میں خود اس کی تعداد سے واقف نہیں۔"

"کیا تمہارے خاندان میں غرباء بھی موجود ہیں؟"

جواب دیا "کون سا خاندان ہے جو اس بات کا دعویٰ کرے کہ اس میں ایک بھی غریب نہیں۔"

"پھر کیا تم اپنے خاندانی غرباء کی مدد بھی کرتے رہتے ہو؟"

"جی ہاں، میں مستحقوں کا بڑا خیال رکھتا ہوں۔"

دوسرے امیر اور رئیس یہ گفتگو بڑی توجہ سے سن رہے تھے اور ان کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ مرزا جانِ جاں کا ان باتوں سے مقصد کیا ہے۔

مرزا نے کہا "تمہارے اپنے ٹھاٹ باٹ بھی خوب ہوں گے؟"

امیر نے انکساری سے جواب دیا "اللہ کا کرم شاملِ حال ہے۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں۔"

مرزا نے ترچھی نظروں سے امیر کو گھورا اور آخری سوال کیا "تم یہ تھیلی ایک بار مجھے دے سکتے ہو۔ میرا ہاتھ کھلا ہوا ہے۔ میرے آس پاس ہر وقت اہلِ احتیاج اور غرض مند موجود رہتے ہیں، میں اسے لے جا کر فوراً ان میں تقسیم کر دوں گا پھر اگلے ہفتے کیا ہو گا؟"

امیر کا چہرہ خوشی سے تمتما گیا۔ جواب دیا "آپ حکم دیجئے۔ آپ کو ہر ہفتے اتنی ہی رقم مل جایا کرے گی۔"

مرزا جانِ جاں نے اچانک نفرت سے منہ پھیر لیا۔ بولے "کیا تمہیں تمہارے منصبِ امارت سے اتنی جائز رقم مل جاتی ہے کہ تم اسے یوں

اللّے تللّے سے خرچ کر کے امیرانہ ٹھاٹ باٹ سے رہ سکو۔ پھر خود ہی جواب دیا۔ "ہرگز نہیں، تم یقیناً ناجائز طریقے سے مال و دولت پیدا کرتے ہو۔ تم تو گنا ہگار ہو ہی، اپنے اس گناہ میں مجھے کیوں شریک کرتے ہو؟"

امیر کا منہ لٹک گیا۔ اس کا تھیلی والا ہاتھ اب بھی مرزا جانِ جاں کی طرف بڑھا ہوا تھا۔ مرزا جانِ جاں دوسرے امیر سے مخاطب ہو گئے۔ اب کسی امیر میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ان کی خدمت میں نذرانہ پیش کر سکتا۔

آخر میں ایک امیر نے گذارش کی "اس ناچیز کو معلوم ہے کہ آپ لوگوں کا دل نہیں توڑتے امید ہے کہ میری گزارش بھی قبول فرمائی جائے گی۔"

مرزا نے پوچھا "تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

امیر نے جواب دیا "میں آپ کو اپنے غریب خانے تک چلنے کی زحمت دینا چاہتا ہوں۔"

مرزا کو کچھ تامل ہوا، امیر نے بے صبری سے کہا "حضرت! ایسی انکار کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

مرزا نے افسوس سے کہا "مجھے اس پہ مجبور نہ کرو، تم مجھے اپنے گھر لے جاؤ گے۔ وہاں کچھ کھانے پینے کو پیش کرو گے۔ میں انکار کر دوں گا۔ تمہارا دل دُکھے گا۔ مجھے دکھ ہوگا۔ اس لیے مجھے تو تم معذور ہی سمجھو۔"

امیر نے خاموشی اختیار کی۔ لیکن جب مرزا نے واپسی کے لیے قدم اٹھائے تو وہ امیر آپ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ بولا "میں اس وقت تک آپ کا راستہ روکے بیٹھا رہوں گا جب تک آپ میرے ساتھ چلنے کی

حامی نہ بھر لیں گے۔"

آپ نے کہا۔"میری راہ سے ہٹ جاؤ۔ مجھے تنگ نہ کرو۔"

امیر نے کہا۔"میں نہیں ہٹوں گا۔"

آخر مرزا نے عاجز آ گئے شرط پیش کی۔"میں تمہارے ساتھ اس شرط پر چلوں گا کہ تم مجھے کچھ کھلاؤ پلاؤ گے نہیں، اور نہ ہی نذرانے میں روپوں کی تھیلی پیش کرو گے۔"

امیر نے خوش ہو کے جواب دیا۔"مجھے منظور ہے۔"

باہر امیر کی گاڑی تیار کھڑی تھی، امیر نے انہیں گاڑی میں بٹھایا اور گاڑی بان کو گاڑی چلانے کا حکم دیا۔ گاڑی ایک طرف روانہ ہو گئی۔ راستے میں مرزا جانِ جاں نے سکوت اختیار کیے رکھا۔

گاڑی ایک بڑی حویلی کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ امیر نیچے اترا اور سہارا دے کر مرزا جانِ جاں کو نیچے اتارا۔ یہ دونوں حویلی میں داخل ہو گئے۔ زنان خانے سے پہلے مرزا جانِ جاں رُک گئے۔ امیر نے کہا۔"آپ رُک کیوں گئے تشریف لائیے۔"

مرزا نے پوچھا۔"اندر مستورات کو ہٹا دیا ہے؟"

امیر نے کہا۔"آپ کوئی فکر نہ کریں اندر تشریف لے چلیں۔"

مرزا امیر کے ساتھ اندر چلے گئے۔ وہاں کوئی بھی موجود نہ تھا لیکن بالکل نیا سامان نہایت سلیقے سے رکھا ہوا تھا۔ حویلی کے در و دیوار اور وہاں کی ہر شئے بالکل نئی تھی۔ مرزا جانِ جاں حیرت و استعجاب سے ہر چیز دیکھتے رہے۔ سوال کیا۔"کیا اس حویلی میں تم تنہا رہتے ہو؟"

"نہیں، میں اس حویلی میں نہیں رہتا۔"

"پھر یہاں کون رہتا ہے؟"

"کوئی بھی نہیں۔" امیر نے جواب دیا۔

"کیا یہ حویلی تمہاری نہیں ہے؟"

حویلی تو میری ہی ہے!" امیر نے جواب دیا۔" نہ صرف یہ میری حویلی ہے بلکہ بالکل نئی ہے۔"

مرزا جان جاں گو مگو امیر کی صورت دیکھتے رہ گئے۔

امیر نے اس حویلی کی دیر تک سیر کرائی۔ اس کے بعد وہ مرزا کو حویلی سے ملحقہ ایک دوسری عمارت میں لے گیا۔ بولا "اس حصے کی بھی سیر فرمالیں۔"

مرزا جانِ جاں نے جواب دیا۔ یہ تو کوئی خانقاہ معلوم ہوتی ہے۔"

امیر نے جواب دیا "ہاں یہ خانقاہ ہے۔"

مرزا نے پوچھا "کس کی؟"

امیر نے جواب دیا "آپ کی۔"

"میری!" مرزا نے حیرت اور شکایت کے انداز میں امیر کی طرف دیکھا "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

امیر نے کہا "میں جب آپ کو یہاں لا رہا تھا تو یہ وعدہ کر لیا تھا کہ میں آپ کو کچھ کھلاؤں پلاؤں گا نہیں اور یہ وعدہ بھی تھا کہ نذرانے میں روپے بھی نہیں پیش کروں گا، چنانچہ میں اپنے عہد کا پاس کر رہا ہوں اور اس وقت میں نہ تو کچھ کھانے پینے کو پیش کر رہا ہوں اور نہ نذرانے میں روپے دے رہا ہوں۔"

مرزا جانِ جاں نے کہا۔ بھئی بات کو طول نہ دو اور صاف صاف

بتاؤ، تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

امیر نے جواب دیا "حضرت! یہ خانقاہ میں نے آپ کے لیے بنوائی ہے اور یہ حویلی آپ کی اقامت کے لیے۔ اسے میری طرف سے قبول فرما کر شکر گزار فرمائیں۔"

مرزا نے کہا "نذرانے میں روپے پیش کر دیا حویلی، میرے لیے دونوں ہی ناقابل قبول ہیں۔"

امیر نے عاجزی سے کہا "میں نے آپ کی اور آپ کے پاس آنیوالے حاجتمندوں کی کفالت کے لیے آمدنی کے کچھ ذرائع بھی مہیا کر دیے ہیں۔"

مرزا جانِ جاں نے کہا "اچھا، تم ایک بات بتاؤ۔"

امیر نے عرض کیا "پوچھیے۔"

مرزا جانِ جاں نے کہا "میں اس وقت جس مکان میں رہ رہا ہوں اُسے تو تم نے دیکھا ہے!"

"خوب اچھی طرح۔"

مرزا نے کہا "تمہارا کیا خیال ہے، کیا میں اس مکان میں ہمیشہ رہ سکتا ہوں؟"

امیر نے جواب دیا "کوئی شخص بھی ہمیشہ کسی مکان میں نہیں رہ سکتا۔"

مرزا نے کہا "جب یہ بات ہے کہ مکان چھوڑ کر جانا ہی ہے تو پھر اپنا ہو یا پرایا۔ سب برابر ہے اور رہا کفالت کا مسئلہ تو ہر شخص کی روزی خدا کے ہاتھ میں ہے اور یہ کسی نہ کسی طرح اسے پہنچ جاتی ہے۔"

امیر اصرار کرتا رہا اور مرزا نفی میں سر ہلاتے رہے آخر امیر مایوس

ہوگیا۔ اور مرزا اپنے گھر واپس چلے آئے۔

محمد شاہ کا زمانہ تھا۔ مرزا جانِ جاں دنیا سے جتنا بھاگ رہے تھے یہ اتنا ہی ان کا پیچھا کر رہی تھی، بادشاہ نے جب یہ سُنا کہ مرزا کسی امیر کا نذرانہ نہیں قبول کرتے تو اس نے اپنے وزیر قمرالدین خان کو مرزا کی خدمت میں روانہ کیا۔ وزیر نے مرزا سے کہا "حضرت! اس خاکسار کو بادشاہ نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے اور فرمایا ہے کہ آپ سلطنت مغلیہ میں سے جو حصہ بھی چاہیں لے لیں۔ کیونکہ بادشاہ کو احساس ہے کہ اہلِ احتیاج کا آپ کی خانقاہ میں ہجوم رہتا ہے اور غرباء اور حاجتمند بے تکلف آپ ہی سے رجوع فرماتے ہیں۔"

مرزا جانِ جاں نے متبسّم ہو کر جواب دیا "قمرالدین! باری تعالیٰ کا ارشاد ہے...... (ترجمہ:۔ جب اللہ تعالیٰ نے ہفت اقلیم کی متاع کو قلیل فرمایا ہے اور تمہارے بادشاہ کے پاس اس قلیل متاع کا ساتواں حصّہ، اقلیم ہندوستان ہے، اب تم ہی بتاؤ کہ میں اس میں سے کیا قبول کروں؟"

وزیر لاجواب ہو کر واپس چلا گیا۔

کسی امیر نے آپ سے پوچھا "آپ امیروں کا مال کیوں نہیں قبول کرتے؟"

آپ نے جواب دیا "امیروں کا مال اکثر مشتبہ ہوتا ہے اور اس میں لوگوں کے حقوق شامل ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر میں اسے قبول کرلوں تو قیامت میں اس کا حساب کیونکر دوں گا؟"

اس امیر نے سوال کیا "آپ امیروں کا کھانا بھی نہیں کھاتے یہ کیوں ہے؟"

آپ نے جواب دیا "امراء کے کھانے کی ظلمت باطنی نسبت کو مکدر کر دیتی ہے اور اس لیے کہا گیا ہے کہ .... (ترجمہ سب سے بُرا کھانا امیروں کا کھانا ہے")

امیر نے کہا " اور غرباء کے کھانے کے سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

آپ نے کہا "میں اکثر غریبوں کی ضیافت بھی قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ یہ لوگ بے سروسامانی کی وجہ سے سود پر قرض لے کر دعوت کا اہتمام کرتے ہیں۔"

اس کے بعد آپ نے دعا کے لیے اپنے ہاتھ اٹھا دیے "خدایا! میرے دوستوں کو اتنا امیر نہ بنا کہ وہ اسراف میں مبتلا ہو جائیں، اور نہ انہیں اس قدر غریب کر دے کہ انہیں قرض لینے کی نوبت پیش آئے۔"

جب دُعا فرما چکے تو آپ نے دیکھا، ایک مزدور اپنے سر پر آموں کا ٹوکرا رکھے سامنے کھڑا ہے۔ آپ نے اس سے پوچھا "یہ کیا ہے اور کہاں سے لائے ہو؟"

مزدور نے امیر کی طرف دیکھا۔ امیر نے عرض کیا "حضور والا! یہ میرا خدمت گار ہے۔ اور یہ آموں کا ٹوکرا لے کر میری ہدایت پر یہاں آیا ہے۔ یہ میرے باغ کے آم ہیں، ان آموں کو قبول کرنے میں تو تامل نہیں ہونا چاہیئے۔"

مرزا نے بیزاری سے کہا " ان آموں کو لے جاؤ۔ میں نہیں کھاؤں گا۔"

امیر نے کہا۔ "آپ نہ کھائیں اپنے مریدوں میں تقسیم فرمادیں۔"

مرزا جانِ جاں نے جواب دیا۔ "جسے میں اپنے لیے ناپسند کرتا ہوں مریدوں کے لیے کیوں گوارا کر لوں گا؟"

امیر نے لجاجت سے عرض کیا۔ "اگر پورا ٹوکرا نہیں قبول فرماتے تو اس میں سے کچھ تو قبول فرمالیں۔"

مرزا نے امیر کی دلجوئی کی خاطر اس میں سے دو آم نکال لیے۔ فرمایا۔ "اگر تیری دل آزاری کا خیال نہ ہوتا تو میں یہ دو آم بھی نہ لیتا۔"

امیر نے مرزا کا شکریہ ادا کیا اور اپنے خدمت گار کے سر پہ آموں کا ٹوکرا رکھ کر واپس چلا گیا۔

ابھی اس امیر کو گئے ہوئے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ایک شخص روتا دھوتا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

آپ نے پوچھا۔ "تو کون ہے اور کیوں رو رہا ہے؟"

اس شخص نے آموں والے امیر کا نام لے کر پوچھا۔ "کیا وہ ابھی یہاں آیا تھا؟"

مرزا جانِ جاں نے جواب دیا۔ "ہاں وہ آیا تھا۔ کیوں؟"

اس نے کہا۔ "کیا وہ اپنے ساتھ آم بھی لایا تھا؟"

"ہاں وہ اپنے خدمت گار کے سر پر رکھوا کر آموں کا ایک ٹوکرا بھی لایا تھا۔"

اس نے پھر سوال کیا۔ "اس نے اس میں سے کچھ آم آپ کو بھی دیے ہیں؟"

"ہاں دیے تو ہیں۔"

وہ شخص واویلا کرنے لگا۔ بولا "اس امیر نے مجھ پر ظلم کیا ہے اس نے وہ آم زبردستی میرے باغ سے تڑوا لیے۔ وہ باغ میرا ہے۔ خدا کے لیے اس معاملے میں میری مدد کیجئے۔"

مرزا نے کہا "سبحان اللہ، بات سمجھ میں آ گئی۔ یہ ناعاقبت اندیش امراء منصوبہ بندیوں سے فقیر کا باطن خراب کرنا چاہتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے ابھی یہ آم چکھے بھی نہیں۔"

آپ نے وہ آم اس شخص کے حوالے کر دیے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

خدمت گار نے مطلع کیا "نواب نظام الملک باریابی کے امیدوار ہیں۔"

مرزا نے ناگواری سے جواب دیا "یہ امراء میرے پیچھے پڑ گئے ہیں، میں ان سے جتنا بچنا چاہتا ہوں یہ اُتنا ہی میرے تعاقب میں ہیں۔"

خدمت گار نے معصومیت سے پوچھا "پھر کیا جواب دوں؟"

جواب دیا "بُلا لو۔"

تھوڑی دیر بعد نظام الملک نے اندر داخل ہو کر مرزا کو سلام اور مصافحہ کیا۔ مرزا نے پوچھا "کیسے زحمت فرمائی؟"

نظام الملک نے جواب دیا "حضور کے سلام اور دست بوسی کو حاضر ہوا تھا۔"

آپ نے کہا "دونوں امور سے فارغ ہو لیے؟"

نظام الملک ششدر صورت دیکھتا رہ گیا۔ آپ نے کہا "صورت کیا دیکھ رہے ہو؟"

نظام الملک نے عرض کیا "میں آپ کی خدمت میں تیس ہزار روپے

لایا ہوں۔"

آپ نے خفا ہو کر سوال کیا "کیوں؟ ان روپوں کو میں کیا کروں گا؟"

نواب نے عرض کیا "اگر آپ کو یہ روپے لینے میں تامل ہو تو ان کو راہِ خدا میں تقسیم فرما دیں۔"

مرزا نے غصے میں جواب دیا "نواب! میں تمہارا خانساماں نہیں ہوں، تم خود یہاں سے تقسیم کرنا شروع کر دو، گھر تک ختم ہو جائے گا۔"

نظام الملک نے دل برداشتہ ہو کر واپسی کی راہ اختیار کی۔

مرزا کبھی کسی کی تعظیم کے لیے نہیں اٹھتے تھے۔ وزیر قمرالدین نے حاضری دی۔ یہ اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ نظام الملک کی تشریف آوری ہوئی، یہ اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ اپنی اس روش پر یہ بڑی سختی سے کاربند رہتے۔"

ان دنوں مرہٹوں کا بڑا دور تھا اور ان کے رُعب و اثر کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے امراء اور منصب دار تک ان سے خوفزدہ رہتے۔

ایک بار کسی نے آپ کو مطلع کیا "مرہٹہ سردار آپ کی زیارت کو آ رہا ہے۔"

آپ فوراً اٹھ کر اندر چلے گئے اور فرمایا "جب مرہٹہ سردار آ جائے تو مجھے اندر سے بلوا لینا۔"

کچھ ہی دیر بعد مرہٹہ سردار آ گیا، مریدوں نے سردار سے عرض کیا "آپ تشریف رکھیے۔ ہم حضرت کو اندر سے بلاتے ہیں۔"

مرہٹہ سردار بیٹھ گیا۔ اندر اطلاع کی گئی۔ آپ باہر نکلے تو مرہٹہ سردار آپ کی تعظیم بجا لایا۔

آپ کچھ دیر بیٹھ کر اس سے باتیں کرتے رہے۔ پھر جب یہ محسوس کیا کہ مرہٹہ سردار جانے والا ہے تو آپ اس کی روانگی سے پہلے ہی دوبارہ

اندر چلے گئے۔ سردار کے چلے جانے کے بعد دوبارہ باہر آ گئے۔ لوگوں نے پوچھا۔ آپ نے ایسا کیوں کیا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "مرہٹہ سردار ہندو تھا۔ اگر میں اس کی تعظیم نہ کرتا تو وہ ناراض ہوتا اور اگر تعظیم کرتا تو اس سے دین کا نقصان ہوتا۔ اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اس کی آمد اور روانگی کے وقت میں وہاں موجود نہ رہوں۔"

آپ کی نازک مزاجی ضرب المثل تھی۔ ایک بار آپ امروہہ تشریف لے گئے وہاں خانقاہ شاہ عبدالہادی میں قیام فرمایا۔ وہاں سونے کے لیے آپ کو جو چارپائی دی گئی تھی وہ نہایت باریک سُتلی کی بنی ہوئی تھی۔ آپ رات بھر کروٹیں بدلتے رہے۔ کسی نے پوچھا۔ "حضرت! کیا بات ہے؟ آپ سوتے کیوں نہیں ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اس چارپائی میں ہلکی سی کان موجود ہے جس سے مجھے نیند نہیں آ رہی۔"

اس شخص نے کہا۔ "یہ چارپائی خاص طور پر آپ کے لیے بنوائی گئی ہے۔"

آپ نے کہا۔ "کچھ بھی سہی لیکن میں نے جو کچھ کہا وہ اپنی جگہ۔"

صبح ہوتے ہی پہلا کام یہ کیا گیا کہ اس چارپائی کا چاروں طرف سے ناپ لیا گیا۔ اس میں ہلکی سی کان واقعی موجود تھی۔ ۱۹۳۲ء تک تو یہ چارپائی امروہے کی خانقاہ عبدالہادی میں موجود تھی اب معلوم نہیں کہ موجود بھی ہے یا نہیں۔ کتاب تذکرۃ الکرام میں اس واقعہ کا ذکر ہے جو ۱۹۳۲ء میں چھپی تھی۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ یہ چارپائی ابھی تک خانقاہ میں موجود ہے۔

مرزا جانِ جاں کے ایک ارادت مند محمد قاسم عظیم آباد گئے ہوئے تھے ان کے بھائی بہت پریشان تھے، کیونکہ ان کی عرصے سے کوئی خیریت نہیں معلوم ہو سکی تھی۔ محمد قاسم کے بھائی پریشان اور حواس باختہ مرزا جانِ جاں کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا "حضرت! میرے بھائی محمد قاسم کا کیا ہو گا؟ عرصے سے کوئی خیریت ہی نہ مل سکی۔ اور اب یہ افواہ سننے میں آئی ہے کہ وہ عظیم آباد میں گرفتار کر لیے گئے ہیں۔"

مرزا جانِ جاں نے دریافت کیا "محمد قاسم کی گرفتاری کی خبر تمہیں کس نے پہنچائی ہے؟"

بھائی نے جواب دیا "عظیم آباد سے کئی آدمی آئے ہیں وہی بتاتے ہیں کہ محمد قاسم گرفتار کر لیے گئے۔" آبدیدہ ہو کر کہا "آپ سے استدعا ہے کہ ان کی رہائی کی دعا فرمائیں۔"

مرزا جانِ جاں مراقبے میں چلے گئے اور کچھ دیر تک آنکھیں بند کیے بیٹھے رہے۔ آخر فرمایا "گرفتاری کی افواہ غلط ہے۔ محمد قاسم کا دلالوں کے ساتھ سخت جھگڑا ہو گیا تھا لیکن محمد قاسم خیریت سے ہے اور اس نے اس سلسلے میں تمہیں ایک تفصیلی خط بھی لکھا ہے جو کل یا پرسوں تک تمہیں مل جائے گا۔"

بھائی مطمئن ہو کر گھر چلا گیا۔ اسے تیسرے دن واقعی بھائی محمد قاسم کا تفصیلی خط مل گیا اور اس میں وہی کچھ تفصیل سے لکھا گیا تھا جس کا مرزا نے بالاختصار ذکر کیا تھا۔

مرزا کے ایک انتہائی قریبی عقیدت مند اور خلیفہ شیخ غلام حسن ان کی خدمت میں حاضر تھے آپ نے انہیں غور سے دیکھ کر زور کی سانس لی

اور اس طرح بار بار سانس لیتے رہے۔

شیخ غلام حسن نے عقیدت سے پوچھا "حضرت! کیا سونگھ رہے ہیں؟"

مرزا جانِ جاں نے جواب دیا "تیرے باطن سے کفر کی ظلمت ظاہر ہو رہی ہے اور تیرے جسم سے کفار کے کھانے کی بو محسوس ہو رہی ہے کیا یہ غلط ہے؟"

شیخ غلام حسن نے شرم سے سر جھکا لیا۔ بولے "ہاں آج میں نے ایک ہندو کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھا لیا تھا۔"

مرزا نے کہا "توبہ کرو اور آئندہ خیال رکھو۔"

شیخ غلام حسن نے اسی وقت توبہ کی۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

مرزا جانِ جاں کے مریدوں میں بہت بڑی تعداد روہیلوں کی تھی۔ یہ اپنے شہروں سے دہلی میں منتقل ہو رہے تھے۔ ان میں ابھی عیش و عشرت کی عادت نہیں پڑی تھی۔ ان کے دست و بازو کی طاقت مغل حکومت کے لیے خطرہ بنی ہوئی تھی اور یہ قوت مرزا جانِ جاں کی مطیع و فرمانبردار تھی کہتے ہیں نجف خان کو مرزا کے اثرات پسند نہیں تھے کیونکہ یہ بات بھی مشہور ہو رہی تھی کہ مرزا جانِ جاں ملکی سیاسیات میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔

اس وقت مرزا کی عمر اسی سال کی رہی ہوگی۔ آپ کے مریدوں نے سنا، مرزا فارسی کا ایک شعر نہایت ذوق و شوق سے پڑھ رہے ہیں ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کنند ایں عاشقانِ پاک طینت را

لوگوں کے کان کھڑے ہوئے۔

ایک دن نمازِ مغرب کے بعد مرزا تنہا بیٹھے تھے۔ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ فضا ابر آلود تھی۔ اسی اندھیرے میں بجلی چمکی اور آپ نے اس لمحاتی روشنی میں دیکھا کوئی شخص ہاتھ بلند کیے خنجر سے حملہ آور ہے۔ آپ نے نہایت پھرتی سے حملہ آور کا ہاتھ پکڑ کے خنجر چھین لیا۔ پوچھا" بھائی! تم مجھے کیوں قتل کرنا چاہتے ہو؟"

اس شخص نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آپ نے مزید کہا" جان لینا ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے تم ایک ایسا گناہ کیوں کر رہے ہو جس کا تم کفارہ تک نہیں ادا کر سکتے؟"

اس شخص نے شرمندہ ہو کر گردن جھکا لی۔ مرزا نے اس کا خنجر اسے واپس کر دیا۔ بولے" لو سنبھالو اپنا خنجر، اب ایسی غلطی نہ کرنا"

اس نے خنجر واپس لیا اور آپ کے قدموں میں سر جھکا کر بیٹھ گیا وہ بولا ایک لفظ بھی نہیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ گونگا ہو۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھا اور واپسی کے لیے قدم اٹھائے۔ مرزا نے کہا" اگر کوئی ضرورت ہو تو بتاؤ"

مرزا نے ابھی جملہ پورا بھی نہ کیا تھا کہ اس شخص نے ایک بار پھر حملہ کرنا چاہا۔ مرزا نے اس بار پھر خنجر چھین لیا۔ اور نہایت تحمل سے فرمایا۔
"کیا تم نے میری بات نہیں سنی۔ کیا تم قوتِ سماعت نہیں رکھتے؟"

اس نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ آپ نے پھر اسے نصیحت کی، "کیا تم میری باتیں سُن رہے ہو؟ قتل ایک بدترین گناہ ہے اور تم اس گناہ کے ارتکاب پر مصر ہو۔ میں پوچھتا ہوں آخر کیوں؟"

وہ شخص بدستور خاموش تھا۔ آپ نے وہ خنجر پھر اس کے حوالے کر دیا۔ اور کہا "تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

اس شخص نے تیسری بار پھر حملہ کر دیا۔ آپ نے پھر خنجر چھین لیا۔ اور اسے اپنے رُوبرو بٹھا کر پوچھا۔ "آخر تم بتاتے کیوں نہیں کہ چاہتے کیا ہو؟ تم بولتے کیوں نہیں ہ؟ تم مجھے مارنا کیوں چاہتے ہو؟"

اس شخص نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ مرزا نے کہا "جب تک تم بولو گے نہیں تمہارا خنجر تمہیں نہیں دوں گا۔"

اس شخص نے جُھک کر آپ کے پاؤں پکڑ لیے۔ آپ نے اس کا خنجر اسے پھر واپس کر دیا۔ اس نے اس بار نہایت پھرتی سے آپ پر خنجر کا وار کیا۔ لیکن آپ نے اس بار پھر اس کا خنجر چھین لیا۔ اور کہا۔ "میں تجھے ایک بار پھر معاف کرتا ہوں اور تجھے تاکید کرتا ہوں کہ تو اپنی اس حرکت سے باز آجا۔"

اس بار وہ شخص بول دیا۔ کہا "حضرت! میں نے اتنے تحمل اور برداشت کا کوئی دوسرا انسان نہیں دیکھا۔ آپ نے تو برداشت کی انتہا کر دی۔ میں ابھی تک اس لیے خاموش تھا کہ دیکھوں آپ کہاں تک صبر و تحمل سے کام لیتے ہیں۔"

آپ نے پوچھا "میرے صبر و ضبط کا امتحان ہی لینا مقصود تھا یا کچھ اور ہے؟"

اس نے جواب دیا "میں آپ کو واقعی قتل کر دینا چاہتا تھا کیوں قتل کرنا چاہتا تھا، یہ نہ پوچھیے۔ بس آپ یہ سمجھ لیں کہ میں نے اب تک جو کچھ کیا اس پر بیحد شرمندہ اور نادم ہوں۔ اب آپ میرا خنجر اپنے پاس ہی رکھیے مجھے نہ دیجیے۔"

مرزا جانِ جاں نے اس کا خنجر اسے واپس کر دیا۔ بولے "اپنا خنجر اپنے پاس رکھو، اور خبردار جو پھر ایسی حرکت کی، قتل، ایک ایسا گناہ ہے جس کا کفارہ تم ادا نہیں کر سکتے۔"

وہ شخص خنجر لے کر بصد حرمان دیاس اور ملول و افسردہ وہاں سے چلا گیا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

۷ محرم الحرام ۱۱۹۵ھ (۲ جنوری ۱۷۸۱ء) بدھ کا دن گزر چکا تھا۔ کافی رات گئے کسی نے دروازے پر دستک دی۔ خدمت گار باہر نکلا دیکھا، کئی آدمی کھڑے ہیں، پوچھا "فرمائیے، کس سے ملنا ہے؟"

انہوں نے کہا "ہم مرزا سے ملنا چاہتے ہیں۔"

خدمت گار اندر گیا اور مطلع کیا "حضور آپ سے چند آدمی ملنا چاہتے ہیں۔"

مرزا خواب گاہ سے باہر نکلے اور پوچھا "ہاں جناب فرمائیں کیسے زحمت فرمائی؟"

یہ تین آدمی تھے۔ ان میں سے ایک آدمی آگے بڑھا اور مرزا کے قریب پہنچ کر سوال کیا "کیا مرزا جانِ جاں آپ ہی کا نام ہے؟"

مرزا نے جواب دیا "ہاں، مرزا جانِ جاں اسی خاکسار کو کہتے ہیں؟"

اس شخص نے اپنے دونوں ساتھیوں سے پوچھا "تم دونوں انہیں دیکھو اور بتاؤ کہ مرزا جانِ جاں یہی ہیں؟"

ان دونوں نے تصدیق کی۔ بولے "ہاں، ہم دونوں انہیں پہچانتے ہیں مرزا جانِ جاں یہی ہیں۔"

اس شخص نے کاندھے پہ پڑی ہوئی چادر میں سے ہاتھ نکالا۔ اس شخص کے ہاتھ میں طمنچہ تھا، اس نے آپ کے سینے پہ دائیں طرف گولی چلا دی۔ مرزا زمین پہ گر گئے اور وہ تینوں رات کی تاریکی میں فرار ہو گئے۔

چاروں طرف سے لوگ دوڑ پڑے۔ فوراً ہی جرّاح کو بلایا گیا اس نے علاج شروع کر دیا۔

صبح ایک فرنگی معالج آگیا۔ اس نے بتایا "ہمیں وزیر نجف خان نے آپ کے علاج کی غرض سے بھیجا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ قاتل کی تلاش جاری ہے۔ جیسے ہی ملے گا قصاص جاری کر دیا جائے گا"

مرزا جانِ جاں نے نحیف آواز میں کہا "اگر ارادۂ الٰہی میں شفا ہے تو میں ٹھیک ہو جاؤں گا اور قاتل مل گیا تو میں اُسے معاف کر دوں گا لیکن اگر میں زندہ نہ بچوں تو اسے میری طرف سے معاف کر دیا جائے"

تین دن کی لگاتار کوشش سے بھی آپ جانبر نہ ہو سکے اور ۱۰ محرم الحرام بروز عاشورہ (۵ جنوری ۱۷۸۱ء بروز سینچر) آپ کا وصال ہو گیا۔ اِنا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کو ترکمان دروازے کے پاس ایک حویلی میں دفن کر دیا گیا۔ کہتے ہیں یہ حویلی ان کی بیوی کی ملکیت تھی۔ یہ جگہ بعد میں خانقاہ شاہ غلام علی کہلائی۔ اور آج کل اسے خانقاہ شاہ ابوالخیر کہتے ہیں۔ مرزا کے مزار پہ ان ہی کا ایک شعر کندہ ہے ؎

به لوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریرے
که ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

مرزا جانِ جاں کے بارے میں ان کے سب سے بڑے ہم عصر

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسا کشف صحیح عطا فرمایا ہے کہ روئے زمین کے تمام حالات ہم سے پوشیدہ نہیں۔ اور ہتھیلی کے خطوط کی طرح عیاں ہیں۔ اس وقت مرزا جانِ جاں کا مثل کسی اقلیم و شہر میں نہیں جس شخص کو سلوکِ مقامات کی آرزو ہو وہ ان کی خدمت میں جائے۔"

توکل شاہ انبالوی

یہ ۱۲۵۵ء کی بات ہے، ضلع گورداسپور میں، موضع رترچھتر اور ڈیرہ بابا نانک کے درمیان ایک گاؤں ہے، پکھوکے، یہاں ایک خاندان میں بحالتِ گمنامی ایک بچہ پیدا ہوا، اس.... بچے میں کوئی ایسی بات نہیں تھی، جس سے لوگ اس کے ماں باپ کے بارے میں کچھ یاد رکھنے یا جاننے کی کوشش کرتے۔
صغرِ سنی ہی میں ماں اور باپ یکے بعد دیگرے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے، ان کے نانا میاں اللہ دین شاہ مست نے ان کی کفالت کی ذمہ داری قبول کی۔ یہ نوشاہی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے نانا کی ایک بیٹی تھی، جو اس گمنام بچے کی ماں تھی اور اپنی طبعی عمر کو پہنچنے سے بہت پہلے ہی چل بسی تھی، اور ایک بیٹا تھا جو اس بچے کا ماموں تھا، یہ مدتوں زندہ رہا۔
جب بچّے نے نانا کی سرپرستی اور کفالت میں ہوش سنبھالا اور دوسرے بچّوں کے ماں باپ کی موجودگی میں خود کو اس نعمت سے محروم پایا تو اس کے نازک اور ننھے سے دل پر بڑا اثر ہوا، اس میں بے بسی اور محرومی کا احساس پیدا ہو گیا۔ اس محرومی کے احساس نے آہستہ آہستہ اس کی شخصیت کی تعمیر میں اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ بچّے نے اپنے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ وہ اپنے

نانا سے کسی بات کی بھی شکایت نہ کرتا۔ نانا کو اس پر بڑا ترس آیا کہ یہ کیسا صابرو شاکر بچہ ہے جو کسی کی بات کا بُرا ہی نہ مانتا اور ہر کسی سے عاجزی اور تکلف سے پیش آتا۔ نانا اس کے عجز و انکسار اور توکل اور قناعت کو بڑی توجہ سے محسوس کر رہا تھا۔

ایک دن نانا نے اپنے چند دوستوں کی موجودگی میں اس بچے کو بلایا اور اس سے پوچھا "میاں صاحبزادے! میں چاہتا ہوں کہ تم پڑھ لکھ کر اس لائق ہو جاؤ کہ میں تمہیں کسی بہت اچھی جگہ تعینات کرا دوں"

بچے نے بڑی سادگی سے جواب دیا "نانا صاحب! میں دنیا سے کچھ بھی نہیں چاہتا، مجھے جو کچھ لینا ہے اپنے رب سے مانگ لوں گا آپ میری فکر نہ کریں"

نانا اپنے نواسے کے منہ سے یہ غیر معمولی باتیں سُن کر دنگ رہ گئے، ابھی تک انہوں نے اس بچے کو یوں ہی معمولی سا ناقابلِ ذکر بچہ سمجھ رکھا تھا لیکن آج اس کے جواب نے انہیں دم بخود کر دیا تھا۔ انہوں نے نواسے سے کہا "بیٹے! میں جو کچھ تیرے لیے چاہتا ہوں بخلوصِ قلب چاہتا ہوں اور یہ بھی یاد رکھ کہ میری یا کسی شخص کی بھی کوشش سے جو کچھ بھی تجھے ملے گا اس میں رب کی مشیئت ضرور شامل ہوگی!"

نواسے نے جواب دیا "نانا جان! آپ جو کچھ فرما رہے ہیں میں اس سے انکار کب کر رہا ہوں، میں نے جو کچھ کہا اس سے میرا یہ مطلب ہے کہ میں نے ابھی سے اپنا ناطہ اللہ تعالیٰ سے جوڑ لیا ہے۔ میں اپنے رب کا ہو جانا چاہتا ہوں"

نانا نے گفتگو بند کر دی اور دل میں فیصلہ کر لیا کہ اس بچے کو سمجھنے کی

کوشش کی جائے۔

انہوں نے کافی دنوں تک اپنے نواسے کی نگرانی کی اور اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ بچے میں حرص و طمع نام کی کوئی چیز بھی نہیں، نہ اسے بھوک کی پرواہ تھی اور نہ ہی لباس کی، اس کو مصیبتوں اور دکھوں کا شکوہ کرنا بھی نہ آتا تھا، آخر نانا نے اس کا نام توکّل شاہ رکھ دیا۔

نانا کا تعلق چونکہ نوشاہی سلسلے سے تھا۔ اس لیے ان کے پاس آنے جانے والے درویش اس بچّے پر اثر انداز ہوتے رہے۔ آتش شوق بھڑکی تو آنے جانے والے درویشوں سے انہیں تسکین نہ مل سکی اور فیصلہ کر لیا کہ کسی کامل کو خود ہی تلاش کرنا پڑے گا۔ یہ ہر وقت گم صُم اور کھوئے کھوئے سے رہنے لگے۔ نانا اس تبدیلی کو گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ آخر ایک دن پوچھ ہی لیا۔ "بیٹے توکل شاہ! تم ہر وقت کیا سوچتے رہتے ہو؟"

نواسے نے جھوٹ سے گریز کیا، جواب دیا۔ "نانا صاحب! میرے سینے میں ایک بھٹی جل رہی ہے اور میں اس میں جل رہا ہوں میں ایک ایسے کامل کی تلاش میں ہوں جو مجھے راہ دکھا سکے، جو مجھے سکون پہنچا سکے جو میرا ہاتھ پکڑ کر اس راہ پر ڈال دے، جس پر چل کے میں اپنی منزلِ مقصود پا لوں۔"

نانا نے تلقین کی۔ "صاحبزادے! ابھی تم بہت چھوٹے ہو، انتظار کرو، اللہ پیارے بندوں کو مایوس نہیں کرتا پھر تمہیں کیوں مایوس کرے گا۔"

توکل شاہ نے سکوت اختیار کیا۔ ابھی یہ سنِ بلوغ کو بھی نہیں پہنچے تھے کہ یہ فیصلہ کر لیا کہ جس باکمال مرشد کی جستجو ہے، اس کو خود ہی تلاش کرنا چاہیئے۔"

انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اگر اس سلسلے میں نانا جان سے کسی قسم کا مشورہ کیا گیا تو ان پر پابندی لگا دی جائے گی اور انہیں نا معلوم مدت کے لیے یہیں کہیں مقفّل کر دیا جائے گا۔

یہ سوچ کر انہوں نے خاموشی سے نانا کا گھر چھوڑ دیا اور گھومتے پھرتے ہریانہ پہنچ گئے، پھر یہاں سے اجمیر چلے گئے۔ انہوں نے خواجہ غریب نوازؒ کے مزار پر کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی اور کچھ دیر خاموش کھڑے رہے۔ ان کی محویت اور استغراق پر ہر شخص کی نظریں لگی ہوئی تھیں۔

اس عالم میں ایک بزرگ ان کی طرف بڑھے اور ان کے دائیں شانے پر ہاتھ رکھ دیا، پوچھا "تو یہاں کس کے پاس اور کیا لینے آیا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا "بابا! میں یہاں کسی انسان کے پاس نہیں آیا ہوں مجھ کو تو خواجہ غریب نوازؒ نے کھینچ بلایا ہے اس لیے میں ان کے آستانے پر اپنی پوری زندگی گزار سکتا ہوں۔"

ان بزرگ نے اس نو عمر لڑکے کو اتنی شاندار باتیں کرتے دیکھا تو دم بخود صورت دیکھتے رہ گئے۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھلنے لگی، بولے "میاں صاحبزادے! خوب تم نے تو میرا ایمان تازہ کر دیا۔ ویسے میں پوچھتا ہوں کہ تم ٹھہرے کہاں ہو؟"

انہوں نے جواب دیا "میرا کوئی ٹھکانا نہیں رات کو یہیں کہیں پڑا رہوں گا۔"

ان بزرگ نے کہا "میں چشتی نظامی..... سلسلے کا ایک درویش ہوں اگر پسند کرو تو میرے ساتھ رہ لو، میرے پاس رہ کر تم خسارے میں نہیں رہو گے۔"

انہوں نے فوراً ہی فیصلہ کر دیا ''اگر آپ مجھے اپنے پاس رکھیں گے تو ضرور رہوں گا۔''

چشتی نظامی بزرگ نے پوچھا'' یہاں کے بعد آپ کہاں تشریف لے جائیں گے؟''

انہوں نے جواب دیا'' میں خواجہ غریب نوازؒ کے در پہ یہی سوال لے کر آیا ہوں کہ مجھ کو کہاں اور کس کے پاس جانا چاہیئے۔ میری رہبری کس کے سپرد ہوئی ہے؟ آخر میں کب تک مارا مارا پھرتا رہوں گا؟''

چشتی نظامی بزرگ نے متبسّم ہو کر فرمایا'' اللہ نے چاہا تو تمہارے اس سوال کا جواب یہاں سے ضرور ملے گا۔ کیونکہ یہاں سے کوئی سوالی بھی ناکام اور مایوس نہیں گیا۔''

یہ ان بزرگ کے ساتھ رہنے لگے۔ ایک ہی دن میں توکل شاہ نے حیران کن منظر دیکھا کہ صبح ہوتے ہی چشتی نظامی بزرگ اپنے حجرے کا دروازہ بند کر کے مراقبے میں چلے گئے۔ باہر مزار پہ قوالیاں ہو رہی تھیں، مگر ان بزرگ نے اس میں کوئی حصہ نہ لیا، خاموش اپنے حجرے میں بند مراقبے میں رہے۔

ظہر کے وقت مراقبہ ختم ہوا اور یہ نماز پڑھنے مسجد میں چلے گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے توکل شاہ بھی چلے گئے۔ جب یہ نماز پڑھ کر واپس آ رہے تھے تو توکل شاہ نے ڈرتے ڈرتے ان سے پوچھا'' قبلہ محترم! آپ سماع سے دلچسپی نہیں رکھتے؟''

انہوں نے جواب دیا'' میں سماع سے بیزار بھی نہیں۔''

توکّل شاہ نے کہا'' آپ جب مراقبے میں تھے تو مزار پہ شاندار قوالیاں ہو رہی تھیں۔''

انہوں نے جواب دیا "ہاں کچھ بھنک تو میں نے بھی سنی تھی۔"
توکل شاہ نے عرض کیا "میری خواہش ہے کہ کل آپ محفلِ سماع میں ضرور شریک ہوں۔"
بزرگ نے جواب دیا "صاحبزادے! میں تمہارا کہنا ضرور مان لیتا لیکن اس میں چند قباحتیں ہیں، مجھے اس پر مجبور نہ کرو تو بہتر ہے۔"
توکل شاہ نے بچوں کی طرح ضد کی "میں کچھ نہیں جانتا، میں آپ کو ضرور لے جاؤں گا۔"
انہوں نے عذر پیش کیا "میاں صاحبزادے! اس وقت میں مراقبے میں ہوتا ہوں۔"
توکل شاہ نے عرض کیا "ظہر کے بعد بھی آپ مراقبے میں جا سکتے ہیں۔"
بزرگ نے پیچھا چھڑانے کی خاطر کہا "ضد نہ کرو صاحبزادے، کل کی کل دیکھی جائے گی۔"
توکل شاہ خاموش ہو گئے اور دوسرے دن جب صبح فجر کی نماز سے فارغ ہوئے تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گئے کہ بزرگ مراقبے میں جا چکے ہیں۔ توکل شاہ کو ان کا ظہر تک انتظار کرنا پڑا۔
دونوں نے ظہر کی نماز مسجد میں ادا کی۔ واپسی اور راستے میں ایک بار پھر دونوں میں باتیں ہونے لگیں، توکل شاہ نے شکایتاً کہا "حضرت! کل آپ نے مجھ سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ میرے ساتھ محفلِ سماع میں تشریف لے جائیں گے لیکن وہ وعدہ ہنوز پورا نہیں ہوا۔"
آپ نے جواب دیا "سائیں توکل شاہ! میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا بس یہ کہا تھا کہ کل کی کل دیکھی جائے گی۔ تم اسے میرا وعدہ سمجھ بیٹھے۔"

توکل شاہ نے کہا "چلئے میں نے آپ کی بات مان لی، مگر آپ اس سلسلے میں کیا فرماتے ہیں؟"

بزرگ نے جواب دیا "صاحبزادے! ضد نہ کرو، تم میری اس آگ سے واقف نہیں ہو، جو میرے سینے میں دہک رہی ہے۔ محفلِ سماع میں جب یہ بھڑکے گی تو سامعین اور حاضرین اس کی تاب نہیں لاسکیں گے۔"

توکل شاہ خاموش ہو گئے کیونکہ یہ ضد کے لیے مناسب وقت نہیں تھا۔

کئی دن بعد مزار کے منتظمین میں سے چند آدمی ان بزرگ کے پاس آئے اور ان سے درخواست کی کہ آج ملک کے چند نامور قوال آئے ہیں اس لیے محفلِ سماع میں آپ بھی تشریف لے چلیں۔

چشتی نظامی بزرگ نے جواب دیا "آپ لوگ مجھے مجبور نہ کریں کیونکہ میں محفلِ سماع میں ایک خاص وجہ سے نہیں شریک ہوتا۔"

توکل شاہ نے ان کا دامن پکڑ لیا اور بچوں کی طرح ضد کرنے لگے "آج تو میں آپ کو ضرور لے جاؤں گا آپ کسی ایک کی درخواست رَد کر سکتے ہیں مگر سب کی نہیں۔ آج تو آپ کو چلنا ہی پڑے گا۔"

ان بزرگ نے ایک بار پھر سمجھایا "بیٹے توکل! میرے جوشِ عشق کو ایک شخص بھی برداشت نہیں کر سکے گا اس لیے میں محفلِ سماع میں شریک ہونے سے گریز کر رہا ہوں۔"

توکل شاہ نے جواب دیا "حضرت! میں بھی اس لیے بضد ہوں کہ اس بہانے ہم لوگ آپ کے جوشِ عشق کو دیکھ یا محسوس کر سکیں گے۔"

یہ بزرگ بادلِ نخواستہ اٹھے اور فرمایا "بہرحال میرا کام سمجھانا تھا سمجھا دیا۔ اب اگر تم بضد ہو تو چلو میرے ساتھ اور وہ تماشا بھی دیکھ لو

جو آج تک نہیں دیکھا ہو گا۔"

توکل شاہ اور دوسروں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی، وہ سب ان بزرگ کو محفلِ سماع میں لے گئے۔ حاضرین اور ناظرین میں اکثر وہ لوگ تھے جنہوں نے ان بزرگ چشتی نظامی کو محفلِ سماع میں کبھی بھی نہیں دیکھا تھا، قوال بھی بے حد خوش تھے انہوں نے اعلان کیا کہ آج وہ اپنی زندگی کی بہترین قوالی سنائیں گے۔"

چشتی نظامی بزرگ سب سے آگے قوالوں کے پاس بیٹھ گئے۔ توکل شاہ بھی ان کے پاس ہی براجمان ہو گئے۔

قوالوں نے ان بزرگ کی طرف دیکھا اور قوالی شروع کرنے کی اجازت طلب کی۔ آپ نے سر کے اشارے سے اس کی اجازت دے دی۔ قوالوں نے ساز اور تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ جب ان دونوں کی وجہ سے ایک سماں سا بندھ گیا تو انہوں نے جامیؒ کی نعت، "دلم پژمردہ آوارہ زعصیاں یا رسولؐ اللہ......"، نہایت پُرسوز دُھن میں شروع کر دی، سامعین پر اس کا بڑا اثر ہوا۔ چشتی نظامی بزرگ پر وجد کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ پھر قوال نے ایک دوسرے مصرعے کے بعد "پشیمانم پشیمانم پشیماں یارسولؐ اللہ" جیسے ہی پڑھا ان بزرگ کی حالت غیر ہو گئی اور یہ الّا اللہ کا نعرہ مار کر گر گئے۔ اس نعرے میں معلوم نہیں کتنی قوت تھی کہ پوری محفل کی حالت بگڑنے لگی۔ قوال قوالی بھول گئے اور بے ہوش ہو کر ایک دوسرے پر ڈھیر ہو گئے سامعین اپنے ہوش و حواس سے ہاتھ دھو بیٹھے اور مدہوشی کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے خود توکل شاہ جہاں تھے وہیں پر گر گئے۔

چشتی نظامی بزرگ اپنی جگہ سے اٹھے اور اپنے حجرے کی راہ لی، کچھ

دیر بعد توکل شاہ بھی ان کے پاس پہنچ گئے اور عرض کیا "حضرت! یہ کیا ہو گیا تھا!"

انہوں نے جواب دیا "میاں صاحبزادے! کیا میں نے تمہیں پہلے ہی یہ نہیں بتایا تھا کہ میرے جوشِ عشق کو برداشت کر لینا بہت مشکل ہے۔"

توکل شاہ کو ان کے مقام کا کسی حد تک اندازہ ہو گیا تھا، بولے۔ "حضرت! کچھ میرے لیے بھی کیجئے۔"

انہوں نے جواب دیا "میں کیا کر سکتا ہوں، جب تک اُدھر کا اشارہ بھی نہ ہو۔"

توکل شاہ نے کہا "بہر حال میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں کبھی بھی آپ کا دامن نہیں چھوڑوں گا۔"

انہوں نے جواب دیا "یہ ساری باتیں فضول ہیں میں تمہارے پاس زیادہ دن نہیں رہوں گا۔ میں تو اپنے لیے کسی کے فرمان کا منتظر ہوں، فرمان کے پاتے ہی معلوم نہیں مجھ کو کہاں جانا پڑ جائے۔"

توکل شاہ نے اصرار کیا "حضرت! جب تک میں آپ سے کچھ نہ کچھ حاصل نہ کر لوں گا آپ کے پاس موجود رہوں گا۔"

انہیں توکل شاہ پر پیار بھی آیا اور رحم بھی، بولے "اچھا اگر تمہارے شوق کا یہی عالم ہے تو میں بطریق چشتیہ نہیں نفی اور اثبات کی تلقین کرتا ہوں۔"

چنانچہ ان بزرگ نے جیسے ہی نفی اور اثبات کی تلقین کی توکل شاہ کے قلب پر کلمہ جاری ہو گیا۔ توکل شاہ کی حالت ہی غیر ہو گئی۔

توکل شاہ کو ان بزرگ نے تربیت دینی شروع کر دی۔
ایک دن صبح ہی صبح یہ بزرگ توکل شاہ کے پاس گئے اور مسکراتے ہوئے کہا "میاں صاحبزادے! اپنا تو تبادلہ ہو گیا اب تم جانو اور تمہارا کام میں تو یہاں سے چلا۔"
توکل شاہ نے پریشان ہو کر پوچھا "حضرت! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"
انہوں نے جواب دیا "ابھی صبح سے ذرا پہلے میرے پاس خواجہ غریب نواز تشریف لائے تھے انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں جلد از جلد بصرہ پہنچوں۔ مجھے وہاں کا قطب مقرر کر دیا گیا ہے، اس لیے اب میں اجمیر میں نہیں رہ سکتا، تم.... اپنا ٹھکانا کر لو۔"
توکل شاہ کا دل دھک دھک کرنے لگا پوچھا "پھر میرے لیے کیا حکم ہے؟"
بزرگ نے جواب دیا "تم اس وقت تک یہیں رہو گے جب تک خواجہ صاحب تمہیں یہ نہ بتا دیں کہ اب تم فلاں شہر میں فلاں بزرگ کے پاس چلے جاؤ۔"
توکل شاہ کا دل رو رہا تھا۔ انہیں ان بزرگ کی جدائی بہت شاق گزرے گی، وہ جانتے تھے۔
یہ بزرگ جانے کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ پھر اچانک ایک دن چلے گئے۔ توکل شاہ تنہا رہ گئے۔ یہ بہت اداس ہو گئے۔ اس عالم میں یہ خواجہ غریب نواز کے مزار پر گئے اور بڑے پُرسوز لہجے میں کہا "خواجہ غریب نواز! یہ عاجز آپ کے ارشاد کا منتظر ہے۔ آخر میری منزل کہاں

ہے ؟ میری رہنمائی کون کرے گا ؟ میں کہاں اور کس کے پاس جاؤں ؟"
انہیں اپنے سوالوں کا کوئی جواب نہیں ملا۔ مایوس اور دلِ شکستہ چپ ہو کر بیٹھ گئے۔

کئی دن بعد آدھی رات کے وقت کسی نے توکّل شاہ کے حجرے پر دستک دی یہ باہر نکلے تو ایک بوڑھے کو اپنا منتظر پایا، پوچھا "کیا بات ہے؟ تم کون ہو اور میرے پاس کیوں آئے ہو ؟"

بوڑھے نے جواب دیا "ایک ہی سانس میں اتنے سارے سوالات ! خوب۔ میاں صاحبزادے ! خواجہ کے مزار پر ولیوں کی مجلس جمی ہوئی ہے تم بھی وہیں پہنچ جاؤ اور جو کچھ کہنا سننا ہے کہہ سُن ڈالو۔"

اس خوشخبری نے توکل شاہ کو اس قابل بھی نہیں رکھا کہ وہ ان بڑے میاں سے پوچھتے کہ تم کون ہو اور میرے پاس کس کے اشارے پر آئے ہو ؟"

یہ خاموشی سے باہر نکلے اور خواجہ صاحب کے مزار پر پہنچ گئے، وہاں کا منظر ہی کچھ اور تھا، ولیوں کی محفل میں ساری نشستیں گھری ہوئی تھیں ایک نشست بھی خالی نہیں تھی۔ توکل شاہ نشست کی تلاش میں ہر طرف نظریں دوڑاتے رہے، بیچ میں کوئی بزرگ صدر نشیں تھے۔ توکل شاہ نے کسی سے پوچھا "یہ بزرگ کون ہیں ؟"

جواب ملا "خواجہ معین الدین چشتی۔ سلطان الہند"

توکل شاہ نے پوچھا "اس محفل میں میرے لیے بھی کوئی جگہ ہے ؟"

جواب ملا "نہیں !"

توکل شاہ کو بڑا دکھ ہوا، انہوں نے ہمت اور حوصلے سے کام لیا اور

بچوں کی طرح کود کر بیچ میں خواجہ صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ اولیائے کرام کو اس پر اعتراض ہوا اور توکل شاہ کی اس حرکت کو گستاخی پر معمول کیا۔

لیکن خواجہ صاحب نے ان سب کو مخاطب کر کے فرمایا: "حاضرین! یہ بچہ بھی ہے اور مست بھی۔ اس لیے اس کی یہ حرکت ایسی نہیں جو ہمیں گراں گزرے۔"

پھر توکل شاہ سے پوچھا: "ہاں صاحبزادے! تم کیا چاہتے ہو؟"

توکل شاہ نے کہا: "حضرت! میں کب تک یہاں پڑا رہوں گا میرے بارے میں بھی اپنا فیصلہ سنا دیجئے۔"

خواجہ صاحب نے جواب دیا: "توکل! تو پنجاب چلا جا، تیرا پیر وہیں ہے تو چشتی سلسلے کا نہیں نقشبندی سلسلے سے تعلق رکھتا ہے۔"

توکل شاہ نے پوچھا: "کیا چشتیہ سلسلے میں میرے لیے کچھ بھی نہیں ہے؟"

خواجہ صاحب نے جواب دیا: "کہہ جو دیا پنجاب چلے جاؤ۔ تیرا پیر نقشبندیہ سلسلے سے تعلق رکھتا ہے۔"

توکل شاہ نے دوسرے دن علی الصبح اجمیر کو چھوڑ دیا۔ اور پنجاب روانہ ہو گئے۔ دورانِ سفر چند یوم انبالہ میں بھی قیام کیا۔ وہاں سے لدھیانہ اور پھر جالندھر تشریف لے گئے۔ یہاں توکل شاہ کو ایک مجذوب ملا، وہ توکل شاہ کو روک کر کھڑا ہو گیا، ہنس کر پوچھا: "بچہ تو کس کو تلاش کر رہا ہے؟"

توکل شاہ نے اجمیر کا واقعہ سنا دیا اور کہا: "مست شاہ! مجھے اپنے پیر کی تلاش ہے جس کو میں نے نہ تو دیکھا ہے اور نہ ہی اس کا نام جانتا ہوں!"

مجذوب زور سے ہنس دیا۔ بولا: "خوب جس کو نہ تو نے دیکھا ہے اور نہ ہی اس کا نام جانتا ہے پھر اس کو پائے گا کس طرح؟"

توکل شاہ نے جواب دیا "بابا! جس نے مجھے اس کا نشان دیا ہے، وہی اس سے ملاقات بھی کرا دے گا۔"

مجذوب نے کہا "یہ اجمیر والا اس قسم کی باتیں کرتا رہتا ہے، بتاؤ تو بھلا، اگر صاف صاف پتہ اور نام بتا دیتا تو اس میں کیا حرج تھا؟"

توکل شاہ نے پوچھا "کیا آپ میرے پیر سے واقف ہیں اور ان کا پتہ بتا سکتا ہے؟"

مجذوب نے جواب دیا "کیوں نہیں۔ بالکل بتا سکتے ہیں۔ جب اجمیر والے نے یہ بات نہیں چھپائی تو میں کیوں چھپاؤں۔ جا جھانخیلاں چلا جا۔ وہاں قادر بخش نامی ایک درویش رہتا ہے، وہی تیرا پیر مرشد ہے اور وہی تیرے قلب کو مصفا اور مجلا کرے گا۔"

توکل شاہ اس صاف صاف نام اور پتے سے اتنے خوش ہوئے کہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جھانخیلاں روانہ ہو گئے۔ یہ جھانخیلاں میں داخل ہوئے تو ایک مست عورت انہیں دیکھ کر مسکرائی، پوچھا "صاحبزادے! کہاں رہ گئے تھے؟ دیر کر دی، بہر حال ابھی وقت ہے آفتاب ہدایت غروب ہونے والا ہے۔"

توکل شاہ خواجہ قادر بخش کی خدمت میں پہنچے تو وہ ان سے اس طرح پیش آئے گویا ان کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے توکل شاہ کے سر پر ہاتھ پھیرا، اس کے بعد سینے سے لگا لیا۔ وہاں برسوں کے صحبت یافتہ بھی موجود تھے۔ اپنے پیر و مرشد کی ایک اجنبی نوجوان پر غیر معمولی نظرِ عنایت دیکھ کر پوچھا "پیر مرشد! کیا یہ صاحبزادے اتنا جوہر قابل رکھتے ہیں کہ آپ سے غیر معمولی فیض پا جائیں؟"

خواجہ قادر بخش نے جواب دیا" اللہ تعالیٰ کا فیض عمر کی کمی یا زیادتی کا پابند نہیں ہوتا۔ توکل شاہ کا نام اللہ تعالیٰ کا مرحمت کردہ ہے ان میں وہی خصوصیات اور اوصاف بھی پائے جاتے ہیں یعنی یہ اسم بامسمیٰ ہیں"

خواجہ صاحب کی نوازشیں حد سے زیادہ بڑھ گئیں۔ توکل شاہ خود بھی یہ محسوس کر رہے تھے کہ ان میں کسی غیر معمولی شے کا اضافہ ہو گیا ہے، انہیں اپنے وجود کے بھاری پن کا احساس ہونے لگا تھا، خواجہ صاحب نے فرمایا "اے توکل شاہ! تم کسی غیر معمولی بات سے گھبرا نہ جانا"

توکل شاہ نے عرض کیا "حضرت! میں نے آپ کو بڑی مشکل سے پایا ہے، اب میں معمولی اور غیر معمولی کی کیا فکر کروں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں یہاں سے کچھ نہ کچھ حاصل کروں گا"

ایک دن توکل شاہ کی ناک سے خون جاری ہو گیا اور یہ مجذوبوں جیسی باتیں کرنے لگے۔ پیرانے صحبت یافتہ خوش ہوئے کیونکہ وہ اس نوجوان سے حسد کرنے لگے تھے۔ توکل شاہ کی ناک سے خون جاری تھا کسی نے یہ خبر خواجہ قادر بخش کو پہنچا دی، آپ توکل شاہ کے پاس پہنچ گئے اور پوچھا "کیا بات ہے؟"

توکل شاہ حالتِ جذب میں تھے، بولے "حضرت! یہ آپ پوچھ رہے ہیں کہ کیا حال ہے؟"

خواجہ نے فرمایا "ہاں یہ میں پوچھ رہا ہوں، میں نے تجھ کو انوار لطائف اور فیوض ولایت سے مالا مال کر دیا ہے تو اس بوجھ کو برداشت نہیں کر سکا۔ اور ناک سے خون جاری ہو گیا"

ایک مرید نے عرض کیا "حضور پیر مرشد! یہ جذب میں مبتلا ہیں کیا

ان سے سلسلہ ولایت چل سکتا ہے، یہ اپنے ہوش میں نہیں، پھر یہ رہنمائی کس طرح کریں گے؟"

خواجہ صاحب نے مرید کو آنکھ دکھائی، فرمایا "یہ ان کی عارضی حالت ہے، ورنہ توکل شاہ ایک بہت بڑے سلسلے کا بانی ہے، جو اس وقت موجود ہوں گے اپنی آنکھ سے دیکھ لیں گے۔"

توکل شاہ آہستہ آہستہ ہوش میں آنے لگے۔ پھر تقریباً دو ماہ اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں رہ کر ان سے وہ سب کچھ حاصل کر لیا جو دوسرے سالہا سال رہ کر بھی نہیں حاصل کر سکے تھے

ایک دن خلاف توقع آپ نے توکل شاہ سے فرمایا "توکل! میرا کام ختم ہو چکا، اب تو انبالے چلا جا اور رشد و ہدایت کا کام شروع کر دے۔"

توکل شاہ نے کہا "پیر و مرشد! اتنی جلدی، ابھی تو مجھ کو اور زیادہ فیضیاب ہونے دیجئے۔"

خواجہ صاحب نے فرمایا "نہیں، اب اس کی کوئی ضرورت نہیں، تو نے اپنی نوعمری ہی میں جو کچھ حاصل کر لیا ہے دوسرے ایک عمر گزار کر بھی اس سے محروم رہتے ہیں، تو انبالے جا اور رشد و ہدایت کی خدمت انجام دیتا رہ۔"

آپ نے پیر مرشد کے حکم کے بموجب انبالے کا رُخ کیا۔ اس وقت وہ حالتِ جذب میں تھے۔ کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ان کے پاس چلا جاتا انبالے میں داخل ہوتے ہی انہیں ایک باغ دکھائی دیا۔ کسی سے پوچھا "یہ کس کا باغ ہے؟"

جواب ملا "نند سنگھ نامی ایک ہندو کا۔"

انہوں نے فرمایا "اب ہم اس باغ میں قیام کریں گے۔"

چنانچہ اس باغ میں کٹیا بنا کے رہنے لگے۔ نند سنگھ کو جب یہ خبر پہنچی کہ ایک مسلمان درویش نے ان کے باغ میں قیام کیا ہے تو وہ بھاگا بھاگا آپ کے پاس پہنچا۔ پہلے تو اس کا یہ ارادہ تھا کہ انہیں اپنے باغ سے نکال دے گا لیکن ان کی صورت دیکھتے ہی کانپنے لگا اور ایک لفظ بھی اپنے منہ سے نہ نکال سکا۔ آپ نے نند سنگھ سے فرمایا۔ "تو مجھے اپنے باغ سے نکالنا چاہتا ہے ؟ حالانکہ میں نے تجھ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔"

نند سنگھ نے جواب دیا "نہیں میاں جی! میری یہ مجال کہ میں آپ کو باغ سے نکالوں، باغ آپ کا ہے شوق سے اس میں رہیں چاہیں تو اسے آپ کے نام کر دیا جائے۔"

آپ نے فرمایا "میں باغ لے کر کیا کروں گا۔ مجھے یہاں مستقلاً کب رہنا ہے۔ فقیروں کا کیا، آج یہاں ہیں تو کل کہیں اور ہوں گے۔"

ایک دن آپ نے خواب میں دیکھا کہ خواجہ قادر بخش وصال فرما گئے، اس خواب نے انہیں پریشان کر دیا، یہ فوراً ہی جہانخیلاں روانہ ہو گئے، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ان کا خواب سچا تھا، توکل اپنے پیر مرشد کے چہلم تک وہیں رہے۔ چالیسویں کے خاتمے کے بعد دستار بندی کی رسم ادا کی جانے لگی یہ کئی خلفاء تھے جن کی دستار بندی ہو رہی تھی۔ آپ ان میں موجود تھے مگر کسی نے بھی آپ پر کوئی توجہ نہ دی۔

کسی مرید نے کہا "صاحبان! پیر و مرشد اپنے آخری دنوں میں اس نوجوان توکل شاہ پر بہت مہربان تھے، آپ لوگ یہ بھی جانتے ہیں، کہ توکل

شاہ ہر طرح سے اس کے مستحق ہیں کہ انہیں بھی پیرومرشد کے خلفا میں شامل کر لیا جائے۔ ان کی بھی دستار بندی ہونی چاہیئے۔"

خلفاء نے ناک بھویں چڑھائیں، ایک نے دوسرے خلفاء کی طرف دیکھ کر انہیں ہم خیال بنانے کی نیت سے کہا، "معلوم ہے ان صاحبزادے میں خلیفہ بننے کی کتنی صلاحیت ہے۔ اگر ان کی دستار بندی بھی کر دی جائے تو لوگ اس کمسن خلیفہ کی ولایت اور بزرگی کو کس طرح تسلیم کریں گے۔"

دوسرے خلفاء نے بھی اس کی تصدیق کی، کسی طرف سے آواز آئی۔ "آپ نے بجا فرمایا، پیرومرشد نے اگر ان صاحبزادے کو اس لائق سمجھا ہوتا تو اپنے آخری لمحوں میں ان کے لیے وصیت فرما جاتے۔"

توکل شاہ کو ان کی باتوں سے بڑی اذیت پہنچ رہی تھی۔ یہ مزید برداشت نہ کر سکے۔ یہاں سے اٹھ کر جنگل کی راہ لی، اور اپنے رب سے شکایت کرنے لگے، "اے میرے مولا! میں نے تو کسی کا دل کبھی نہیں دکھایا، پھر یہ انہیں کیا ہو گیا کہ مجھے خواہ مخواہ چٹکیاں لیتے رہے۔"

آپ نے جنگل میں قیام فرمایا، شہر سے نفرت ہو گئی۔ یہاں شب و روز یادِ الٰہی میں بسر ہونے لگے۔ ایک رات ان کی کٹیا پر کسی نے دستک دی، جب یہ باہر نکلے تو انہیں ایک بزرگ سفید براق لباس میں ملبوس کھڑا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ تھا۔ آپ نے پوچھا، "کیا بات ہے؟ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

بزرگ نے جواب دیا، "میں اللہ کے حکم پر تمہارے پاس آیا ہوں، خواجہ قادر بخش کے خلفاء نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا، اللہ نے تمہارے لیے دستارِ فضیلت بھیجی ہے، اپنا سر میری طرف بڑھاؤ تاکہ میں اسے اپنے

ہاتھوں سے باندھ دوں۔"

توکل شاہ نے اپنا سر ان بزرگ کی طرف بڑھا دیا۔ وہ دیر تک دستار کو توکل شاہ کے سر سے لپیٹتے رہے مگر دستار اتنی بڑی تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ جب دستار بندھ چکی تو ان بزرگ نے کہا۔ "توکل شاہ! تم اپنے پیر و مرشد کے حکم کے بموجب انبالے واپس جاؤ، تمہارا اس جنگل میں رہنا غیر مناسب اور غیر ضروری ہے۔"

توکل شاہ نے اسی دن انبالے کی راہ لی۔

* * * * * * * *

آپ مراقبے میں حبس دم میں غیر معمولی قدرت حاصل کر چکے تھے یہاں تک کہ.... دو دو گھنٹے تک سانس روکے رکھتے۔ اس عالم میں ایک دن توکل شاہ نے ایک عجیب سا منظر دیکھا۔ انہیں وحدت کا ایک بے کنار دریا نظر آیا۔ چاروں طرف ایک ہی ایک نظر آتا تھا۔ انہیں بڑی پریشانی ہوئی۔ آپ ہی آپ فرمانے لگے۔" الہ العالمین! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں، یہاں تو حدتیں ختم ہو چکی ہیں اور ہر طرف ایک ہی ایک نظر آتا ہے۔ آخر یہ کیا ماجرا ہے؟"

انہیں اپنے کانوں میں ایک آواز سی آتی سنائی دی، کوئی کہہ رہا تھا "توکل شاہ! یہ حالت وحدتِ الوجود ہے۔ صدیوں پہلے حسین بن منصور حلاج اس کیفیت کا شکار ہو گیا تھا اور انا الحق کا نعرہ لگانے لگا تھا۔"

توکل شاہ نے آنکھیں بند کر لیں اور معاملات کو مزید سمجھنے کی کوشش کی۔ اب انہیں اپنا وجود ایک قطرے کی طرح نظر آیا جو ایک بہت بڑے دریا کے سامنے موجود تھا۔ پھر یہ قطرہ دریا میں مل گیا تو وحدت ہی وحدت رہ گئی، توکل شاہ کو ہر طرف اپنے سوا کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ اب توکل شاہ کو

شیطان نے ورغلانا شروع کر دیا۔ وہ آپ کو یقین دلا رہا تھا کہ کائنات میں کچھ نہیں، جو کچھ بھی ہے انسان کا اپنا ہے اور یہاں انسان سے بڑا کوئی بھی نہیں۔

ان وسوسوں نے دل میں ایک عجیب سا سوال پیدا کر دیا "کیا میں خدا ہوں؟"

جو کچھ نظر آرہا تھا، اس سے سوال کا جواب اثبات میں ملتا تھا لیکن اس وقت بھی توکل شاہ کو اتنا ہوش ضرور تھا کہ "انا الحق" کہتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔

کسی نے انہیں ورغلایا "توکل شاہ! تو خدا ہے، خدا تجھ سے الگ نہیں ہے۔"

لیکن وجدان نے اس کی تردید کر دی، اس نے توکل شاہ کو مشورہ دیا "توکل شاہ! تو محض ایک بندہ ہے، خبردار جو اتنا بڑا دعویٰ کیا۔" کسی قوت نے وجدان کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ "اگر تو خدا نہیں ہے تو اس کا واضح ثبوت دے۔"

وجدان نے حکم دیا۔ "ذرا ایک سوئی تو لا۔"

توکل شاہ نے سوئی ہاتھ میں لے لی، تو وجدان نے انہیں حکم دیا "اب سوئی کو اپنے جسم میں داخل کر۔"

انگلیوں نے سوئی کو بازو میں داخل کر دیا، درد واذیت سے ان کے منہ سے "سی" نکل گئی۔ وجدان نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی "توکل شاہ۔ اگر تو خدا ہے تو سوئی کی چبھن سے تجھے تکلیف کیوں محسوس ہوئی۔"

نفس نے ہتھیار ڈال دیے۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد پھر سرکشی اختیار کی، کہنے لگا "کچھ بھی سہی، میں خدا ہوں سوئی کی چبھن سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

وجدان نے کہا: "اچھا تب پھر آگ کا انگارا اپنے ہاتھ میں لے کر دکھا۔"

نفس نے جوش میں آکر انگارے کو مٹھی میں دبالیا۔ مگر آگ کی سوزش نے ایک دم بے اختیار مٹھی کو کھول دیا اور انگارا ہاتھ سے گر گیا۔ آپ نے اپنی مٹھی جو کھولی تو جلی ہوئی ہتھیلی پہ ایک بڑا سا آبلہ ابھرتا محسوس کیا۔ سوزش نے ان سے صبر و قرار چھین لیا تھا۔

وجدان نے طنزاً کہا: "احمق! تو تو خدا تھا پھر یہ تیری ہتھیلی جل کیوں گئی اور پھر اس میں یہ سوزش کیسی ہے؟"

سرکش نفس پوری طرح زیر ہو چکا تھا۔ آپ سے بولا: "میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں۔"

توکل شاہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی، ورنہ منصور کی طرح بہک جانے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی۔

اب آپ میں وہ باتیں آچکی تھیں جو اپنے عہد کے بڑے بڑے ولیوں اور باکرامت بزرگوں میں پائی جاتی ہیں۔ آپ کے پاس بہ کثرت مریدوں اور ارادت مندوں کا مجمع آنے لگا۔ ان میں مولوی محبوب عالم نامی مرید اور ارادت مند کو آپ کا خاص قرب حاصل تھا۔ آپ ان سے مزے مزے کی باتیں کیا کرتے تھے۔

ان دنوں برصغیر میں شدی سنگھٹن کی تحریک زوروں پر چل رہی تھی آریہ سماجی انفرادی اور اجتماعی کوششوں سے مسلمانوں کو ہندو بنا رہے تھے دردمند مسلمان اس تحریک کو غم و غصے سے محسوس کر رہے تھے۔ لیکھ رام آریہ سماجی ہندوؤں کا سرگرم عالم اور کارکن تھا۔ اس نے کتنے ہی جاہل اور کمزور

عقیدہ مسلمانوں کو ہندو بنا لیا تھا۔ مسلمان اس کے نام تک سے نفرت کرتے تھے۔

لیکھ رام نے ایک دن اپنی تقریر میں رسولؐ اللہ کی شان میں گستاخی کی۔ کسی غیرت مند مسلمان نے مشتعل ہو کر لیکھ رام کو قتل کر دیا۔ اس قتل نے ہندو مسلم فساد کی صورت اختیار کر لی۔ ہندوؤں کا عام خیال یہ تھا کہ اس قتل میں کسی نہ کسی طرح توکل شاہ کا ہاتھ ضرور ہے۔ چنانچہ ہندوؤں نے اپنی ایک خفیہ نشست میں یہ فیصلہ کیا کہ کسی نہ کسی طرح ان فقراء کو ضرور ٹھکانے لگا دینا چاہیئے۔"

یہ سوچ کر لیکھ رام کا ایک چیلا توکل شاہ کی خدمت میں پہنچا اور فرطِ عقیدت سے ان کا پاؤں پکڑ لیا۔ آپ نے فوراً ہی اپنا پاؤں چھڑا لیا اور کہا۔ "یہ کیا کرتا ہے؟ یہ گناہ ہے خود بھی گنہگار ہو رہا ہے اور مجھ کو بھی گنہگار کر رہا ہے۔"

چیلے نے مٹھائی کا ڈبہ آپ کے حوالے کر دیا اور درخواست کی "حضرت! میرا دل رکھ لیجئے ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "بھائی میرے! مٹھائی لے کر کیا کروں گا یہ میرے کس کام کی۔"

چیلے نے مزید اصرار کیا۔ "اچھا اب آپ اگر نہیں کھاتے تو میں اس مٹھائی کو یہاں سے واپس بھی نہیں لے جاؤں گا آپ اپنی طرف سے اس مٹھائی کو اپنے یار دوستوں یا مریدوں میں تقسیم فرما دیں۔"

اس وقت ان کے پاس مولوی محبوب عالم بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے مٹھائی کا ڈبہ مولوی محبوب عالم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "محبوب عالم

یہ مٹھائی رکھ لے کام آئے گی۔"

مولوی محبوب عالم نے ازراہِ عقیدت اور محبت مٹھائی کا ڈبہ پیر مرشد کے ہاتھ سے لے کر اپنی خوابگاہ میں رکھ دیا۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ جب وہ پیرو مرشد کے پاس سے جائیں گے تو مٹھائی کا ڈبہ اپنے ساتھ لیتے جائیں گے چنانچہ جب مولوی محبوب عالم مٹھائی کا ڈبہ لے کر اپنے گھر روانہ ہو گئے تو توکل شاہ نے ان کے پیچھے ایک مرید دوڑایا اور اس کو حکم دیا کہ مولوی جہاں بھی ملے پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔ پہلے اس کے ہاتھ سے مٹھائی کا ڈبہ اپنے قبضہ میں کر لینا اور یہ کہہ دینا کہ اگر راہ میں کوئی مٹھائی دے تو اس سے نہ لینا کیونکہ وہ ایک سازش ہے اس کے بعد کوئی بات نہ کرنا۔"

وہ مرید مولوی محبوب عالم کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑ بھاگ کرنے لگا۔ اس دوران کسی اور نے مولوی محبوب عالم سے کہا، "مولوی صاحب! اپنے بیوی بچوں کے لیے یہ مٹھائی لیتے جانا۔"

مولوی صاحب نے یہ مٹھائی بھی لے لی۔ ابھی وہ چند قدم ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ انہیں کسی کے پکارنے کی آواز سنائی دی۔ یہ رک گئے، مرید دوڑتا ہوا ان کے پاس پہنچ گیا اور کہا، "مولوی صاحب! ذرا رکیے، میری بات تو سنیے!"

مولوی محبوب عالم کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی، ان کے سامنے کیچڑ کی ایک پٹی تھی، انہوں نے اس کو عبور کرنے کے لیے چھلانگ جو لگائی تو پاؤں پھسل گیا۔ وہ کہیں اور گرے اور مٹھائی کیچڑ میں دور دور تک بکھر گئی۔

اب وہ آدمی بھی مولوی محبوب عالم کے سر پہ پہنچ چکا تھا۔ اس نے کہا، "مولوی صاحب! پیرو مرشد نے فرمایا ہے کہ اس مٹھائی کو نہ تو خود کھائیے

اور نہ کسی اور کو کھلائیے۔ یہ مٹھائی مسموم ہے۔"
مولوی صاحب نے جواب دیا "مٹھائی تو کیچڑ میں لت پت پڑی ہے اب اسے کون کھا سکتا ہے۔"

* * * * * * *

انبالہ کے منصف میر امتیاز علی کے خلاف کسی نے ایک فوجداری مقدمہ دائر کر دیا۔ یہ بہت پریشان ہو گئے۔ توکل شاہ کے ایک خاص مرید سید ظہور الدین کی ان سے بڑی دوستی تھی۔ اس دن سید ظہور الدین ظہر کی نماز پڑھ کر قیلولے کے لیے لیٹے ہی تھے کہ منصف انبالہ میر امتیاز علی نے دروازے پر دستک دی۔ ظہور الدین باہر نکلے اور اپنے دوست منصف انبالہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی جو دیکھیں تو پریشان ہو کر پوچھا "کیا بات ہے میر صاحب! آپ کچھ پریشان نظر آتے ہیں۔"

میر صاحب نے فوجداری مقدمہ کی پوری تفصیل دہرا دی۔ اور کہا "سید صاحب! آپ کے پیر و مرشد توکل شاہ کی بزرگی کا بڑا شہرہ ہے خدا کے لیے مجھ کو ان کے پاس لے چلو اور ان سے پوچھ کر بتاؤ کہ کہیں اس مقدمہ میں میں سزا تو نہیں پا جاؤں گا؟"

سید ظہور الدین اسی وقت میر صاحب کو لے کر توکل شاہ کے پاس پہنچ گئے اور انہیں مقدمے کی تفصیلات بتا کر درخواست کی کہ "پیر و مرشد! میر صاحب کو چھڑوا دیجئے۔"

توکل شاہ فوراً ہی مراقبے میں چلے گئے اور کچھ دیر بعد فرمایا "اپنے دوست میر امتیاز علی سے کہہ دو کہ شکایات کے کچھ کاغذات کل تک واپس لے لیے جائیں گے اور انہیں اس پر بڑی شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔"

میر صاحب خوش خوش اپنے گھر چلے گئے اور کچھ دیر بعد فرمایا "اپنے مرید سید ظہور الدین سے پوچھا "سید! وہ تیرا دوست میر امتیاز علی کہاں غائب ہو گیا؟"

سید صاحب نے جواب دیا "پیر و مرشد! اس کو کچھ سکون میسر آگیا ہے اس لیے وہ ادھر کا راستہ بھول گیا"

اور توکل شاہ نے مسکرا کر کہا "یہ اس کی بھول ہے ابھی سکون کہاں حاصل ہوا ہے، جن لوگوں نے اس سے معافی مانگ لی ہے وہی لوگ آج کل دشمن بن کر نقصان پہنچانے آجائیں گے"

سید صاحب چُپ ہو گئے، پانچویں دن امتیاز علی صاحب گھبرائے ہوئے آئے اور توکل شاہ کے قدموں میں بیٹھ گئے اور رو رو کر عرض کیا "شاہ صاحب کل جو دوست تھے، آج دشمن ہو گئے ہیں۔ بتائیے، میں کیا کروں؟"

آپ نے فرمایا "میں نے تو یہ سُنا تھا کہ تجھ کو سکون حاصل ہو گیا ہے"

میر امتیاز نے جواب دیا "وہ میری بھول تھی، خوش فہمی تھی"

آپ نے پوچھا "اب تو کیا چاہتا ہے؟"

اس نے جواب دیا "حضرت! میری عزت آبرو پر بن گئی ہے خدا کے لیے مجھ پر رحم فرمائیں"

آپ کچھ دیر کے لیے مراقبے میں چلے گئے۔ میر امتیاز خاموش بیٹھے توکل شاہ کی صورت دیکھتے رہے۔

آخر مراقبے سے سر اٹھا کر آپ نے فرمایا "ابھی ابھی میں نے تیرے دشمن کو تیرے قدموں میں گرا ہوا دیکھا ہے، جا، اللہ جو کچھ کرے گا بھلا

کرے گا۔"

میرا متیاز کو پھر بھی چین نہیں آیا، آہستہ سے ڈرتے ڈرتے کہا۔"حضرت میں آپ کی ان باتوں سے کیا سمجھوں ؟"

آپ نے فرمایا۔"کیا میں نے یہ نہیں کہہ دیا کہ تیرا دشمن خوار ہوگا۔ تیرے مقدمے میں ایک سکھ کی شرارت تھی اللہ نے اس کو ذلیل کر دیا۔"

اس کے بعد آپ نے میرا متیاز کو چلے جانے کا اشارہ کیا، وہ چلے گئے، مگر دل کی بے قراری اور اضطراب اپنی جگہ برقرار تھے، وہ اٹھ کر چلے تو گئے مگر الجھنوں اور پریشانیوں کو لیے ہوئے۔

کئی دن بعد میرا متیاز کا مقدمہ پیش ہوا اور عدالتی کارروائی شروع ہوگئی۔ آپ کے سارے مخالفین عدالت میں کھڑے ہو کر کہنے لگے۔"میر امتیاز علی! ہم سب شرمندہ ہیں ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ آپ کو ناحق پریشان کیا اب ہم آپ سے معافی چاہتے ہیں۔"

عدالت نے ڈانٹ کر پوچھا۔"اگر تم سب اس پر شرمندہ ہو کر انہیں ناحق پریشان کیا تو یہ بھی بتاؤ کہ وہ شخص کون ہے جس نے تم سب کو اس شرارت پر آمادہ کیا۔ میں اس شخص کو دیکھنا اور جاننا چاہتا ہوں۔"

ان لوگوں نے عدالت کے ایک گوشے میں کھڑے ہوئے سکھ کی طرف اشارہ کیا، کہا۔" وہ رہا، اس نے ہمیں اس پر آمادہ کیا تھا کہ میر امتیاز علی کو .... تنگ کیا جائے۔ چنانچہ ہم نے نادانی اور حماقت میں غلطی کی۔"

عدالت نے حکم دیا۔"اس سکھ کو روک لیا جائے!"

عدالت کے کارندوں نے اس کو پکڑ کر ایک طرف کھڑا کر دیا۔ میر امتیاز نے عدالت سے درخواست کی۔"میں عدالت سے درخواست کروں گا کہ اس

کو معاف کر دیا جائے کیونکہ اس نے اپنی غلطی اور اپنے جرم کا اعتراف کر لیا ہے۔"

عدالت نے سکھ کو حکم دیا۔" تحریری معافی نامہ داخل کیا جائے۔"

سکھ نے تحریری معافی نامہ داخل کر دیا اور جب میرا امتیاز عدالت سے باہر نکلے تو اس سکھ نے ان کے پاؤں پکڑ لیے اور رو رو کر اپنی شرارت کی معافی مانگنے لگا۔ میر امتیاز نے کہا۔" میں تجھ کو اس لیے معاف کر رہا ہوں کہ ہمارے پیر و مرشد توکل شاہ نے ہمیں حکم نہیں دیا ہے کہ تجھ سے تیری شرارت کا بدلہ لیا جائے۔ جا، میں نے تجھ کو معاف کر دیا۔"

جب یہ باتیں توکل شاہ کو معلوم ہوئیں تو آپ نے فرمایا۔" خدا جھوٹوں کو ذلیل کرتا ہے۔"

انہی دنوں پیر جیو عنایت اللہ کو بھی روحانیت میں شہرت حاصل ہو رہی تھی۔ ان کے پاس بھی لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی، یہاں توکل شاہ کا ذکر بھی ہوتا رہتا تھا، ان کے ارادت مند انہیں بڑھاتے چڑھاتے رہتے تھے، مگر پیر جیو انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیتے تھے۔ کسی مرید نے بڑے جوش میں کہا۔ "حضرت! آپ توکل شاہ کو بڑا کہتے ہیں، مگر مجھے تو آپ بڑے نظر آتے ہیں۔"

پیر جیو نے کہا۔" ایسی بات نہیں ہے، توکل شاہ کا مقام بہت بلند ہے، میری تو وہاں کوئی حیثیت ہی نہیں۔"

اتنے میں ایک بڑھیا روتی ہوئی آئی اور عرض کیا۔" حضرت پیر جیو! میری بیٹی کو جن نے تنگ کر رکھا ہے خدا کے لیے میری مدد فرمائیے۔"

پیر جیو نے جواب دیا۔" بڑی بی! اس سلسلے میں تمہیں توکل شاہ کے پاس جانا پڑے گا، کیونکہ جن ان کے نام سے خوف کھاتے ہیں۔"

بڑھیا نے کہا "واہ جی! ہم تو آپ کے پاس آئے ہیں اور آپ ہمیں توکل شاہ کے حوالے کر رہے ہیں میں تو وہاں نہیں جاؤں گی۔"

پیر جیو نے عاجزی سے کہا۔ اگر تو وہاں نہیں جائے گی تو تیری خاطر مجھ کو وہاں جانا پڑے گا۔"

بڑھیا نے حیرت سے پوچھا "کیا توکل شاہ واقعی اتنے بڑے ہیں کہ میرے کام کے سلسلے میں آپ کو وہاں جانا پڑے گا۔"

پیر جیو نے جواب دیا "بی بی! میں نے جو کچھ کہا، اس میں شک و شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔"

بڑھیا سکتے میں آگئی۔ کچھ دیر بعد بولی "تب پھر میں خود توکل شاہ کے پاس چلی جاؤں گی۔"

پیر جیو نے فرمایا "نہیں، مجھ کو ان کے پاس جانے دو۔ تو بعد میں بھی جا سکتی ہے۔"

پیر جیو کو توکل شاہ کے پاس جاتے دیکھ کر ان کے مریدوں کو حیرت ہوئی اور انہیں پہلی بار توکل شاہ کی عظمت اور بزرگی کا احساس ہوا۔

پیر جیو توکل شاہ کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے فرمایا "کیوں عنایت اللہ! تم ہمیں خود کو گھٹا کر بڑھاتے رہتے ہو؟"

پیر جیو نے عرض کیا "حضرت! جو مرتبہ اللہ نے آپ کو بخش دیا اس کو کوئی اور کس طرح گھٹا بڑھا سکتا ہے آپ کو اللہ نے بڑا کیا ہے۔"

پیر جیو کی بات پر آپ مسکراتے رہے۔ پھر پوچھا "بڑھیا کی لڑکی کا کیا حال ہے؟"

پیر جیو نے عرض کیا "حضرت! اس سلسلے میں حاضر ہوا ہوں، بڑھیا

بہت پریشان ہے۔"

آپ نے فرمایا "جاؤ، جن سے کہہ دو، وہ بڑھیا کی بیٹی کو تنگ نہ کرے، یہ بات میرا نام لے کر کہہ دینا۔"

پیر جیو واپس گئے اور بڑھیا کی بیٹی کو خود جا کر دیکھا اس وقت جن آیا ہوا تھا، پیر جیو نے جن سے کہا "جن! آج میں توکل شاہ کے پاس گیا تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ جن سے کہہ دو بڑھیا کی بیٹی کو تنگ نہ کرے۔"

جن نے جواب دیا "واہ جناب! توکل شاہ کے پاس جانے کی کیا ضرورت تھی، میں یوں ہی چلا جاتا۔"

بڑھیا بہت خوش ہوئی مگر دوسرے ہی دن وہ دوبارہ پیر جیو کے پاس پہنچی اور عرض کیا "پیر جیو جی وہ جن تو پھر آگیا اور میری بیٹی کو تنگ کر رہا ہے۔"

پیر جیو دوبارہ توکل شاہ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا "شاہ صاحب! جن دوبارہ آگیا۔"

توکل شاہ نے مسکرا کر کہا "جن کو میرا سلام پہنچاؤ اور کہو یہ بری بات ہے لڑکی کو تنگ نہ کرے اور مجھ کو غصہ نہ دلائے۔"

پیر جیو نے توکل شاہ کا پیغام جن کو دوبارہ پہنچا دیا، جن نے کہا "پیر جیو جی! آپ بھی خوب ہیں، بار بار توکل شاہ کے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں یونہی چلا جاتا ہوں ان کا نام لے لینا ہی کافی ہے۔"

یہ کہہ کر جن چلا گیا لیکن تیسرے دن پھر آگیا۔ پیر جیو جی جن کی شکایت لے کر پھر حاضر ہوئے اور کہا "حضرت! اس جن نے تو بہت تنگ کر رکھا ہے۔"

توکل شاہ نے غصے میں فرمایا "اچھا تو وہ پھر آگیا۔" ان کے پاس ہی

ان کے مرید اور خلیفہ امیر اللہ بیٹھے تھے، توکل شاہ نے اپنا ڈنڈا اٹھا کر ان کے حوالے کر دیا اور حکم دیا "امیر اللہ جاؤ اس جن کو ڈنڈے مار مار کر بھگا دو۔"

امیر اللہ ڈنڈا لے کر بڑھیا کی بیٹی کے پاس پہنچ گئے اور ڈنڈے سے اس کی پٹائی شروع کر دی جن شور کرتا رہا اور چلّاتا رہا کہ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو، مجھ کو معاف کر دو، میں آئندہ یہاں نہیں آؤں گا۔"

امیر اللہ نے کہا "میں کس طرح یقین کر لوں کہ تو جو وعدہ کر رہا ہے اس پر پورا بھی اترے گا۔"

جن نے جواب دیا "اگر میں جھوٹا عہد کروں گا تو یہ ڈنڈا کل بھی آپ کے پاس ہوگا، آپ کل بھی اس طرح سزا دے سکیں گے۔"

امیر اللہ نے ہاتھ روک لیا اور کہا "اچھا اب تو بھاگ جا! خبردار جو پھر کبھی اس لڑکی کو پریشان کیا۔"

جن چلا گیا، لڑکی ہوش میں آگئی وہ بہت کمزور ہو گئی تھی، اپنے سامنے امیر اللہ کو دیکھ کر حیا سے سمٹ گئی اور اپنی ماں سے پوچھا "یہ کون بزرگ ہیں؟"

ماں نے جواب دیا "بیٹی! یہ توکل شاہ کے مرید اور خلیفہ ہیں تیرے جن کو اتارنے آئے تھے۔"

اس کے بعد امیر اللہ کے ڈنڈے کی یہ خاصیت مشہور ہو گئی کہ جس پر بھی آسیب کا یا جن کا اثر ہوتا امیر اللہ کے ڈنڈے کی ضرب اسے اتار دیتی یہاں تک کہ دور دور سے جوق در جوق لوگ آنے لگے۔ امیر اللہ تنگ آگئے انہوں نے اپنے پیر و مرشد توکل شاہ سے درخواست کی کہ خدا کے لیے اس مصیبت سے نجات دلائیے کیونکہ میں اس خدمت کے بعد کوئی کام نہیں کر سکتا۔

توکل شاہ نے وہ ڈنڈا واپس لے لیا، اور امیر اللہ کی اس سے جان چھوٹی۔

آپ اپنے مریدوں کے سامنے مختلف قرآنی نکات پر باتیں کر رہے تھے، مریدوں میں نہایت لائق و فائق اور عالم فاضل لوگ بھی موجود تھے آپ نے اچانک ان سے سوال کیا "لوگو قرآن پاک میں ایک جگہ آیا ہے کہ اللہ ہر شئے پر قدیر ہے اور دوسری جگہ یوں ہے کہ اللہ ہر شئے پر محیط ہے۔ کیا تم میں ایک شخص بھی ایسا موجود ہے جو قدیر اور محیط کے فرق پر روشنی ڈال سکے؟"

مولوی سراج الدین نے عرض کیا "حضور مجھ کو کیا خبر ہے"

توکل شاہ نے کہا "سراج الدین تم مولوی ہو"

مولوی سراج الدین نے کہا "پیر و مرشد! اس سوال کا تعلق تصوف سے ہے نہ کہ علم ظاہر سے۔ آپ ہی اس کا صحیح جواب دے سکتے ہیں"

آپ مسکرائے فرمایا "قدیر کا تعلق ہے اس کی ذات سے اور محیط کا تعلق ہے اس کی صفات سے۔ چنانچہ مراتبۂ قدیر اعلیٰ درجے کا ہے بمقابلہ مراتبۂ محیط کے"

مولوی سراج الدین اور دوسرے شریکِ مجلس اس مختصر تشریح سے بہت محظوظ ہوئے، انہیں اعتراف تھا کہ پیر و مرشد نے قدیر اور محیط کی تعریف میں، سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے"

اسی طرح ایک دن آپ دو رالہ مسجد میں اپنے مریدوں پر توجہ فرما رہے تھے۔ مریدوں کی نظریں بار بار سامنے کی خانقاہ کی طرف جاتی تھیں۔ آپ نے کسی سے پوچھا "یہ کس کی خانقاہ ہے؟"

کسی مرید نے جواب دیا "شاہ ملک شہید کی"

آپ نے فرمایا "کسی نے کبھی شاہ ملک شہید کو دیکھا ہے یا یونہی !"

ایک مرید نے جواب دیا "جی ہاں پیر و مرشد اسے دیکھا بھی ہے، بے سر کا لاشہ، خون میں لت پت۔ واقعی مجھ کو تو بہت ڈر لگتا ہے۔"

آپ نے انہیں حکم دیا "تم سب اپنی اپنی آنکھیں بند کر لو، تاکہ تم لوگوں نے جو کچھ نہیں دیکھا، اسے بھی دیکھ لو۔"

مریدوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیر بعد دریافت کیا "کچھ دکھائی دیا؟ شاہ ملک شہید نظر آیا؟"

مریدوں نے بیک آواز جواب دیا "حضور والا ! ہم سب اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھ رہے ہیں اس کو اگر بیان کریں تو کسی کو یقین نہ آئے !"

آپ نے فرمایا "جب تم سب ایک ہی منظر دیکھ رہے ہو تو بیان کرنے میں کیا حرج ہے اور کون ہے جو اس پر یقین نہیں کرے گا۔"

ایک مرید نے عرض کیا "حضرت ! میں اپنے سامنے ایک بے سر کا لاشہ دیکھ رہا ہوں۔ خون میں لتھڑا ہوا۔ شاید یہ شاہ ملک شہید کا لاشہ ہے۔ ان کے ساتھ بہت سے سوار بھی ہیں۔ ملک شہید کے ہاتھ میں ایک برچھا بھی ہے، اس برچھے سے وہ جنگ میں مصروف ہیں۔ ان کے جسم سے خون جاری ہے۔"

آپ نے انہیں حکم دیا "اچھا بس، اب چپ ہو جاؤ اور اپنی آنکھیں کھول دو، خبردار جو کسی اور کو یہ سب بتایا۔"

✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤

آپ نے ایک دن اپنے حاضرین میں ایک عورت کو بیٹھے دیکھا۔ یہ عورت اپنی وضع قطع سے ہندو معلوم ہوتی تھی۔ آپ نے اس کو اپنے پاس بلایا

اور پوچھا "کیا بات ہے تو یہاں مردوں میں بیٹھی کیا کر رہی ہے؟"

عورت رونے لگی۔ بولی "میاں جی! میں مسلمان نہیں ہوں، ہندو ہوں۔ میں نے آپ کی بہت تعریفیں سنی ہیں۔ بس اس لیے آ گئی ہوں ایک مصیبت میں گرفتار ہوں آپ کی مہربانی اور دُعا درکار ہے۔"

آپ نے فرمایا "سیدھی سیدھی بات کر، پہیلیاں نہ بجھا۔"

عورت نے کہا "میاں جی! میرا لڑکا اندھا ہے اس کو روشنی دلا دو۔"

آپ نے جواب دیا "عورت! میں کوئی طبیب تو ہوں نہیں۔ کسی حکیم کے پاس جا۔ وہی اس کا علاج کر سکتا ہے۔ ہم فقیروں کے پاس کچھ بھی نہیں۔"

عورت نے عرض کیا "حضرت! میں اتنا علاج کرا چکی ہوں کہ اب علاج کا اعتبار ہی جاتا رہا۔ میں تو آپ کی دعا لے کر واپس جاؤں گی۔"

آپ نے فرمایا "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ میں تیرے بیٹے کے حق میں دعائے خیر کروں، ورنہ تو دل شکستہ اور آزردہ رہے گی۔"

عورت نے اپنے بیٹے کو سینے سے لگا لیا اور اپنے گھر کے لیے روانہ ہو گئی، اس کا لڑکا اس کے ساتھ بڑی تیزی سے چلتا رہا۔ ایک جگہ کسی پتھر سے ٹھوکر کھائی اور زمین پہ گر گیا، ماں نے لپک کر اس کو اٹھایا مگر لڑکے کی غیر معمولی حالت دیکھ کر اس سے پوچھا "کیا بات ہے بیٹے! میرا خیال ہے کہ تیری بینائی واپس آ چکی ہے۔"

لڑکے نے اپنی دونوں آنکھیں ملیں۔ پھر کھول دیں، خوشی سے چلّایا۔ "آہا ہا میری آنکھیں کام کرنے لگیں میری بصارت واپس آ گئی۔"

عورت نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو لڑکے کے سامنے کر دیا، اور پوچھا۔ "بتا تو سہی کتنی انگلیاں ہیں؟"

لڑکے نے صحیح صحیح جواب دے دیا، ماں چیختی چلاتی ایک بار پھر توکل شاہ کے پاس پہنچی اور پورا واقعہ سنا کے بولی "میاں جی میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میرے لڑکے کی بینائی واپس آجائے گی"

آپ نے جواب دیا" بینائی تو اللہ نے دی ہے۔ میں کیا۔ کچھ بھی نہیں، یاد کر ٹھوکر ہی سے اس کی بینائی گئی تھی ٹھوکر ہی سے واپس آگئی"

ہندو عورت نے بہت سوچا تو یاد آگیا کہ ایک روز اس کا بیٹا ٹھوکر کھا کے گرا تھا تو اس کی بینائی جاتی رہی تھی اب وہ ٹھوکر ہی سے واپس آچکی ہے"

اس واقعہ کا دور دور تک شہرہ ہوا۔

ابھی وہ ہندو عورت رخصت ہی ہوئی تھی کہ ایک دس گیارہ سال کا لڑکا آپ کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ آپ نے اس لڑکے کو بغور دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کی۔

لڑکے نے عرض کیا" پیر و مرشد! آپ مجھ کو نہیں پہچان سکیں گے، کیونکہ میں کانپور سے آیا ہوں، میں یہاں کا مقامی نہیں ہوں"

آپ نے فرمایا" بیٹے خیریت تو ہے، کہو کیسے آنا ہوا؟

لڑکا رونے لگا بولا" باباجی! میں کسی ہندو کا بیٹا نہیں ہوں، مسلمان ہوں، میرا باپ آپ کا مرید ہے اس کو سزائے موت کا حکم سنایا جا چکا ہے۔ بس دس پندرہ دن باقی رہ گئے ہیں"

اس کے آگے وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ آپ کے دل پہ اس کا بڑا اثر ہوا، پوچھا" تو کیا چاہتا ہے؟ صاف صاف بتا"

لڑکے نے جواب دیا" اپنے باپ کی زندگی۔ بس، اور کچھ نہیں"

آپ نے کوئی جواب نہ دیا اور منہ پھیر کر کسی اور سے بات کرنے لگے،

لڑکے کو بہت دکھ پہنچا، اس نے بآواز بلند کہا "باباجی! میں اس وقت تک یہاں سے نہیں ٹلوں گا جب تک کہ میرا باپ چھوٹ نہیں جاتا۔"

توکل شاہ نے ناگواری سے فرمایا "یہ کیسی ضد ہے۔ میں کیا کروں؟"

لڑکے نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "مجھے نہیں معلوم کہ آپ کیا کریں گے؟"

آپ پھر چپ ہو گئے۔ اس بات کو کئی دن گزر گئے۔

ایک شب، نصف رات کے بعد آپ نے لڑکے سے کہا "ذرا میرے ساتھ چل۔"

لڑکا چپ چاپ ان کے ساتھ ہو لیا۔ چند مریدوں نے بھی رفاقت کا شرف حاصل کیا۔ آپ انبالہ کے ایک نامی گرامی تالاب کے کنارے جا کھڑے ہوئے، فرمایا "جب تک میں پانی کے اوپر سر نہ نکالوں، تم لوگ کہیں جانا مت۔"

آپ نے یہ کہا اور تالاب میں غوطہ لگا گئے۔ یہ لوگ دو گھنٹے تک آپ کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ کسی نے تشویش ظاہر کی "شاہ جی واپس بھی آئیں گے کہیں یا ڈوب کر ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے۔"

ابھی یہ بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ شاہ صاحب پانی کی سطح پر نمودار ہو گئے، لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

آپ نے لڑکے کو اپنے قریب بلا کر فرمایا "جا اپنے باپ کے پاس واپس جا، وہاں ایک غلطی پر اس کو سزائے موت سنائی گئی تھی، میں نے اس غلطی کو دور کر دیا ہے۔"

لڑکے کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی لیکن مریدوں نے لڑکے کو سمجھایا کہ تو فوراً کانپور واپس جا اللہ بھلی کرے گا۔

جب یہ لڑکا اپنے گھر کانپور پہنچا تو اپنے باپ کو گھر میں موجود دیکھا لڑکے کی آنکھ میں آنسو آ گئے۔ باپ نے اس کو اپنے پاس بٹھا کر پوری تفصیلات سنیں، لڑکے نے جواب دیا اور آخر میں کہا "باوا جان! میاں جی نے آپ کو آزاد کرا دیا۔ ان کا شکریہ ادا کرنے انبالہ چلے چلیے"

باپ کو کیا انکار ہو سکتا تھا جب یہ دونوں آپ کے سامنے پہنچے تو شاہ صاحب نے مسکرا کر لڑکے کے باپ سے کہا "تم نے اپنے بیٹے سے پوچھا نہیں کہ وہ سزائے موت کے فیصلے کو کیا ہو گیا؟"

باپ نے جواب دیا "بابا جی! یہ بچہ ان باتوں کو کیا جانے، بہرحال جو کچھ ہوا، معجزہ ہو گیا"

آپ نے فرمایا "اچھا اب اپنے رب کا شکریہ ادا کر"

یہ شخص، دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا رہا۔

کہتے ہیں ان کے بیسیوں واقعات ہیں جنہیں محفوظ رکھا گیا ہے اور ان سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ آپ نے لوگوں کو ہر قسم کا فیض پہنچایا۔ ظاہری، باطنی، عقلی نقلی، جب آپ وعظ فرماتے تو فصاحت اور حکمت کے دریا بہا دیتے۔

آخری عمر میں آپ کو اسہال کی شکایت ہو گئی تھی۔ جس نے آپ کو کمزور کرنا شروع کر دیا۔ آپ کے مریدوں میں اضطراب پیدا ہو گیا اور دوا علاج ہونے لگا۔ اسہال کی زیادتی نے اتنا کمزور کر دیا کہ غشی کے دورے پڑنے لگے۔ ہوش میں آتے اور مریدوں کو روتے دیکھتے تو فرماتے "روتے کیوں ہو مجھ کو کیا ہو گیا، میں تو تم میں موجود ہوں ابھی"

مرید جواب دیتے۔ "ہم سے آپ کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی"

آپ مسکرا کر فرماتے۔ "اگر نہیں دیکھی جاتی تو رونے کی بجائے میرے

حق میں دعا کیا کرو، اللہ کو انسان کی عاجزی اور گریہ زاری بے حد پسند ہے۔"

مریدوں نے دعائیں شروع کر دیں۔ ۴ ربیع الاول ۱۳۱۵ھ بروز بدھ آپ کی حالت زیادہ بگڑ گئی۔ اس حال میں بھی نماز اشاروں میں ادا فرماتے رہے۔

بے ہوشی کے غلبے سے نکلے تو پوچھا "کیا وقت نماز ہے؟"

کسی نے روتے ہوئے جواب دیا "نہیں!"

آپ نے پھر پوچھا "کیا وقت مراقبہ ہے؟"

جواب ملا "ہاں!"

آپ کو حبس دم کی عادت تھی، ایک بار حبسِ دم کیا، ہوش میں آ گئے دوبارہ حبس دم کیا۔ پھر ہوش میں آ گئے۔ تیسری بار حبس دم کیا تو سانس واپس نہیں آئی اور اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

انبالے میں ایک قیامت برپا ہو گئی۔ ایک کہرام مچ گیا۔ آپ کے ماتم گساروں میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی۔ امرا بھی تھے اور غربا بھی تھے، بازار اُجڑ گئے۔ گلیاں سُنسان ہو گئیں۔

کہتے ہیں ایک بار کسی نے آپ کو "سیّد" لکھ دیا تھا۔ آپ نے اس کو منع کر دیا تھا کہ میں سیّد نہیں ہوں، مجھ کو آئندہ سید نہ لکھنا حالانکہ آپ کو توکل شاہ کہا جاتا ہے اور یہ کمال کی بات ہے کہ ان کے اصل نام کا کسی کو بھی علم نہیں۔ پوری زندگی اسم بامسمیٰ گزار دی۔ توکل شاہ، توکل و قناعت کے جیتے جاگتے نمونہ تھے۔

جنید بغدادی

ایران کے صوبہ جبال میں شہر نہاوند کو اس حیثیت سے غیر معمولی شہرت حاصل ہے کہ یہاں کی سرداری پر ابوبکر شبلیؒ فائز رہ چکے تھے اور جنید بغدادی کا خاندان یہیں سے ہجرت کر کے بغداد پہنچا تھا۔ جنیدی خاندان میں سب ہی تاجر تھے۔ جنید کے والد شیشے کے پیالوں کا کاروبار کرتے تھے۔ خود جنید خام ریشم کی سوداگری کرتے تھے اور ان کے ماموں سری سقطی مسالہ فروش تھے بغداد میں جنید ۲۱۰ھ میں پیدا ہوئے۔

تاجر باپ اپنے کمسن بیٹے جنید کی ذہانت اور فراست سے لاعلم دین اور دنیا کے کاموں میں مشغول تھا۔ شعائر دینی کی انجام دہی میں باپ نہایت محتاط اور مستعد تھا۔ ان دنوں برادر نسبتی سری سقطی کی کاروباری حالت سقیم تھی۔ جنید کے والد نے سال بھر کا مالی حساب کر کے زکوٰۃ کی رقم نکالی اور سوچنے لگے کہ یہ رقم کس مستحق کو پہنچائی جائے۔ انہیں اچانک سری سقطی کا خیال آگیا۔ سری سقطی زہد و تقوے اور علمی فضیلت میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ جنید کے والد زکوٰۃ میں سے کچھ رقم لے کر ان کی خدمت میں پہنچ گئے اور ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ "بھائی! مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ ان دنوں کچھ پریشان ہیں

اور کاروبار میں خسارہ نے آپ کی کمر توڑ دی ہے۔ کیا یہ درست ہے؟"

سری سقطی نے خجل ہو کر جواب دیا "میں یہ رقم نہیں لے سکتا۔"

جنید کے والد نے پوچھا "زکوٰۃ کے مسئلے میں اگر یہ نہ ہوتا کہ پہلے اپنوں میں اس کے مستحقین تلاش کرو تو میں آپ کے پاس ہرگز نہ آتا۔"

سری سقطی نے منہ دوسری طرف پھیر لیا، بولے "میں رقم نہیں لوں گا۔"

وہ مایوس ہو کر باہر نکلے اور انہیں اپنے پیر مَن مَن بھر کے محسوس ہونے لگے۔ ان کو سری سقطی کی حالتِ زار کا خوب اچھی طرح علم تھا۔ ان کی گھر واپس جانے کی ہمت جواب دے گئی تھی، سَر پکڑ کر سرِ راہ بیٹھ گئے۔ حساس دل نے ان کی آنکھوں تلے تاریکی کی سیاہ چادر تان دی۔ یہ سڑک کے کنارے بیٹھ کر رونے لگے، ان کی ہچکیاں بندھ گئیں، سری سقطی نے باہر نکل کر انہیں روتے دیکھا اور گھبرا کے اندر واپس چلے گئے۔ راہ گیر انہیں روتا دیکھ کر خاموشی سے گزرتے رہے۔ مکتب کی چھٹی ہو چکی تھی۔ سات آٹھ سالہ جنید بھی کتاب والے مکتب سے نکلنے اور راہِ و قطار روتے ہوئے باپ کے پاس سے گزرے۔ بیٹے نے باپ کو پہچان لیا۔ ادب سے باپ کے روبرو پہنچے اور چُپ چاپ باپ کی حالت پر غور کرنے لگے۔ آخر پاس بیٹھ کر باپ کا ہاتھ پکڑ لیا اور پوچھا "باوا جان آپ رو کیوں رہے ہیں؟ خیریت تو ہے؟"

دین دار باپ نے حسرت سے بیٹے کی طرف دیکھ کر جواب دیا "بیٹے جنید! تو ابھی ان باتوں کو نہیں سمجھ سکے گا جن کے کرب نے مجھے رونے پر مجبور کر دیا ہے۔"

جنید نے اصرار کیا "باوا جان! کچھ بتائیے تو سہی، ممکن ہے میں آپ کی کوئی مدد کر سکوں۔"

باپ نے بیٹے کو کچھ لمحے بغور دیکھا، پھر پورا واقعہ سنا کے افسوس سے کہا۔ "بیٹے جنید! میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تیرے ماموں نے زکوٰۃ کی رقم نہ لے کر اپنے آپ پر بھی ظلم کیا ہے اور ہم سب پر بھی، کیونکہ سری سقطی کی مصیبت ہماری اپنی مصیبت ہے۔ اگر سری سقطی پریشان ہوں گے تو ہم سب بھی پریشان ہوں گے، وہ خوش ہوں گے تو ہم بھی خوش ہوں گے۔"

سات آٹھ سالہ جنید نے عزم و استقامت سے کہا۔ "باوا جان! وہ رقم میرے حوالے کیجئے میں ابھی ماموں کے حوالے کر کے واپس آتا ہوں۔"

باپ نے افسوس سے کہا۔ "جس شخص نے تیرے باپ کی بات نہیں مانی وہ تیری بات کس طرح مان لے گا؟"

بیٹے نے اسی عزم سے کہا۔ "اس کی آپ فکر کیوں کریں۔ آپ وہ رقم مجھے دیجیے تو سہی اور یہیں میرا انتظار فرمائیں۔"

باپ نے بے یقینی کی کیفیت سے وہ رقم جنید کے حوالے کر دی۔ جنید سیدھے ماموں کے دروازے پر پہنچ گئے۔ وہ دروازہ اندر سے بند تھا جنید نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے سری سقطی نے سوال کیا۔ "کون ہے؟"

جنید نے جواب دیا۔ "آپ کا بھانجا جنید، دروازہ کھولیے!"

سری سقطی نے بے نیازی سے پوچھا۔ "کس لیے آئے ہو؟"

جنید نے کہا۔ "دروازہ تو کھولیے اندر آ کے جواب دوں گا۔"

سری سقطی نے اپنے معصوم بھانجے کی آواز پر دروازہ کھول دیا۔ یہ اندر داخل ہو گئے۔ ان کے ہاتھ میں زکوٰۃ کی رقم کی تھیلی تھی۔ سری سقطی نے تھیلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "یہ کیا ہے؟"

جنید نے جواب دیا۔ "زکوٰۃ کی رقم ہے اور اسے میں آپ کے لیے لایا ہوں۔"

سری سقطی نے غصے میں کہا۔ "جنید! کیا تمہارے باپ نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ میں نے یہ رقم لینے سے پہلے ہی انکار کر دیا ہے؟"

جنید نے کہا۔ "مجھے سب کچھ معلوم ہے اور میں اس کے باوجود یہ رقم آپ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا ہوں۔"

سری سقطی نے نفرت سے کہا۔ "میں یہ رقم نہیں لے سکتا، اسے واپس لے جاؤ۔"

جنید نے جوش سے کہا۔ "ماموں جان! قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ پر فضل اور میرے باپ کے ساتھ عدل کیا ہے۔ یہ رقم آپ کو لے لینی چاہیئے۔ اگر آپ اس قسم کے بعد بھی یہ رقم نہیں لیتے تو آپ کو اختیار ہے میرے والد کو یہ حکم ملا تھا کہ وہ زکوٰۃ کی رقم اس کے مستحق کو پہنچا دیں، انہوں نے حکمِ خداوندی کی تعمیل کر دی۔ اب وہ بری الذمہ ہو چکے ہیں۔"

سری سقطی نے حیرت سے اپنے ذہین اور کمسن بھانجے کو دیکھا اور فرطِ محبت میں اپنے سینے سے لگا لیا۔ بولے۔ "جنید! میں زکوٰۃ کی رقم سے پہلے تجھے قبول کرتا ہوں، اب تو میرے پاس ہی رہے گا۔"

جنید نے جواب دیا۔ "میں آپ ہی کے ساتھ رہوں گا لیکن والد صاحب کے پاس تو ہو آنے دیجئے، اس کے بعد آجاؤں گا۔"

ماموں نے اجازت دے دی۔ یہ سرِ راہ بیٹھے ہوئے باپ کے پاس پہنچ گئے۔ باپ نے بے چینی سے پوچھا۔ "کیا ہوا بیٹے؟ کیا وہ تھیلی تیرے ماموں نے قبول کر لی ہے؟"

بیٹے نے جواب دیا۔ "جی ہاں باوا جان۔ نہ صرف تھیلی بلکہ تھیلی سے پہلے

مجھے قبول کر لیا۔"
اس کے بعد انہوں نے پورا واقعہ سنا کے عرض کیا "اب آپ بھی مجھے ان کے ساتھ رہنے کی اجازت عطا فرمادیں کیونکہ میں ان سے وعدہ کر آیا ہوں کہ آپ سے اجازت لے کر واپس آرہا ہوں۔"
باپ کو ہاں، کہنے میں تامل ہوا لیکن یہ دیکھ کر کہ بیٹا خود جانے کو آمادہ ہے۔ جنید کو ماموں کے پاس رہنے کی اجازت عطا کر دی۔ بولے۔ "سری سقطی کے علم و فضل کا کوئی ٹھکانا ہے، خدا تجھے بھی سری سقطی جیسا علم اور زہد و تقویٰ عطا فرمائے!" جنید ماموں کے پاس چلے آئے اور انہیں کے ہو رہے۔
سری سقطی انہیں تعلیم و تربیت دینے لگے۔ ان دنوں لوگ حج کرنے جا رہے تھے، جنید سے کہا "جنید بیٹے! کیا تم بھی میرے ساتھ حج پر جانے کو آمادہ ہو؟"
جنید نے جواب دیا "جب میں آپ کے قدموں میں زندگی گزارنے آہی گیا ہوں تب پھر آپ جہاں بھی لے جانا چاہیں گے میں بے چوں و چرا چلا جاؤں گا۔"
سری سقطی ہنستے ہوئے بولے "جنید! تم سے مجھے اسی جواب کی توقع تھی۔"
یہ حجاج کے قافلے میں شامل ہو کر مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ اس وقت ان کی عمر بمشکل آٹھ سال کی رہی ہوگی۔ مکہ معظمہ میں حج سے فراغت کے بعد آپ نے ایک جگہ چند درویشوں کو مصروف گفتگو دیکھا۔ وہ سب شکر کے مسئلہ پر گفتگو کر رہے تھے۔ سری سقطی بھی اس بحث کو سنتے رہے۔

آخر میں انہوں نے درویشوں کو مخاطب کیا۔ بولے "کیا تم میں سے ایک بھی ایسا ہے کہ شکر کے مسئلہ پہ کوئی تقریر کر سکے ؟"

درویشوں نے بیک زبان کہا "شاید نہیں، ہمارا علم اور شعور آپ سے کمتر ہی ہے۔"

آپ نے نظر بھر کے آٹھ سالہ جنید کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا۔ "جنید! شکر کے مسئلے پہ تقریر کرو۔"

جنید نے فرمانبرداری سے سر جھکا دیا اور تقریر کرنے لگے۔ جنید نے کہا "شکر کی تعریف یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی انسان کو کوئی نعمت عطا کرے تو اس نعمت کے شکرانے میں اپنے مالک کی نافرمانی نہ کرے۔ یہی شکر ہے!"

درویشوں نے اس خوبصورت فیصلے کو بہ دل و جان قبول کر لیا۔ اس دوران سری سقطی نے سوال کیا "بیٹے جنید! تم نے ایک دن یہ کہا تھا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ پہ فضل اور میرے باپ کے ساتھ عدل کیا۔ میں اس بات کی تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔"

جنید نے جواب دیا "ماموں جان! مطلب صاف ہے۔ خدا نے آپ پر فضل کیا، کا یہ مطلب ہے کہ اس نے آپ کو درویشی اور ترکِ دنیا عطا فرمائی اور میرے باپ سے عدل اس طرح کیا کہ انہیں دولتِ دنیا سے مالا مال کر ڈالا۔"

سری سقطی نے خوشی سے جنید کو گلے سے لگا لیا، بولے "خدا تجھے نظرِ بد سے بچائے۔ تو اتنی ذرا سی عمر میں کیسی عقلمندی کی باتیں کرتا ہے۔"

جنید ایک مدت تک ماموں سری سقطی سے تربیت حاصل کرتے رہے

اس دوران انہوں نے فقہ اور حدیث کی تعلیم مکمل کر لی تھی، لیکن وہ مزید تعلیم کی حصولیابی کے لیے بے چین تھے۔ ماموں کے پاس سے رخصت ہونے لگے۔ سری سقطی نے دریافت کیا "جنید! اب کس کی مجلس میں جانے کا ارادہ ہے؟"

جنید نے جواب دیا "حارث المحاسی کی مجلس میں"

سری سقطی نے کہا "جاؤ اور اس سے بھی علم حاصل کر لو۔ لیکن کیا تمہیں یہ معلوم ہے کہ وہ معتزلی ہے اور نظری بحث و استدلال میں الجھا رہتا ہے"

جنید نے جواب دیا "ہاں میں اس بات سے واقف ہوں"

"بس تو پھر اس کے معتزلی افکار و نظریات سے بچے رہنا"

اس کے بعد جب جنید وہاں سے جانے لگے تو سری سقطی نے انہیں دعا دی "جنید! میں خدا سے دعا کر رہا ہوں کہ وہ تمہیں صوفی محدث بنائے اور محدث صوفی بننے سے محفوظ رکھے"

بعد میں کسی نے جنید سے پوچھا "آپ کے ماموں کا اس سے کیا مطلب تھا؟"

جنید نے جواب دیا "اس سے ماموں کا یہ مقصد تھا کہ میں حدیث اور سنت کو مقدم سمجھوں اور زہد و اتقا کو موخر جانوں۔ کیونکہ حدیث اور سنت کے صحیح علم کے بغیر زہد و اتقا کی ریاضت اپنے صحیح اثر سے محروم رہتی ہے"

جنید نے سری سقطی کے بعد حارث محاسبی اور ابو سفیان ثوری سے درس و تربیت حاصل کی۔ جنید فرمایا کرتے تھے۔ "جس شخص نے قرآن حفظ نہیں کیا اور باقاعدہ طور پر حدیث بھی نہیں پڑھی اور فقہ کا علم بھی نہیں حاصل

کیا ان تینوں کے فقدان میں وہ تصوف کی طرف بھی مائل ہو گیا تو یہ سمجھو کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جسے کسی بھی رہنمائی کا حق نہیں حاصل ہو سکتا۔"

تعلیم و تربیت سے فراغت حاصل کر چکنے کے بعد جنید پھر ماموں سے ملے تو سری سقطی نے انہیں حکم دیا۔"جنید! اب تم علوم ظاہر و باطن کی تکمیل کر چکے ہو، اس لیے اس کا اظہار بھی ہونا چاہیئے، یعنی تمہیں وعظ و نصیحت شروع کر دینا چاہیئے۔"

لیکن جنید نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ کہا۔" میں آپ کی موجودگی میں وعظ و نصیحت کے لیے زبان نہیں کھول سکتا اسے میں گستاخی تصوّر کرتا ہوں۔"

سری سقطی نے کہا۔" یہ گستاخی نہیں، دین کی خدمت ہو گی۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم وعظ و تلقین شروع کر دو۔"

لیکن جنید نے ان کا یہ حکم نہیں مانا۔

اس بات کو کئی دن گزر گئے۔ ایک رات جنید انتہائی گہری نیند سوئے ہوئے تھے کہ خواب میں رسول مقبولؐ کو دیکھا۔ آپ جنید کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ جنید آپ کی نگاہوں کی تاب نہ لا سکے۔ گردن جھکالی اور ادب سے سوال کیا۔"یارسولؐ اللہ کیا مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہے؟"

آپؐ نے جواب دیا۔" نہیں تو۔ تو وعظ کیوں نہیں کہتا جنید؟"

جنید نے عاجزی سے کہا۔"یارسولؐ اللہ! میں اپنے ماموں سری سقطی کی موجودگی میں لب کشائی کی ہمت نہیں محسوس کرتا۔"

آپؐ نے فرمایا۔" جنید! خدا نے تمہاری زبان میں بڑی تاثیر رکھی ہے میں تم سے کہتا ہوں کہ تم وعظ و نصیحت کا سلسلہ شروع کر دو۔ خدا بھی

یہی چاہتا ہے۔"

صبح کی نماز سے فراغت کے بعد یہ سیدھے اپنے ماموں کے پاس پہنچے سری سقطی مکان کے باہر دروازے پہ کھڑے گویا ان کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے استقبال کے لیے چند قدم چل کر اپنے بھانجے سے کہا۔

"جنید! کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ لوگوں سے کلام کرو لیکن تم ہمیشہ منع کرتے رہے لیکن اب کس طرح انکار کرو گے، کیا رسول اللہؐ کے ارشاد کے بعد بھی تم میں انکار کی ہمت ہے؟"

جنید نے حیرت سے پوچھا "آپ کو رسول اللہؐ کے ارشاد کے سلسلے میں کیونکر علم ہوا؟"

سری سقطی نے جواب دیا "جب رسول اللہؐ تم سے کلام کرنے کے لیے ارشاد فرما رہے، میں وہیں موجود تھا" پھر ذرا ٹھہر کر کہا "تیری زبان میں بڑا اثر ہے جنید۔ خدا تجھ سے بڑے کام لے گا۔"

جنید نے شرمسار لہجے میں کہا "مجلس کا اہتمام کیجئے، میں ان سے کلام کرنا چاہتا ہوں۔"

سری سقطی نے ایک مجلس منعقد کی، جس میں چالیس آدمی جمع ہوئے جنید نے انہیں مخاطب کیا اور دیر تک وعظ فرماتے رہے۔ پوری مجلس وجد و حال میں مبتلا ہو گئی۔ ان کے دلوں میں آگ سی لگ گئی۔ دیوانوں کی طرح سر پٹکنے لگے۔ گریبان چاک کر لیے اور ہوش و خرد کی ساری علامتیں ان سے چھن گئیں۔ پوری مجلس بے ہوش ہو گئی۔ سری سقطی کھڑے ہو گئے۔ ہاتھ کے اشارے سے جنید کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا۔ جنید خاموش ہو گئے۔

سری سقطی مجلس کے ہر بے ہوش شخص کے پاس گئے اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی، کئی گھنٹوں کی جدوجہد کے بعد یہ معلوم ہوا کہ چالیس میں سترہ نوجوان بحق ہو چکے ہیں اور بقیہ تیئیس اپنے ہوش و حواس کھو چکے ہیں اور انہیں اللہ بس باقی ہوس کے علاوہ کچھ یاد ہی نہیں۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

جنید کی شہرت پھیلتی چلی گئی۔ جتنی جتنی آپ کی شہرت بڑھی دوسرے ہم عصر ماند پڑنے چلے گئے۔ کسی نے سری سقطی سے پوچھا۔

"حضرت! کیا کسی مرید کا مرتبہ اپنے مُرشد سے بڑھ سکتا ہے؟"

سری سقطی نے جواب دیا "ہاں ایسا ممکن ہی نہیں بلکہ یہ واقعہ ہے تم جنید ہی کو دیکھ لو۔ وہ میرا مرید ہے لیکن وہ مرتبے میں مجھ سے بہت بلند ہے۔"

جنید ابلیس کے انکارِ سجدہ کے واقعہ سے بہت متاثر تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ کسی میں اتنی ہمت ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے معبود کا حکم نہ مانے اس فکر نے انہیں اتنا پریشان کیا کہ وہ ابلیس کے ملنے کا اشتیاق کرنے لگے۔ وہ اکثر سوچتے اے کاش میں ابلیس سے مل سکتا۔ سری سقطی نے کہا۔ "جنید! جس سے خدا کے نیک بندے پناہ مانگتے ہیں تم اس سے ملنے کی خواہش کر رہے ہو، یہ کیا بات ہے تم بھی شیطان ملعون سے خدا کی پناہ مانگو۔"

جنید نے ماموں کو کوئی جواب تو نہیں دیا لیکن ابلیس سے ملاقات کی خواہش کو دل سے نہیں نکال سکے۔

ایک دن جمعہ کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے تو سامنے سے ایک بوڑھا

آتا دکھائی دیا۔ یہ بوڑھا ان کے قریب آکر کھڑا ہو گیا اور انہیں حسرت و اشتیاق سے دیکھنے لگا۔ آپ نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور کترا کے نکل جانے کی کوشش کی۔ بوڑھا پھر ان کے سامنے آکھڑا ہوا۔ آپ نے زِچ ہو کر پوچھا "تو کون ہے اور میرے راستے میں کیوں حائل ہو رہا ہے؟"

بوڑھے نے جواب دیا۔ انسان کی یہ عجیب سی فطرت ہے کہ پہلے تو یہ کسی سے ملنے کا شوق ظاہر کرتا ہے لیکن جب وہ شخص مل جاتا ہے تو یہ خود ہی اس سے بچ کر نکل جانے کی کوشش کرتا ہے۔"

جنید نے کہا "تو کہنا کیا چاہتا ہے۔ میں تیرا مطلب نہیں سمجھا۔"

بوڑھے نے جواب دیا "کیا تم مجھ سے ملنے کی خواہش نہیں رکھتے تھے؟"

جنید نے پھر سوال کیا "لیکن تم ہو کون؟"

بوڑھے نے جواب دیا "ابلیس۔"

جنید نے اسے سر سے پیر تک غور سے دیکھا اور کہا "ہاں میں تجھ سے واقعی ملنا چاہتا تھا۔"

ابلیس نے پوچھا "لیکن کیوں؟ خدا کے پاک بندے تو مجھ سے خدا کی پناہ مانگتے رہتے ہیں؟"

"ہاں یہ بھی صحیح ہے!" جنید نے کہا "تو ملعون ہے اور میں یہی جاننا چاہتا ہوں کہ تو نے یہ لعنت کا طوق اپنے گلے میں کیوں ڈلوا لیا؟ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آخر وہ کیا چیز تھی جس نے تجھے آدم کو سجدہ کرنے سے روک لیا تھا؟"

ابلیس نے ایک سرد آہ بھری، بولا "اللہ ایک ہے اور میں نے یہ گوارا نہ کیا کہ خدا کے سوا بھی کسی کو سجدہ کروں، میں خدا کی ذات میں کسی اور

کو کس طرح شریک کر سکتا تھا۔ میں نے خدائے واحد کی وحدانیت کے لیے خدا کا حکم نہیں مانا۔ میں سب سے بڑا موحد ہوں۔"

جنید اس کے جواب سے نہ صرف مطمئن ہو گئے بلکہ پریشان بھی ہو گئے انہیں ایسا لگا کہ جیسے شیطان کو راندۂ درگاہ قرار دیا جانا مبنی بر انصاف فیصلہ تھا۔ ابھی وہ فکر اور تردد ہی میں تھے کہ اچانک دل میں القا ہوا کوئی کہہ رہا تھا "جنید! تو کس کی باتوں میں آ گیا۔ یہ جھوٹا ہے، اس سے پوچھو، یہ کس کا بندہ ہے!"

جنید نے اس سے پوچھا "تو کس کا بندہ ہے؟"

ابلیس نے جواب دیا "خدا ئے وحدہٗ لاشریک کا۔"

القا نے جنید سے جواب دلوایا "تو جھوٹا ہے، خدا کے کسی بندے کی یہ مجال نہیں کہ وہ اپنے معبود کے حکم کی خلاف ورزی کرے، تو اپنی آزادی کو جبر کا نام دے رہا ہے۔ تو اگر واقعی اللہ وحدہٗ لاشریک کا اتنا ہی عاشق ہوتا تو ایک عاشق میں اتنا ہوش کہاں باقی رہتا ہے کہ اپنے محبوب کے حکم کی خلاف ورزی کرے۔"

ابلیس نے ایک دردناک چیخ بلند کی، بولا "جنید! تم نے مجھے جلا ڈالا۔"

جنید نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا اب وہاں ابلیس کا پتہ و نشان تک نہ تھا۔

❖ ❖ ❖

ایک دن آپ کی صحبت میں رہنے والوں میں سے دو مرید گم ہو گئے ان میں سے ایک مرید نے بصرے میں رہنا شروع کر دیا۔ جنید کی دوری نے اس کے دل میں وسوسے پیدا کرنا شروع کر دیے اور گناہوں نے اس کے

دل و دماغ پہ شب خون مارنا شروع کر دیا۔ پھر اس مرید نے محسوس کیا جیسے اس کا چہرہ سیاہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی تو یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ اس کا چہرہ واقعی سیاہ ہو چکا تھا۔ اس نے فوراً کوشش شروع کر دی کہ اس کے چہرے کی سیاہی دور ہو جائے لیکن وہ دور نہ ہوئی۔ اسی حال میں تین دن گزر گئے۔ پھر اچانک اسے سیاہی دور ہوتی محسوس ہوئی۔ اس نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اب اس کا چہرہ نورانی ہو چکا تھا۔ وہ ابھی اس رمز کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اسے جنید کا خط موصول ہوا۔ اس میں آپ نے لکھا تھا۔

"اے شخص! تو بارگاہِ رب العزت میں کیوں نہیں رہتا؟ ذرا میری پریشانی پر بھی غور کر۔ میں کئی دن سے دھوبی کا کام انجام دے رہا ہوں اور تیرے چہرے کی سیاہی دھو ڈالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بمشکل اس سیاہی کو دور کر سکا ہوں اور اب خدا کے لیے اس سفیدی کو برقرار رکھنے کی کوشش کر۔"

مرید نے آبدیدہ نظروں سے خط کو کئی بار پڑھا اور پھر آنکھوں سے لگا لیا۔

آپ کے دوسرے مرید نے آپ کی صحبت سے کنارہ کشی اختیار کر لی، ایک ویرانے میں سکونت اختیار کی اور وہیں اللہ اللہ کرنے لگا۔ اس نے لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ مراقبہ و ریاضت نے یہ صورت اختیار کر لی کہ وہ خود کو یگانۂ دہر سمجھنے لگا۔ جنید بھی اسے اپنے سے کمتر ہی نظر آئے۔

ایک رات کو اس کے در پہ ایک اونٹ والا، اونٹ لیے حاضر ہوا اور اونٹ کو باہر کھڑا کر کے اس شخص کے رُوبرُو ادب سے جا کھڑا ہوا۔ اس نے اونٹ والے سے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

اونٹ والے نے جواب دیا۔ "بارگاہ ربّ العزت کا ایک معمولی فرشتہ!"

اس نے پوچھا۔ "کس لیے حاضر ہوئے ہو؟"

جواب ملا، "اس لیے کہ آپ کی عبادتوں کے صلے میں آپ کو بہشت بریں کی سیر کرادی جائے۔"

جنید کے مرید نے کہا، "میں بہشت بریں کی سیر تو بعد میں کرلوں گا پہلے مجھے برزخ کی سیر کرادو۔"

اونٹ والا اسے اونٹ پر بٹھا کر، ہوا کی طرح ایک ایسی جگہ لے گیا جس کے ایک طرف اجسام کثیف کی دنیا آباد تھی اور دوسری طرف ارواحِ مجرد رہ رہی تھیں۔ یہ شخص ان دونوں عالموں کے بیچ کی دنیا میں کھڑے ہوکر دونوں طرف کا مشاہدہ کرنے لگا۔ اس نے یہاں سے اپنے پیرو مرشد جنید کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں نظر آئے۔ اس نے اپنے ساتھی سے کہا، "میں اپنے مرشد جنید کو دیکھنا چاہتا ہوں وہ کہاں اور کدھر ہیں؟"

اونٹ والے نے جواب دیا، "تیرے ہوش و حواس تو ٹھکانے ہیں کہاں تو اور کہاں جنید۔ تو عبادت و ریاضت میں ان سے کہیں آگے نکل گیا ہے اب تو ان کا اپنے دل سے خیال تک نکال دے۔"

مرید کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ اس نے دل میں خیال کیا۔ میں نے اپنی محنتوں کا ثمر پالیا۔

مرید نے دوسری رات پھر اپنے رُوبرو ایک دوسرے شخص کو مودب کھڑے دیکھا۔ اس نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

اس شخص نے جواب دیا، "میں بھی فرشتہ ہوں اور اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ تم جہاں جانا چاہو۔ چلوں۔"

مرید نے کہا، "میں بہشت کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔"

اس شخص نے اشارے سے باہر چلنے کو کہا، "آؤ، اونٹ حاضر ہے!"

مرید باہر نکلا تو پچھلی رات کی طرح اونٹ کھڑا دیکھا، یہ اونٹ پر

بیٹھ گیا۔ اونٹ ہوا میں پرواز کرنے لگا۔ بالکل کسی طاقت ور پرندے کی طرح۔ وہ کچھ دیر بعد ایک ایسی دنیا میں داخل ہو گیا جہاں ہر طرف پھول ہی پھول کھلے تھے۔ صاف شفاف چشمے رواں تھے۔ پیاری پیاری شکلیں غم و اندوہ اور فکروں سے عاری اِدھر اُدھر محو خرام تھیں۔ مرید رات بھر اس پُر فضا مقام کی سیر کرتا رہا۔ اس نے اپنے ساتھی سے پوچھا "کیا یہ جگہ جنید نے بھی دیکھی ہے؟"

اونٹ والے نے جواب دیا "اس کا امکان تک نہیں۔ کہاں جنید اور کہاں یہ پُر فضا مقام، ابھی وہ اتنا بڑا آدمی نہیں ہوا ہے کہ اسے یہاں کی سیر کرائی جائے۔"

صبح سے پہلے ہی مرید پھر اپنی جگہ واپس آ گیا۔ اب وہ جس بلند مقام پہ فائز ہو چکا تھا گویا جنید اس کا خیال تک دل میں نہ لا سکتے تھے۔

جنید نے اپنے چند مریدوں کو اس جگہ کی خبر گیری کے لیے بھیجا۔ وہ اپنے پرانے ساتھی کے در پہ کھڑے ہو کر اندر آنے کی اجازت طلب کرنے لگے جو شخص جنید ہی کو خاطر میں نہ لاتا ہو، وہ ان مریدوں کو کیا سمجھتا۔ اس نے پوچھا "تم لوگ میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

مریدوں نے جواب دیا "ہم تمہاری خیریت معلوم کرنے آئے ہیں۔"

اندر سے خود سر مرید نے کہا "جاؤ جنید سے کہہ دینا۔ ہم خیریت سے ہیں اور خدا نے ہماری محنتوں کا یہ صلہ دیا ہے کہ ہر رات اس کے فرشتے خادموں کی طرح حاضری دیتے ہیں اور ہمیں عالم برزخ اور بہشت بریں وغیرہ کی سیر کراتے ہیں اور جنید ابھی تک اس منصب بلند سے محروم ہیں ہمارا ان کا کیا مقابلہ۔"

مریدوں نے باہر سے عرض کیا "اے گمراہ شخص تو یہ کیا بک رہا ہے

اپنے ہوش میں تو ہے، یا دماغی توازن کھو بیٹھا ہے؟"

اندر سے مرید نے غصّے میں کہا "تم لوگ یہاں سے چُپ چاپ چلے جاؤ ورنہ ہم تمہیں جلا کر خاک کر دیں گے۔"

مرید جنید کی خدمت میں واپس گئے اور انہوں نے جو سوال جواب کیے تھے مرشد کے سامنے دہرا دیے۔ جنید نے نہایت تحمل سے کہا "اب میں خود اس کے پاس جاؤں گا۔"

مریدوں نے حیرت سے پوچھا "حضرت اس نالائق متکبّر کے پاس آپ خود تشریف لے جائیں گے جو اپنی سیاہ بختی سے آپ کو بھی کچھ نہیں سمجھتا۔"

جنید نے جواب دیا "ہاں میں اس کے پاس جاؤں گا اور اس کی سیاہ بختی کو دُور کرنے کی کوشش کروں گا۔"

مرید چُپ ہو کر ان کی صورت دیکھنے لگے۔ ظاہر ہے وہ جنید کی باتیں کیا سمجھ سکتے تھے۔

جنید اس کے پاس پہنچ گئے۔ اس شخص نے ایک نگاہِ غلط انداز سے جنید کی طرف دیکھا اور اکڑا بیٹھا رہا۔

جنید نے اس سے پوچھا "آخر وہ کون سی چیز ہے جس نے تیرا دماغ خراب کر دیا ہے؟"

مرید نے جواب دیا "جنید! ادب سے بات کرو، یہ درست ہے کہ میں تمہارا مرید رہ چکا ہوں، لیکن جس طرح تم عبادت، ریاضت اور محنت شاقہ کے بعد اپنے ماموں اور پیر و مرشد سری سقطی سے بڑا منصب حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہو۔ اسی طرح میں نے بھی تم سے زیادہ ریاضت کر کے وہ مقام حاصل کر لیا ہے کہ فرشتے میرے در کی چاکری کرنے لگے ہیں۔"

جنید نے تحمل سے دریافت کیا "آخر مجھے بھی تو اپنے بلند منصب کی بابت کچھ تفصیل بتاؤ۔"

مرید نے سب کچھ تفصیل سے بتایا اور آخر میں کہا "اور اب ہر روز ایک نیا فرشتہ اونٹ لیے میرے دروازے پر آکھڑا ہوتا ہے اور عاجزی سے پوچھتا ہے کہ آج کہاں کی سیر کرنی ہے؟ پھر میں جس جگہ کا نام لیتا ہوں وہ مجھے اونٹ پر بٹھا کر وہیں پہنچا دیتا ہے اور میں وہاں خوب گھوم پھر کر صبح ہوتے ہوتے واپس آجاتا ہوں۔"

جنید مسکراتے ہوئے بولے "بس اتنی سی بات پر تم نازاں ہو، یہ تو کوئی خاص بات نہ ہوئی۔"

مرید نے رعونت سے جنید کو دیکھا اور منہ بنا کر کہا "ہونہہ، یعنی یہ کوئی خاص بات ہی نہ ہوئی، کہیں تم میرے اس بلند منصب سے جلنے تو نہیں لگے!"

جنید نے جواب دیا "حسد اور رشک کو میں کب کا اپنے دل سے نکال چکا۔"

مرید نے کہا "پھر تمہیں میری باتوں پر یقین کیوں نہیں آتا۔"

جنید نے کہا "مجھے تو افسوس اس بات کا ہے کہ تم اب تک جن خوشنما اور خوبصورت مناظر کا نظارہ کرتے رہے ہو وہ ویسے نہیں ہیں جیسے تمہیں نظر آئے۔"

مرید نے پوچھا "پھر وہ کیسے ہیں؟"

جنید نے کہا "اگر تم انہیں واقعی ان کی اصل شکل میں دیکھنا چاہتے ہو تو آج رات وہاں پہنچ کر تین بار لاحول پڑھ لینا۔ اس کے بعد تمہیں جو نظر آئے اس سے مجھے مطلع کرنا۔"

مرید نے آہستہ سے کہا "خوب، بظاہر تو تم یہ کہتے ہو کہ تم نے اپنے دل سے جذبۂ رشک وحسد کو فنا کر دیا ہے لیکن باتوں سے صاف پتہ چلتا

ہے کہ تمہارے دل میں ان دونوں جذبوں کے علاوہ اور کوئی جذبہ نہیں ہے۔"

جنید نے کہا۔ "اچھا اب میں چلتا ہوں، کل پھر آؤں گا۔"

وہ چلے گئے اور مرید کراہیت سے منہ بنا کر بیٹھ گیا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

حسبِ معمول اونٹ والا داخل ہوا اور درخواست کی "حضرت! اونٹ حاضر ہے، جہاں فرمائیں لے چلا جائے۔"

مرید تمکنت سے دامن سنبھالتا ہوا اٹھا اور حکم دیا۔ "آج مجھے بہشت کے اس حصے کی سیر کراؤ، جو میرے لیے مخصوص کیا جا چکا ہے۔"

اونٹ والے نے کہا۔ "اونٹ پہ بیٹھ جاؤ۔ ابھی لیے چلتے ہیں۔"

مرید اونٹ پہ بیٹھ گیا۔ اونٹ پہ نعکی طرح خلا میں پرواز کرنے لگا اور چشم زدن میں ایک ایسی دلکش جگہ پہ جا اترا جس کے حُسن اور خوبصورتی کا بیان لفظوں میں ناممکن ہے۔ مرید اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ وہ جنید پہ ہنسا کہ سمجھانے آئے تھے اور آخر منہ بنا کر واپس چلے گئے۔ کافی دیر بعد معلوم نہیں کیوں، بار بار اس کے دل میں لاحول پڑھنے کا خیال آنے لگا۔ وہ اس خیال سے پیچھا چھڑانے کی جتنی کوشش کرتا یہ اتنا ہی شدید ہونے لگتا۔ پھر اسے اپنی بے بسی کا خیال آنے لگا اور اس نے عاجز آ کے بے اختیار تین بار لاحول پڑھی۔ سارے حسین مناظر سیمیائی نمود کی طرح نظروں سے اوجھل ہونے لگے مرید صاف دیکھ رہا تھا کہ ماحول کی دلکشی دھوئیں کی طرح زائل ہوتی جا رہی ہے اور لمحوں میں سب کچھ نظروں سے اوجھل ہو گیا اور چاروں طرف تاریکی پھیل گئی۔ پھر چاروں طرف سے بدبو نے یلغار کر دی۔ اور اس کا دماغ پھٹنے لگا اس نے ادھر ادھر بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس کے پیر ٹھوکریں کھا کھا کے زخمی ہونے لگے، پھر ہلکی ہلکی روشنی نے اس جگہ کی ہر شے کو مرید کے سامنے

کردیا۔ مرید کے ہوش وحواس جاتے رہے۔ چاروں طرف دور دور تک جانوروں کے پنجروں کے ڈھیر تھے اور ان پنجروں کے نیچے غلاظت کا انبار تھا وہ خود غلاظت کی دلدل میں دھنسا کھڑا تھا۔ اس کا آدھا جسم غلاظت میں تھا اور ناک اور منہ کے سامنے غلاظت بھبکے چھوڑ رہی تھی۔ مرید کا دماغ پھٹا جا رہا تھا اس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اس سے نکلے کس طرح؟ اس عالم میں کہیں دور سے اسے جنید کی آواز سنائی دی۔ جنید پوچھ رہے تھے "تو نے اس جگہ کی سیر کرلی، جو تیری خوش فہمی اور تکبر نے تیرے لیے مخصوص کر دی ہے؟"

مرید نے پناہ مانگی "حضرت! مجھے خدا کے لیے اس جگہ سے نکالیے ورنہ بدبو سے میرا دماغ پھٹ جائے گا اور میں اس ناپاک ترین جگہ مر جاؤں گا۔"

جنید نے کہا "صدق دل سے استغفار پڑھ۔"

مرید نے آنکھیں بند کر کے استغفار پڑھ لی، اسے لگا جیسے وہ ہوا میں پرواز کر رہا ہے۔ کچھ دیر بعد جب آنکھ کھولی تو اس نے خود کو اپنے مکان میں پایا۔ اب اس کا اس جگہ ایک لمحہ رکنا بھی محال ہو گیا۔ وہ بھاگ کر جنید کی خدمت میں پہنچ گیا اور ان کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے لگا۔ سارے مرید یہ عجیب و غریب تماشا دیکھ رہے تھے لیکن جنید نے اس سلسلے میں اپنے مریدوں کو بھی کچھ بھی نہ بتایا۔

اس کے بعد اس مرید نے خود کو توبہ و استغفار کے لیے وقف کر دیا۔

اس دوران جنید کے ایک اور مرید کا دماغ خراب ہوا اور وہ سینہ تان کر چلنے لگا۔ اسی تکبر میں اس سے جنید کی شان میں گستاخی سرزد ہو گئی اس تکبر میں بھی ندامت نے غلبہ کیا اور شرمندہ ہو کر آپ کے پاس سے چلا گیا۔ آپ نے اسے کئی بار بلایا لیکن وہ نہیں آیا۔ اتفاق سے ایک دن اس کی راستے میں جنید سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ دونوں کی نظریں ملیں، گستاخ مرید کے دل میں اپنی

بڑائی کا محل ہلا اٹھا اور مرید نے جنید کو نظر انداز کر دیا۔ جنید نے مرید کو مخاطب کیا "ٹھہر جا۔ کیا تو نہیں جانتا کہ عزازیل کو کس شے نے قیامت تک کے لیے ذلیل و خوار کر دیا؟"

مرید نے جواب دیا "میں کچھ بھی جاننا نہیں چاہتا۔"

آپ نے غصے میں کہا "لیکن میں تجھے اس شے سے مطلع کر دینا چاہتا ہوں عزازیل معلم الملکوت تھا لیکن اس کے تکبر نے اسے ذلیل و خوار کر دیا۔

؎ تکبر عزازیل را خوار کرد   کہ زندانِ لعنت گرفتار کرد"

مرید پر آپ کی ہیبت طاری ہو گئی۔ وہ خوفزدہ ہو کر گر گیا۔ سر پتھر سے ٹکرایا اور اس سے خون جاری ہو گیا۔ مرید نے اس موقع پر بھی اپنے روحانی کمال کا اس طرح اظہار کیا کہ زخم سے جو خون بہا اس سے زمین پر لفظ "اللہ" لکھا گیا۔

جنید نے جوش میں کہا "اچھا تو کبر و رعونت کے اظہار سے باز نہیں آئے گا اور اس کی میرے سامنے جلوہ گری کرے گا۔" ذرا فاصلے پر کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ آپ نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "خدا کی قسم یہ بچے جو سامنے کھیل رہے ہیں جس درجے اور مقام کا تو اظہار کر رہا ہے یہ سب تیرے برابر ہیں۔"

جنید کی یہ بات مرید کے دل میں زہریلے تیر کی طرح پیوست ہو گئی اور وہ اسی وقت جاں بحق ہو گیا۔

آپ ایک مرید پر بہت مہربان رہتے تھے۔ دوسرے مرید اس پر رشک کرنے لگے۔ آپ نے ان کے رشک کو محسوس کر لیا اور ایک دن ان سب کو مخاطب کر کے فرمایا "میرے دل میں جس کا جو مقام ہے وہ اس کی حیثیت اور فراست کے سبب سے ہے تمہیں اس پر رشک نہیں

کرنا چاہیئے۔"

لیکن مریدوں کے دل سے رشک نہیں نکلا۔ ایک دن آپ نے ان سب کو ایک ایک مرغ دیا اور کہا۔"تم سب ان کو الگ الگ ایسی جگہوں پر لے جاؤ جہاں کوئی نہ ہو، انہیں وہاں ذبح کرکے میرے پاس لے آؤ۔"

تھوڑی دیر بعد سارے مرید مرغوں کو ذبح کرکے لے آئے لیکن آپ کا مرید خاص زندہ مرغ لیے واپس آگیا۔ آپ نے سب کے سامنے اس سے سوال کیا۔" تم نے اپنا مرغ ذبح نہیں کیا؟"

مرید نے جواب دیا۔"حضرت! میں جہاں بھی گیا وہاں خدا کو حاضر و ناظر محسوس کیا اس لیے مجبوراً مرغ واپس لے آیا۔"

آپ نے اپنے دوسرے مریدوں کی طرف دیکھا۔ ان سب نے شرمندہ ہو کر اپنے سر جھکا لیے۔

کسی شخص نے آپ سے سوال کیا۔"حضرت دل کس وقت خوش ہوتا ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔"جس وقت دل میں خدا جلوہ گر ہو۔"

آپ وعظ فرما رہے تھے۔ مجلس میں ایک آتش پرست بھی مسلمان کے بھیس میں شامل تھا۔ دوران وعظ اس نے کھڑے ہو کر آپ سے سوال کیا۔ "حضرت! رسول مقبولؐ کا قول ہے کہ مسلمان کی فراست سے بچتے رہو کیونکہ یہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے، اس کا مطلب کیا ہے؟"

آپ نے اسے گہری نظروں سے دیکھ کر جواب دیا۔"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تجھے مسلمان ہو جانا چاہیئے۔"

آتش پرست گھبرا گیا اور بعد میں مسلمان ہو گیا۔

ایک دن حسین ابن منصور آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض

کہا "میں آپ کی مریدی کا شرف حاصل کرنے آیا ہوں"
آپ نے پوچھا "تم نے عمر بن عثمان اور سہیل بن عبداللہ تستری سے کنارہ کشی کیوں اختیار کی ہے"
ابن منصور نے جواب دیا "میں ان کے غلبۂ حال سے بیزار ہو کر یہاں آیا ہوں"
جنید نے کہا "ابن منصور! تم نے ان دونوں حضرات سے جو سلوک کیا ہے میں اس سے خوش نہیں ہوں"
ابنِ منصور نے عرض کیا "حضرت میری ان سے دل برداشتگی کا سبب یہ ہے کہ ایک انسان اپنی ہوشیاری اور مستی کی وجہ سے ہمہ وقت صفات الٰہی میں فنا نہیں رہ سکتا"
آپ نے افسوس سے جواب دیا "ابن منصور! مجھے تیرے حالات کا انجام نیک نہیں دکھائی دیتا"
کچھ عرصہ بعد ابنِ منصور، انا الحق، کہنے اور اپنے تند و تیز افکار اور عقائد کی وجہ سے دار پر چڑھا دیے گئے۔
جنید کے ایک دوسرے نامی گرامی مرید ابوبکر شبلی نے آپ سے کہا۔ "حضرت! اگر خدا مجھے یہ اختیار دے دے کہ میں جنت و دوزخ میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لوں تو میں جہنم کو پسند کر لوں گا"
آپ نے پوچھا "وہ کیوں ہے"
ابوبکر شبلی نے جواب دیا "میں ایک مدت سے نفس کشی کرتا چلا آرہا ہوں، جنت میری پسندیدہ شے ہے اسی لیے میں ازراہِ نفس کشی دوزخ کو پسند کر لوں گا"
آپ نے نرمی سے کہا "شبلی! ابھی تم غلطی پر ہو۔ ایک بندے کی

حیثیت سے تم صاحب اختیار ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے اس لیے سعادت مندی، اطاعت گزاری اور نفس کشی کا تقاضا یہ ہے کہ تم سب کچھ اپنے خدا پر چھوڑ دو، وہ تمہیں جنت میں بھیجے یا جہنم میں، اس کی مرضی ہے اور تمہیں اس کی مرضی کا پابند ہو جانا چاہیے۔"

ابوبکر شبلی سناٹے میں آ گئے۔

آپ نے ایک درویش کی علالت کی خبر سنی تو اس کی عیادت کو تشریف لے گئے۔ اس وقت درویش علالت کی تکلیف سے رو رہا تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا۔ "تم رو کیوں رہے ہو؟"

درویش نے جواب دیا۔ "مرض کی شدت پر۔"

آپ نے پھر سوال کیا۔ "مرض اور اس کی شدت کس طرف سے ہے؟"

درویش نے جواب دیا۔ "اللہ کی طرف سے۔"

آپ نے کہا۔ "تب پھر کیوں روتا ہے۔" پھر پوچھا۔ "یہ جبر کا تعلق کس کے ساتھ ہے؟"

درویش نے عاجز آ کے کہا۔ "عجیب مشکل ہے کہ نہ رونے کی اجازت ہے اور نہ صبر کی قوت۔"

آپ سوئے ہوئے تھے کہ گھر میں ایک چور داخل ہو گیا اسے کچھ اور تو نہیں ملا، آپ کا کرتا ہی لے کر فرار ہو گیا۔ دوسرے دن جب آپ بازار سے گزر رہے تھے تو آپ نے اس چور کو اپنا کرتا بیچتے دیکھ لیا۔ ایک گاہک اس کرتے کو خریدنا تو چاہتا تھا لیکن اس پر مصر تھا کہ تو اس کرتے کا ایک ایسا گواہ لے آ جو میرے سامنے یہ کہہ دے کہ یہ کرتا تیرا ہی ہے تو میں تجھ سے اسی [illegible] یہ کرتا خرید لوں گا۔"

جنید [illegible] باتیں سن لیں۔ آگے بڑھے اور گواہی دی کہ "یہ کرتا اسی کا

ہے تم خرید سکتے ہو۔"

خریدار نے کرتا خرید لیا۔ چور نے رقم سنبھالی اور اپنے گھر کی راہ لی۔

مشہور صوفی سہل بن عبداللہ تستری نے سُن رکھا تھا کہ جنید رات کو سوتے بھی ہیں۔ انہوں نے جنید کو خط لکھا۔

"جنید! خوابِ غفلت سے بچو۔ کیونکہ سونے والا اپنا مقصد نہیں پاسکتا۔"

آپ نے جواب میں لکھ دیا۔"اے ابن عبداللہ! خدا کی یاد میں بیدار رہنا ہمارا ذاتی فعل ہے لیکن ہمارے سونے کا تعلق خدا کے فعل سے ہے اور خدا کا فعل ہمارے فعل سے بدرجہا بہتر ہے۔ خدا نے ارشاد فرمایا ہے۔۔۔ یعنی نیند ایک بخشش ہے خدا کی طرف سے اپنے دوستوں پر

ایک دن آپ جیسے ہی گھر سے نکلے، ایک عورت کو گھر کے دروازے پر گریہ وزاری کرتے دیکھا۔ آپ نے رونے کا سبب دریافت کیا تو عورت نے جواب دیا۔"حضرت! میرا بچہ گم ہو گیا ہے آپ اس کی بازیابی کی دُعا کیجئے۔"

آپ نے کہا۔"عورت صبر سے کام لے۔"

عورت خاموشی سے واپس چلی گئی۔ کچھ عرصہ بعد پھر حاضر ہوئی، اور "حضرت! وہ بچہ ابھی تک نہیں ملا۔"

آپ نے پھر کہا۔"صبر کر، گھبرا مت!"

عورت نے رو رو کر عرض کیا۔"اب مجھ سے صبر نہیں ہوگا، میں مجبور ہو گئی ہوں۔"

آپ نے حیرت سے عورت کی شکل دیکھی اور پوچھا۔"تو نے جو کچھ کہا کیا یہ درست ہے؟"

عورت نے جواب دیا۔"میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

آپ نے کہا "جا، اپنے گھر واپس جا۔ تیرا بیٹا تجھے مل گیا۔"
عورت بھاگی بھاگی گھر پہنچی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ بیٹا گھر میں موجود ہے۔

* * * * * * * *

پانچ سو دینار کی تھیلی ان صاحب کے ہاتھ میں تھی اور وہ اسے لے کر جنید کی خدمت میں پہنچ گئے اور ادب سے عرض کیا "حضرت! یہ دینار میں آپ کے لیے لایا ہوں، انہیں قبول فرمائیے۔"

آپ نے پوچھا "تیرے پاس اور رقم بھی ہے؟"

اس نے جواب دیا "بہت ساری رقم ہے، کیوں؟"

آپ نے پھر سوال کیا "میں اس رقم کو لے کر کیا کروں؟"

اس نے جواب دیا "اسے مستحقین میں تقسیم کرا دیجئے۔"

لیکن تو ایک بات اور بتا دے۔"

"کیا، پوچھیے۔"

آپ نے پوچھا "تو نے ابھی بتایا تھا کہ تو اور رقم کا خواہشمند ہے، کیا یہ صحیح ہے کہ تو مجھ سے دولت کے اضافے کی دعا چاہتا ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا "ہاں میں عرصہ سے اس دعا کا طالب ہوں"

آپ نے وہ تھیلی اس کی طرف بڑھا دی، کہنے لگے "تب پھر یہ تھیلی لیتا جا کیونکہ ان دیناروں کا تجھ سے زیادہ مستحق نہیں ملے گا۔"

اس شخص نے پوچھا "آخر آپ ان دیناروں کو رکھتے کیوں نہیں؟"

آپ نے جواب دیا "میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ لیکن مجھے ان کی حاجت نہیں اور تیرے پاس ان کے سوا بھی رقم موجود ہے اور مزید کی حاجت ہے چنانچہ ثابت ہوا کہ تو ان دیناروں کا زیادہ مستحق ہے۔"

آپ بغداد سے باہر کسی سے ملنے جا رہے تھے ساتھ چند مرید تھے

گرمی شدت کی پڑ رہی تھی۔ ایک مرید گرمی برداشت نہیں کر سکا، اس کی نکسیر پھوٹ گئی۔ وہ خون پونچھتا جاتا اور گرمی کی شکایت کرتا جاتا۔ آپ اس سے ناراض ہو گئے اس سے کہا۔

"تم میری صحبت میں بیٹھنے کے لائق نہیں ہو کیونکہ تم خدا کی شکایت کرتے ہو، موسم خدا کا تابع ہے اس کی شکایت کیا معنی ہے؟"

آپ دنیا کی بے ثباتی اور نفس کی ہلاکت پر وعظ فرما رہے تھے ایک نوجوان پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ وہ مجلس سے اٹھ کر گھر چلا گیا اور اپنا سارا سامان راہِ خدا میں دے دیا، بس ایک ہزار دینار جنید کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے بچا لیے۔ وہ دینار لیے آپ کی خدمت میں آ رہا تھا کہ راستے میں جنید کا ایک مرید مل گیا۔ اس نے پوچھا "یہ ہزار دینار لیے کہاں جا رہے ہو؟"

اس نے جواب دیا "جنید کی خدمت میں۔ میں دُنیا سے بالکل بیزار ہو گیا ہوں۔"

مُرید نے کہا "خُوب۔ جس شخص نے اپنے بچپن ہی سے دُنیا کو لات مار دی، تم اس کے لیے دینار لے کر جا رہے ہو، میاں تمہارا دماغ تو درست ہے، وہ ایک دیندار انسان ہیں، انہیں دنیا میں الجھانے کی کیوں کوشش کرتے ہو؟"

اس شخص نے وہ دینار ایک ایک کر کے دریائے دجلہ میں پھینک دیے وہ ایک دینار پھینکتا اور حسرت سے اسے دیکھتا رہتا۔ اس طرح اس نے پورے ہزار دینار دجلہ میں ڈال دیے اور ادھر سے فارغ ہو کر سیدھا آپ کی خدمت میں پہنچ گیا اور اپنی روداد سنا کر گزارش کی کہ اسے حلقے میں بیٹھنے کی اجازت عطا کی جائے۔

آپ نے جواب دیا "تم ابھی میرے حلقے میں بیٹھنے کے اہل نہیں ہو۔"

دوسرے مریدوں کو اس جواب پر حیرت ہوئی۔ پوچھا "کیوں حضرت؟ اس

نے تو اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں دے ڈالا اور وہ ہزار دینار، جو آپ کی خدمت میں لا رہا تھا، ایک ایک کر کے سارے ہی دجلہ میں پھینک دیے۔"

جنید نے جواب دیا "اس کے دل میں اب بھی ذرا سی مال و زر کی محبت باقی ہے۔ اس سے کہو اسے بھی دل سے نکال باہر کرے۔"

ایک مُرید نے اس نوجوان کی ہمدردی میں کہا "حضور والا! کچھ تو رحم فرمائیں۔"

آپ نے جواب دیا "اگر اس کے دل میں دیناروں کی محبت نہ ہوتی تو یہ سارے دینار ایک ہی بار دجلہ کے حوالے کر دیتا لیکن اس نے ایک ایک دینار دریا میں پھینکا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ دیناروں کی محبت برابر اس کے ہاتھ پکڑتی رہی ہے۔"

آپ نے اس نو وارد کو اپنی مجلس میں نہیں بیٹھنے دیا اور اسے حکم دیا کہ پہلے دل سے طمع نکال کے شیشۂ دل کو جلا دو۔ اس کے بعد میرے پاس آنا۔

وہ شخص آپ کے حکم کی بجا آوری میں وہاں سے چلا گیا۔

گیلان سے ایک شخص آپ کی خدمت میں پہنچا۔ آپ نے پوچھا "تمہارا نام؟"

اس نے جواب دیا "سید ناصری۔"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"حج کرنے۔"

آپ نے کہا "سید ناصری! تمہارے جدِ اعلیٰ حضرت علیؓ نفس اور کفار دونوں ہی سے جہاد کیا کرتے تھے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے ان دونوں میں سے کس کے خلاف جہاد کیا ہے؟"

سیّد ناصری پر رقت طاری ہو گئی، وہ دیر تک روتا رہا۔ آپ نے دریافت کیا "تم رو کیوں رہے ہو؟"

اس نے جواب دیا "میرا حج تو یہیں ہو گیا، اب میں آگے جا کر کیا کروں گا؟"

آپ مجھے ہدایت فرمائیں۔"

جنید نے کہا۔ "سید ناصری! تمہارا دل خانہ خدا ہے اس میں کسی دوسرے کو ہرگز جگہ نہ دو۔"

جنید نے یہ بات جس انداز اور لب ولہجہ میں کہی تھی اس نے سید ناصری کو ہلا ڈالا۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا اور پھر کبھی بھی نہ اٹھ سکا۔

آپ کے اقوال اور مواعظ نے بہتوں کو آپ کا دشمن بنا دیا انہی میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو آپ سے بڑی نفرت کرتا تھا۔ اسے کسی معاملے میں فتوے کی ضرورت پیش آئی۔ بغداد کے قاضی اور علماء اس کی نظر میں جچتے ہی نہ تھے اسی فکر میں وہ ایک رات سویا تو خواب میں دیکھا کہ سامنے رسول مقبولؐ تشریف فرما ہیں۔ آپ کے سامنے جنید بھی ہیں۔ اسی عالم میں ایک اور شخص حاضر ہوا اور رسول مقبولؐ سے کسی معاملے میں فتویٰ طلب کیا۔ آپؐ نے جنید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "فتویٰ جنید سے طلب کرو۔"

اس شخص نے حیرت سے کہا۔ "یا رسولؐ اللہ! آپ کی موجودگی میں جنید سے فتویٰ کیوں لوں؟"

آپ نے فرمایا۔ "اے شخص! جس طرح تمام انبیاءؑ کو اپنی اپنی امت پر فخر و مباہات ہوتا ہے اسی طرح مجھے اپنے جنید پر فخر ہے۔"

* * * * * * *

خلیفۂ بغداد کے پاس آپ کے خلاف شکایات پہنچ رہی تھیں۔ آپ کے مریدوں میں حسین ابنِ منصور اور ابوبکر شبلی جیسے بے باک اور صاف گو بھی موجود تھے۔ چغل خور خلیفہ سے کہہ رہے تھے کہ جنید جو کچھ کہتے ہیں وہ سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک بار خلیفہ نے جنید کے کسی مُرید کو جھڑک دیا اور کہا۔ "تم بے ادب ہو!"

مرید نے جواب دیا "سبحان اللہ۔ میں کس طرح بے اَدب ہو سکتا ہوں جبکہ میں اپنا نصف دن حضرت جنید کی خدمت میں گزارتا ہوں"

جب آپ کی شکایات کی بھرمار ہوگئی تو خلیفہ نے شکایت کرنے والوں سے پوچھا "آخر تم لوگ چاہتے کیا ہو؟"

چغل خوروں نے جواب دیا "جنید نے پورے بغداد میں افکار و خیالات کا خطرناک فتنہ پھیلا رکھا ہے۔ اگر اس فتنہ کو روکا نہ گیا تو ہر طرف بے دینی اور ابتری پھیل جائے گی"

خلیفہ نے پوچھا "تو اس سلسلے میں مجھے کرنا کیا چاہیئے؟"

لوگوں نے جواب دیا "اس فتنہ انگیز کو درمیان سے ہٹا دینا چاہیئے"

خلیفہ نے بے بسی سے کہا "لیکن حجّتِ شرعی کے بغیر میں یہ کام نہیں کر سکتا"

لیکن خلیفہ جنید کے خلاف عملی قدم اٹھانے کے لیے حیلے ضرور تلاش کرنے لگا۔ آخر اس کے ذہن میں ایک عجیب و غریب ترکیب آئی۔ خلیفہ کے پاس ایک نہایت حسین و جمیل کنیز آئی تھی۔ اس نے اس کا خوب بناؤ سنگھار کرایا اور اس سے کہا "میں تجھ سے ایک نہایت اہم کام لینا چاہتا ہوں"

کنیز نے ادب سے عرض کیا "میں امیر المومنین کی کنیز ہوں جیسا حکم دیں گے اس پر عمل کر گزروں گی"

خلیفہ نے کہا "تم جنید کے پاس بھیجی جا رہی ہو۔ جنید کے خلاف بڑی شکایات موصول ہو رہی ہیں اور لوگ بضد ہیں کہ اس فتنہ انگیز شخص کو کوئی سخت سزا دی جائے لیکن میں اس وقت تک جنید کے خلاف کوئی قدم بھی نہیں اٹھا سکتا جب تک جواز میں حجّتِ شرعی موجود نہ ہو"

کنیز نے پوچھا "پھر مجھے کیا کرنا ہے؟"

خلیفہ نے کہا "تو جنید کے پاس جا اور اسے کسی بھی طرح حرص و ہوس کا شکار بنا لے"

کنیز مسکرائی اور پوری خود اعتمادی سے بولی "آپ بے فکر رہیں مجھے یقین ہے کہ جنید شکار ہو جائیں گے"

کنیز نے ایک خادمہ کو ساتھ لیا اور بڑے طمطراق سے آپ کے پاس پہنچ گئی۔ باہر سے جنید کو مطلع کیا گیا کہ "ایک امیر زادی آپ سے ملنا چاہتی ہے!"

آپ نے مریدوں کو ہٹ جانے کا حکم دیا، جب بالکل تخلیہ ہو گیا تو کنیز خادمہ کے ساتھ آپ کے سامنے جا کھڑی ہوئی، لاکھوں میں یکتا، شباب سے آراستہ، چال میں مستی، نگاہوں میں جادو، ہونٹوں میں مسکراہٹوں کا سحر، آواز میں کھنک، یہ فتنہ جنید کے رُوبرُو جا کھڑا ہوا، آپ نے نظریں جھکالیں اور پوچھا "کیا بات ہے ؟ تم میرے پاس کیا لینے آئی ہو؟"

کنیز نے سرتاپا اشتیاق سے کہا "اِدھر میری طرف تو دیکھئے پھر کچھ عرض کروں"

جنید نے کہا "تمہیں جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالو۔ میں نظروں سے نہیں کانوں سے سُن لوں گا"

کنیز نے سوچا "حُسن و شباب کا سحر اس وقت تک اپنا کام نہیں کرے گا جب تک جنید کی نگاہیں دوچار نہ ہوں۔ اس نے کہا "شیخ! آپ ذی علم انسان ہیں اور اس نکتے سے ضرور واقف ہوں گے کہ جہاں باتیں اثر نہیں کرتیں، نظریں متصادم ہو کر مروت اور رعایت پہ مائل کر دیتی ہیں"

جنید نے کہا "عورت! زیادہ باتیں نہ بنا۔ مطلب بیان کر"

کنیز نے کہا "حضرت! میں ایک بیوہ امیر زادی ہوں، بے انتہا مال

اور املاک پر حق تصرف رکھتی ہوں لیکن زمانے نے زندگی اجیرن کر رکھی ہے ہر شخص مطلب سے ملتا ہے۔ جس حسن پر میں کبھی ناز کرتی تھی اب وہی میرے حق میں مصیبت اور آزمائش بن گیا ہے۔ میں نے نہایت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ اپنی بقیہ زندگی آپ کے قدموں میں گزار دوں اور اپنا سب کچھ آپ کے حوالے کر دوں۔"

"عورت! اپنا مطلب صاف صاف بیان کر۔ میں سمجھا نہیں کہ تو چاہتی کیا ہے؟"

کنیز نے خوشامد سے کہا۔" جب تک آپ میری طرف دیکھیں نہیں، میں اپنی زبان بند رکھوں گی۔"

جنید نے کنیز کو سرسری نظروں سے بھی نہ دیکھا، بولے۔"مجھے دیکھنے پر مجبور نہ کر۔ جو کچھ مزید کہنا ہے کہہ ڈال۔"

کنیز اپنی جگہ سے اٹھی اور آپ کے قریب آ بیٹھی، اس کے لباس سے خوشبو کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ اس نے جنید کو اپنے جلوۂ جہاں سوز سے جلا دینا چاہا۔ اس نے آپ کی طرف اپنے ہاتھ بڑھائے، بولی۔"ان پیارے پیارے ہاتھوں کو میرے ہاتھوں میں دے دیجئے۔"

جنید ذرا پیچھے ہٹ گئے۔ بولے۔" عورت! ہوش میں آ، اور ان جسارتوں سے پرہیز کر۔"

کنیز نے کوئی پروا کیے بغیر جنید کے شانے پر ہاتھ رکھنا چاہا، بولی۔ "مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے دل کی کثافت آپ سے ہم آغوش ہو کے دھو ڈالوں۔"

جنید نے افسوس سے کہا۔" عورت تو اپنی دشمن معلوم ہوتی ہے۔"

کنیز نے کوئی پروا نہ کی اور کھنک دار قہقہے سے اپنی جارحانہ روش کی ابتدا کی۔ اس نے آپ کو پکڑنے کی کوشش کی۔ آپ نے چند قدم پیچھے

ہٹ کر تین بار آہ، آہ، آہ، کی۔ خادمہ نے دیکھا ہر آہ کے ساتھ آپ کے منہ سے چنگاریاں نکلیں اور ان چنگاریوں نے کنیز کے کپڑوں کو پکڑ لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کنیز جلنے لگی۔ وہ کرب و اذیت سے چیخی چلائی لیکن اس کی مدد کون کرتا۔ دیکھتے دیکھتے وہ راکھ ہو گئی۔ خادمہ بدحواس ہو کر بھاگ کھڑی ہوئی اور خلیفہ کو کنیز کے عبرتناک انجام سے، رو رو کر مطلع کیا۔ خلیفہ اس کنیز کو بہت پسند کرتا تھا۔ فوراً ہی محل سے باہر نکلا اور جنید کی خدمت میں پہنچ گیا۔ جنید نے اس کو سرد مہری سے دیکھا اور گردن جھکا لی۔

خلیفہ نے پوچھا "شیخ! میری کنیز کہاں ہے؟"

آپ نے راکھ کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "میری چالیس سالہ ریاضت پر ڈاکہ مارنے آگئی تھی۔ لیکن خود اپنے انجام کو پہنچ گئی۔"

خلیفہ نے افسوس سے کہا "شیخ! یہ کنیز مجھے بے حد پسند تھی آپ نے اس پر بڑا ظلم کیا۔"

آپ نے جواب دیا "تم دونوں نے میرے خلاف سازش کی، اگر میں رحم و شفقت سے کام لیتا تو یہ میرے حق میں ظلم عظیم ثابت ہوتا۔"

خلیفہ بحسرت و یاس واپس چلا گیا۔

آپ فرمایا کرتے تھے "جو آنکھ خدا کی قدرت اور حکمت نہ دیکھ سکے اس کا اندھا ہو جانا بہتر ہے، جو زبان ذکر حق میں مصروف نہ ہو، اس کا گنگ ہو جانا اچھا ہے۔ جو کان حق بات نہ سُنے اس کا بہرہ ہو جانا بہتر ہے اور جو بدن اس کی خدمت نہ کرے اس کا مر جانا ہی اچھا ہے۔"

کسی نے آپ سے سوال کیا "حضرت! کس شخص کی صحبت اختیار کی جائے؟"

آپ نے جواب دیا ''جو تیرے ساتھ نیکی کر کے بھلا دے۔''
اس شخص نے دوسرا سوال کیا ''اور بندہ کسے کہتے ہیں؟''
آپ نے جواب دیا ''جو اللہ کے سوا دوسروں کی بندگی سے آزاد ہو۔''
آپ نے مزید فرمایا ''جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کی بھلائی چاہتا ہے تو اسے صوفیوں کی طرف پہنچا دیتا ہے اور اسے مولویوں کی صحبت سے روک دیتا ہے۔''
انہوں نے ایک شخص کو برسرِ بازار ننگا دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا جسے وہ کسی کسی لمحہ دانت سے کاٹ کر کھا لیتا تھا۔ جنید نے نفرت سے اپنا منہ پھیر لیا۔ اور کہا ''او ابلیس! تجھے لوگوں سے شرم نہیں آتی۔''
اس نے کہا ''جنید! تمہارے خیال میں اس روئے زمین پر ایک بھی ایسا شخص موجود ہے جس سے شرم کی جائے، جن کو شرم آتی تھی وہ خاک کے نیچے ہیں انہیں مٹی کھا گئی۔''
آپ سے پوچھا گیا ''حضرت! خالص توحید کسے کہتے ہیں؟''
آپ نے جواب دیا ''خالص توحید کا مطلب ہے، بندے کا آخر اس کے اوّل کی طرف لوٹ جائے اور وہ ویسا ہو جائے جیسا ہونے سے قبل تھا۔''
آخر عمر میں کسی نے شکایتاً کہا ''حضرت! آپ کا وعظ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔''
آپ نے جواب دیا ''ستر سال کی عبادت قدموں کے نیچے رکھ کر سرنگوں ہو جا اس کے بعد بھی اگر میرا وعظ تیری سمجھ میں نہ آئے تو میں خود کو قصور وار سمجھوں گا۔''
آپ کی عمر نوّے سال کی ہو چکی تھی اور آثارِ رحلت ظاہر ہونے لگے تھے۔ آپ نے لوگوں سے کہا ''مجھ کو وضو کرا دو۔''
لوگ وضو کرانے لگے تو انگلیوں میں خلال کرانا بھول گئے۔ آپ نے انہیں یاد دلایا کہ خلال کرانا باقی رہ گیا ہے۔ لوگوں نے خلال کرا دیا۔ اس کے بعد آپ سجدے میں گر کر زار و قطار رونے لگے۔ کسی مرید نے کہا ''آپ اس قدر عابد و زاہد ہونے

کے باوجود رو رہے ہیں آخر کیوں ہے"

آپ نے جواب دیا" لوگو! میں اس وقت سے زیادہ کبھی بھی محتاج نہ ہوا تھا، اس کے بعد آپ قرآن پاک کی تلاوت کرنے لگے اور فرمایا" اس وقت قرآن پاک سے زیادہ میرا کوئی مونس و ہمدم نہیں اور اس وقت میں اپنی عمر بھر کی عبادت وریاضت کو ہوا میں اس طرح معلق دیکھ رہا ہوں کہ تند و تیز ہوا کے جھونکے اسے اڑا دینے کی کوشش کر رہے ہیں اور مجھے کچھ پتہ نہیں کہ یہ ہوا فراق کی ہے یا وصال کی۔ دوسری طرف فرشتۂ اجل ہے، پُل صراط ہے اور میں عادل قاضی پر نظر یں جمائے اسکا منتظر ہوں کہ دیکھئے، صبح کدھر جانے کا حکم ملتا ہے۔"

اس موقع پر ابو محمد جریری نامی بزرگ آپ کے پاس گئے اور پوچھا" کوئی کام ہو تو ارشاد فرمایئے۔"

آپ نے جواب دیا" جب میں مر جاؤں تو مجھے غسل دینا، کفنانا، اور نماز جنازہ پڑھانا۔"

جریری رونے لگے۔ آپ نے انہیں روتے دیکھا تو بولے" ہاں ابو محمد! ایک کام اور ہے!"

جریری نے پوچھا" وہ کیا ہے"

" آپ نے کہا" میرے دوستوں کے لیے ولیمے کا کھانا تیار کرانا، اور جب وہ میری تجہیز و تکفین اور تدفین سے فارغ ہو جائیں تو انہیں ولیمے کا کھانا کھلانا۔"

جریری نے روتے ہوئے کہا" حضرت! یہ کیوں ہے"

آپ نے جواب دیا" تاکہ ان کے دلوں کا انتشار اور پراگندگی دور ہو جائے۔"

سینیچر کے دن، ۲۷ رجب ۲۹۷ھ کو آپ نے ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ آپ کی زبان پر آخری الفاظ تھے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

آپ بغداد ہی میں دفن ہوئے۔ کہتے ہیں جب آپ کا جنازہ اٹھایا گیا تو

ایک سفید کبوتر معلوم نہیں کدھر سے آپ کے جنازہ پر بیٹھ گیا۔ لوگوں نے اسے اڑانا چاہا لیکن وہ نہیں اڑا۔ کبوتر کے پاس سے ایک آواز آئی "لوگو! تم مجھے اور خود کو پریشان نہ کرو۔ میرے پنجے عشق کی میخوں سے جنازے کے گوشوں پر جا دیے گئے ہیں۔ تم شاید یہ سمجھ رہے ہو کہ جنید کا جنازہ تم لوگ لیے جا رہے ہو نہیں، ایسا نہیں ہے آج جنید کا قالب فرشتوں کے دوش پر ہے اگر یہاں تمہارا شور و غل نہ ہوتا تو جنید کا جسم سفید باز کی طرح ہمارے ساتھ ہوا میں محو پرواز ہوتا۔"

جب جنازہ قبر میں اتارا گیا تو کبوتر کہیں غائب ہو چکا تھا۔

عبداللہ بن مبارک

مرو کے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں عبداللہ نے ہوش سنبھالا تھا۔ ان کے باپ کا نام مبارک تھا۔ عبداللہ نے مروّجہ علوم حاصل کیے لیکن مزاج میں استغنا اور بے نیازی اتنی زیادہ تھی کہ مادی اور علمی دولتوں کی حصولیابی نے ان کے دل و دماغ پر کوئی ناقص اثر نہیں ڈالا۔ وہ اپنے آپ کو نہ تو دولت مند کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے اور نہ ہی ایک نمایاں علمی شخصیت ہونے کا کوئی گھمنڈ تھا۔ معلوم نہیں، قدرت کا یہ کون سا اصول ہے کہ خدا جنہیں محبوب رکھتا ہے انہیں ان کے باپ کے سایے سے، بچپن ہی میں محروم کردیتا ہے۔ عبداللہ کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ باپ کی عدم موجودگی میں ماں نے دونوں ذمہ داریاں قبول کرلیں۔ ماں کا خیال تھا کہ ان کا بیٹا عبداللہ جب بڑا ہو جائے گا تو انہیں بڑی بے فکری ہو جائے گی، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بیٹے کے مشاغل اور روزمرہ کے معمولات ایسے نہیں تھے کہ ماں انہیں محسوس ہی نہ کرتی۔ صبح، دوپہر، شام اور رات، عبداللہ کے لیے وقتوں کا یہ پیمانہ ایسا نہیں تھا کہ انسان ان کی ناپ تول میں اپنی عمر گزار دے۔ عبداللہ کسی وقت بھی گھر سے دور کسی ویرانے میں پہنچ جاتے تھے۔ ماں حیرت اور افسوس سے

سوچتیں کہ ان کا بیٹا عبداللہ مستقبل میں معلوم نہیں کیا کرے گا؟

اس دن فجر کی نماز پڑھ کر عبداللہ نے گھر سے جو قدم نکالا ہے تو دوپہر تک اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ ماں بدحواس ہو گئیں اور انہوں نے عبداللہ کی تلاش میں کئی آدمی چھوڑ دیے۔ دوپہر تک عبداللہ کی کوئی خیر خبر نہ ملی لیکن دوپہر کے بعد ایک دیہاتی بھاگا بھاگا عبداللہ کی ماں کے پاس پہنچا اور اپنی دانست میں ایک عجیب و غریب خبر سنائی "اماں! آپ کا بیٹا بڑے خطرے میں ہے، میرے ساتھ آیئے اور سوچ سمجھ کر فیصلہ کیجئے کہ ان حالات میں آپ اس کی کیا مدد کر سکتی ہیں"

ماں کا دل دھک دھک کرنے لگا، گھبرا کے پوچھا "آخر میرا بیٹا عبداللہ ہے کہاں؟ وہ کس مصیبت میں مبتلا ہے؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ"

دیہاتی نے جواب دیا "میں کچھ بتانے کے بجائے دکھا دینا چاہتا ہوں، آپ میرے ساتھ تو آیئے"

پریشان حال اور حواس باختہ ماں دیہاتی کے پیچھے پیچھے چلنے لگیں وہ انہیں ایک باغ میں لے گیا۔ وہاں گلاب کے ایک کنج کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا "ذرا اس کنج میں جا کر دیکھئے، آپ کا بیٹا کس حال میں ہے"

ماں گھبرائی ہوئی گلابوں کے کنج میں داخل ہوئیں تو انہیں ایک ہوشربا منظر دکھائی دیا۔ ان کا بیٹا اس کنج میں بے خبر سویا ہوا تھا اور پاس ایک طرف پھن اٹھائے ہوئے ایک سانپ بیٹھا تھا۔ عام حالات میں شاید ماں کی ایک خوفناک چیخ نکل جاتی لیکن انہیں دیہاتی کا مشورہ یاد تھا کہ "آپ کا بیٹا خطرے میں ہے ذرا سوچ سمجھ کر فیصلہ کیجئے کہ ان حالات میں آپ اس کی کیا مدد کر سکتی ہیں؟ وہ کچھ دیر مبہوت کھڑی یہ خوفناک منظر دیکھتی رہیں

عبداللہ کے منہ پر شہد کی مکھیاں بیٹھنے لگیں، ماں گھبرائیں کہ کہیں یہ مکھیاں عبداللہ کو کاٹ نہ لیں، وہ مکھیاں اڑانے کی کوئی ترکیب ابھی سوچ بھی نہ سکی تھیں کہ سانپ نے پودے کی ایک لمبی شاخ کو منہ میں لے کر عبداللہ کے منہ پر حرکت دی، مکھیاں اڑ گئیں۔ ماں کو اطمینان ہوگیا۔

دیہاتی نے پوچھا "اس موذی سے نجات دلانے کی کیا ترکیب سوچی آپ نے؟"

ماں نے جواب دیا "کوئی ترکیب نہیں، کیونکہ جس سانپ کو تم موذی سمجھ رہے ہو یہ موذی نہیں ہے، میرے بیٹے کا محافظ ہے۔ کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ ابھی ابھی شہد کی مکھیوں کو میرے بیٹے کے چہرے پر سے اس سانپ نے اڑایا ہے!"

دیہاتی سمجھا، ماں کو اپنے بیٹے کی طرف سے غضب کا اعتماد ملا ہے، اس نے اپنی راہ لی۔ ماں دیر تک بیٹے کی بیداری کی منتظر رہیں۔

کافی دیر بعد جب عبداللہ کی آنکھ کھلی تو وہ فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ سانپ نے اپنی راہ لی، لیکن اس سانپ کو عبداللہ نہیں دیکھ سکے۔ وہ اٹھ کر کنج سے باہر آئے تو سامنے ماں کو کھڑا دیکھ کر حیرت سے پوچھا "ماں! آپ یہاں کہاں؟ خیریت تو ہے؟"

ماں نے پورا قصہ سنا دیا، بولیں "میں تو خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی لیکن جب میں نے یہ عجیب منظر دیکھا کہ وہ تیرے چہرے سے شہد کی مکھیاں اڑا رہا ہے تو میں مطمئن ہوگئی۔"

عبداللہ نے کہا "لیکن ماں، میں نے تو اس سانپ کو دیکھا نہیں!"

ماں نے کہا "اسے تو کیسے دیکھتا، کیونکہ وہ تیرے بیدار ہوتے ہی

کہیں چلا گیا۔"

دونوں گھر چلے آئے لیکن ماں کو اپنے بیٹے کی عظمت کا علم ہو چکا تھا۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

عبداللہ نے جوانی کی حد میں قدم رکھا لیکن ابھی تک عبداللہ کے اعمال اور اشغال میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی تھی جس سے ان کی عظمت اور بزرگی کا کوئی اندازہ لگایا جا سکتا۔

آپ کے پڑوس میں ایک انتہائی دولتمند شخص رہتا تھا۔ اسے عورتوں کا بڑا شوق تھا۔ کئی حسین بیویوں کے ساتھ ہی منتخب کنیزیں بھی گھر میں رکھ چھوڑی تھیں۔ اپنی نیکی اور اعلیٰ وقری کی وجہ سے عبداللہ کا اس گھر میں آنا جانا رہتا تھا۔ کنیزیں عبداللہ کے سامنے آتی تھیں۔ انہیں ایک کنیز بہت اچھی لگی۔ یہ جب تک کنیزوں میں رہتے، یہی کنیز ان کی توجہ کا مرکز بنی رہتی وہ بات کسی سے بھی کرتے دھیان اسی کنیز کی طرف رہتا۔ وہ گھر آتے تو خیالوں میں بھی یہی کنیز ہنستی مسکراتی رہتی۔ خوابوں میں بھی اس کا عمل دخل رہتا۔ یہ ہمہ وقتی دھیان آہستہ آہستہ شدید عشق کی صورت اختیار کر گیا۔ انہوں نے کئی بار یہ ارادہ کیا کہ اس کے روبرو اپنی محبت کا اظہار کر دیں لیکن یہ سوچ کر باز رہے کہ اگر کنیز کے مالک نے ان کی یہ بات سُن لی تو اپنے گھر میں ان کا داخلہ بند کر دے گا۔ وہ ایک عرصہ تک عشق کی اس خاموش آگ میں سلگتے اور جھلستے رہے۔

کنیزوں کا مالک اپنے کسی کام سے شہر سے باہر چلا گیا، عبداللہ کے نفس نے سرکشی اختیار کی اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے دو ڈھائی سالہ

عشق کا اپنی محبوبہ کے رُوبرُو اظہار ضرور کر دیں گے۔ انہیں اس سے کیا کچھ کہنا ہے، اس کی تفصیلات پر غور کرتے ہوئے جب یہ اپنی محبوبہ کے سامنے پہنچے تو زبان گنگ ہو گئی اور منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ یہ دیر تک اس کے سامنے کھڑے دیکھتے رہے۔ کنیز نے گھبرا کر پوچھا۔

"کیا بات ہے عبداللہ؟ آج تمہاری آنکھوں میں کسی جذبے کی شدت کیوں پائی جاتی ہے۔ تم خاموش کیوں ہو؟ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

عبداللہ چور سے بن گئے، ایسے چور، جس کو چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہو، گھبرا کے سر جھکا لیا، بولے "نہیں، میں تم سے کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا۔"

کنیز نے ہنس کر کہا "عبداللہ! میں ایک عورت ہوں اور میں مردوں اور نوجوانوں کے دل کی بات ان کے چہروں سے معلوم کر لیا کرتی ہوں۔ میں تمہارے اندرونی طوفان سے اچھی طرح آگاہ ہوں، لیکن میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ تم سب کچھ صاف صاف اپنی زبان سے بتا دو۔ اگر نہیں بتاؤ گے تو پچھتاؤ گے۔"

عبداللہ کے جی میں آئی کہ جب یہ عورت ان کے دل کی بے چینی کو محسوس ہی کر چکی ہے تو اسے چھپانے سے فائدہ؟

کنیز نے ہنس کر کچوکا لگایا "عبداللہ! نوجوانی اور احتیاط! اسے میں پاگل پن سمجھتی ہوں۔"

عبداللہ نے ذرا اٹک اٹک کر کہا "میں نہیں چاہتا کہ اس گھر میں میں اپنا اعتبار کھو دوں!"

"میں نے کب کہتی ہوں کہ تم اس گھر میں اپنا اعتبار کھو دو، لیکن میں اس

تحمل اور ضبط کی بھی قائل نہیں جس کا تمہاری طرف سے خواہ مخواہ اظہار ہو رہا ہے۔"
عبداللہ نے کہا "تب پھر میں، جو کچھ میرے دل میں ہے صاف صاف کہہ دوں؟"
کنیز نے کہا "آخر کتنی بار اس کی اجازت دوں؟"
عبداللہ نے کسی قدر پس وپیش سے کہا "معلوم نہیں کیا بات ہے کہ سوتے، جاگتے، کھانے پیتے، چلتے پھرتے اگر کسی کا تصور قائم رہتا ہے تو وہ تم ہو، تمہاری صورت، تمہاری شبیہہ ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ اس عارضے کو دوسرے کیا کہیں گے۔"
کنیز نے ہنس کر جواب دیا "دوسرے اس جذبے کو محبت کہتے ہیں۔ اس کا ایک نام عشق بھی ہے۔" پھر کسی خیال میں ڈوب کر بے خیالی میں کہا "تو تم مجھ محبت کرنے لگے ہو! خوب!"
عبداللہ نے گھبرا کر کہا "یہ تو تم کہہ رہی ہو کہ میں محبت کرنے لگا ہوں، خود میں نے تو ایسی بات نہیں کہی۔"
کنیز نے مسکراتے ہوئے کہا "تم خوفزدہ کیوں ہو؟ دل کا معاملہ تو ایسا ہے کہ اس پر کسی کا بس ہی نہیں چلتا۔"
عبداللہ نے اٹک اٹک کر کہا "معلوم نہیں یہ کیسی آگ ہے جو سینے میں ہر وقت فروزاں رہتی ہے۔"
کنیز نے شوخی سے کہا "اگر تم یہ چاہو کہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہاری ہو جاؤں تو اس کے لیے تمہیں اپنے دماغ کو بھی کام میں لانا پڑے گا۔"
عبداللہ نے جلدی جلدی پوچھا "کیا اگر میں خواہش کروں تو تم واقعی میرے ساتھ اور پاس رہنے پر آمادہ ہو جاؤ گی؟"

کنیز نے اسی شوخی سے جواب دیا "تم زبان تو کھولو اپنی، پھر دیکھو کہ تمہارے لیے کیا کچھ ہو سکتا ہے۔"

"اور تم اپنے آقا کو کیا جواب دو گی؟"

"یہ میرا اپنا معاملہ ہے، میں اس سے کیا کہوں گی اور اسے تمہارے لیے کس طرح آمادہ اور راضی کروں گی، یہ میرا اپنا ذاتی مسئلہ ہے۔ تم اس میں اپنا سر کیوں کھپاؤ۔"

عبداللہ چپ ہو گئے۔

بعد میں عبداللہ کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ دوسری کنیزیں ان کی نگرانی کرنے لگی ہیں۔ اس کی تائید ان کی محبوبہ نے بھی کی۔ اس نے کہا "عبداللہ! ذرا احتیاط سے کام لو۔ دوسری کنیزیں کوشش کرتی ہیں کہ وہ کسی طرح ہم دونوں کی باتیں سن لیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ اپنے مالک کے لیے جاسوسی کا فرض انجام دے رہی ہیں۔"

عبداللہ کے ہوش و حواس ہی جلتے رہے، کہا "اپنے اس حشر سے میں پہلے ہی واقف ہو گیا تھا لیکن میں لاکھ کوششوں کے باوجود تیری یاد کو اپنے دل سے نہیں نکال سکا۔ اب تو ہی بتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

کنیز نے بے بسی سے جواب دیا "میں کیا بتاؤں، میری عقل کام ہی نہیں کر رہی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

عبداللہ نے ذرا خفگی سے کہا "میں تو پہلے ہی یہ کہتا تھا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا ہم دونوں سمجھ بیٹھے ہیں، لیکن تو یہ کہہ کر ٹال دیا کرتی تھی کہ یہ تیرا اپنا معاملہ ہے میں کیوں فکر کروں۔ اب تو اپنے اس معاملے کو کس طرح انجام کو پہنچائے گی ذرا میں بھی تو سنوں؟"

کنیز نے افسوس سے جواب دیا "میں تم سے ایک درخواست کر رہی ہوں، خدارا اس پر عمل ضرور کرنا۔"

"کون سی، کیسی درخواست ہے؟"

کنیز نے جواب دیا۔ "میں چاہتی ہوں تم چند دن میرے پاس بالکل نہ آؤ۔ میں تمہاری عدم موجودگی میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ گھر کی دوسری کنیزیں ہم دونوں کی نسبت سے کیسی باتیں کرتی ہیں۔ ان باتوں کی روشنی میں ہم دونوں کوئی قدم اٹھائیں گے۔"

عبداللہ نے کنیز کی بات مان لی اور گھر میں اعتکاف اختیار کیا۔ کئی دن گزر گئے لیکن عبداللہ کنیز کے پاس نہیں گئے۔ ان کا خیال تھا کہ کنیز کے سینے میں جو آتشِ فرقت بھڑک رہی ہے اس کی تپش اور سوزش اسے مستقل برقرار رکھے گی اور وہ انہیں بلانے پر مجبور ہو جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا، کنیز بالکل خاموش رہی یہاں تک کہ ایک دن عبداللہ خود ہی اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ کنیز انہیں بلائے یا نہ بلائے، وہ بغیر بلائے ہی اس کے پاس چلے جائیں گے۔ چنانچہ ایک دن علی الصبح یہ اس کنیز کے پاس پہنچ گئے۔ کنیز کو معلوم نہیں کس طرح، عبداللہ کی آمد کا علم ہو گیا تھا، اس نے انہیں دروازے ہی پر روک لیا، گھبرائے لہجے میں بولی۔ "عبداللہ! اب بات حد سے بھی آگے نکل گئی ہے۔ ان نازک حالات میں اگر میں تمہارا ساتھ دیتی ہوں تو مجھے ہر وقت دو خوف ستاتے رہیں گے۔ ایک خوف تو یہ کہ میرا آقا یہ پسند ہی کیوں کرنے لگا کہ تم اپنی ناپاک خواہشات کے ساتھ اس کے گھر میں آ جاؤ۔ جس دن اسے یہ بات معلوم ہو گئی وہ ہم دونوں کو ذلیل اور رسوا کر ڈالے گا اور دوسرا خوف یہ ہے کہ تمہاری ماں مجھے قبول ہی کیوں کرے گی؟"

عبداللہ نے جواب دیا۔ "میں اپنی ماں کو آمادہ کر لوں گا تو کیوں فکر کرے۔"

کنیز نے پریشانی سے کہا۔ "تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ میرا آقا بس آنے ہی والا ہے۔ تم خدا کے لیے یہاں سے چلے جاؤ اور اس وقت تک یہاں نہ آنا جب تک میں خود تمہیں نہ بلا بھیجوں!"

کنیز نے عبداللہ کے جواب کا بھی انتظار نہ کیا، انہیں دھکا دے کر باہر کر دیا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ کنیز کی اس روشِ بے رُخی نے عبداللہ کے دل پر آرے سے چلا دیے تھے۔ ان پر غیرت نے حملہ کر دیا اور وہ گھنٹوں اپنی ذلت اور بے غیرتی پر آنسو بہاتے رہے۔

اس رات جب وہ بستر پر گئے تو آدھی رات کے بعد انہیں ایسا محسوس ہوا گویا بستر انہیں دھکا دے کر حکم دے رہا ہے کہ چل نکل، کوئے یار کا رُخ کر۔ انہوں نے بستر چھوڑ دیا اور پڑوسی کے مکان کے سامنے کھڑے ہو کر کنیز کی ایک جھلک دید کا انتظار کرنے لگے۔

رات بالکل تاریک تھی۔ کنیز کا مکان سیاہی کی چادر میں لپٹا خاموش کھڑا تھا۔ مکان کے کسی روزن سے ہلکی ہلکی روشنی چھن رہی تھی۔ ان کے سینے میں بھی ایک آگ روشن تھی، اس کی گرمی کے سہارے یہ ایک درخت سے پُشت لگا کر کھڑے ہو گئے اور کنیز کے تصور میں مگن، مکان پر ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگے۔ اس وقت ان کے دل سے ہوک سی اٹھ رہی تھی اور انہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور اس کام میں ان کے لیے عزت ہے یا ذلت۔ اسی طرح پوری رات گزار دی، صبح مؤذن نے اذان کہی تو انہیں ذرا ہوش آیا۔

ماں کئی بار خالی بستر دیکھ کر واپس جا چکی تھیں۔ انہیں حیرت اور پریشانی

تھی کہ عبداللہ کچھ بتائے بغیر آخر چلے کہاں گئے ہ فجر کے وقت بیٹے کو گھر میں داخل ہوتے جو دیکھا تو ماں نے انہیں آغوش میں لے لیا اور مضطرب لہجے میں دریافت کیا "بیٹا! تو رات بھر غائب کہاں رہا ہ"

عبداللہ کا چہرہ اترا ہوا تھا اور صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنی زندگی سے بے زار ہیں۔

جب بیٹے نے کوئی جواب نہ دیا تو ماں نے ذرا درشتی سے پوچھا۔

"عبداللہ! تو میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتا، میں تجھ سے کیا پوچھ رہی ہوں ہ"

عبداللہ نے جواب دیا "ماں، میں آپ کی بات کا کیا جواب دوں! میں بہت پریشان ہوں آج کل"

"تو مجھے بتا اپنی پریشانی، شاید میں اس کا کوئی علاج بتا سکوں"

وہ اور زیادہ اداس ہو گئے، بولے "ماں! مجھے معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے کہ میرا دل ہر وقت ویرانے میں چلا جانا چاہتا ہے"

ماں حیرت اور تشویش سے عبداللہ کی صورت دیکھتی رہیں، پھر بولیں۔

"اچھا تو مجھے ایک بات تو بتا۔ یہ کنیز کا کیا چکر ہے، کہیں تو سچ مچ تو اس کی محبت میں نہیں گرفتار ہو گیا ہے ہ"

عبداللہ سے جھوٹ نہیں بولا گیا، بولے "ماں! میں بالکل مجبور اور بے بس ہو گیا ہوں"

اس کے بعد وہ سسکیاں لے کر رونے لگے۔

ماں سامنے سے ہٹ گئیں۔ وہ اس موضوع پر مزید کوئی بات کر کے لڑکے کا ہیاؤ نہیں کھولنا چاہتی تھیں۔ عبداللہ نے ہوش میں آکر جب سر اوپر اٹھایا

تو ماں کو موجود نہ پا کر بے اختیار رونا شروع کر دیا۔ وہ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ "او خدایا! میں کتنا ظالم ہوں کہ میں نے ایک کنیز کی چاہ میں پوری رات برباد کر دی۔ میں نے ایک مادی اور فانی شے سے عشق کر کے خود کو کتنا حقیر اور ذلیل کر لیا ہے۔ اگر یہی وقت میں تیری یاد میں گزارتا تو شاید تو مجھے مایوس نہ کرتا۔"

وہ دیر تک بیٹھے آنسو بہاتے رہے آخر وہ یہ فیصلہ کر کے اٹھے کہ اب انہیں کنیز کا خیال نہایت بے دردی سے نکال دینا ہے۔

* * * * * *

عبداللہ نے خود کو خدا کے لیے وقف کر دیا۔ انہوں نے دنیا چھوڑ دی۔ مرو میں چاروں طرف یہ شہرہ ہو گیا کہ مبارک کے نوجوان بیٹے عبداللہ نے ایک کنیز کی محبت سے تائب ہو کر خدا سے لو لگالی ہے اور ان کی عبادت اور ریاضت کا یہ حال ہے کہ بڑے بڑے عابد اور زاہد بھی اس پائے کی ریاضت نہیں کر سکتے۔

کنیز کے دل پہ چوٹ سی لگی کہ یہ کیا ہو گیا۔ ایک رات، اندھیرے میں چھپتی چھپاتی وہ عبداللہ کے حجرے کے در پہ آ کھڑی ہوئی۔ اس نے قدرے تامل کے بعد دروازے پہ دستک دی۔ اس وقت آپ تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے، سلام پھیرنے کے بعد دریافت کیا "کون ہے؟"

کنیز نے نہایت دلکش لہجے میں کہا "عبداللہ! دروازہ کھولو!"

عبداللہ نے بے رخی سے کہا "اندر آ کر کیا کرو گی؟ میں دروازہ نہیں کھولوں گا۔"

کنیز نے خوشامد کا سہارا لیا، بولی "دیکھو، میں پھر یہ کہوں گی کہ تم

نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔"

"ہو سکتا ہے تیری یہ بات درست ہو لیکن میں اس وقت حجرے سے باہر نہیں نکلوں گا۔ تجھے جو کچھ کہنا سننا ہے باہر ہی سے کہہ سن لے۔"

کنیز نے غمزہ دکھایا اور کہا "تم مجھ سے ناراض ہو گئے ہو خدا کی قسم تم مجھ سے جس کی چاہو قسم لے لو، میں اب اور آج بھی تم ہی سے محبت کرتی ہوں۔ تم معلوم نہیں کیوں میری بات پر اعتماد نہیں کر رہے ہو۔"

عبداللہ نے جواب دیا "میں تو بس اتنی سی بات جانتا ہوں کہ اس رات تو نے مجھ پر اگر رحم نہ کیا ہوتا تو شاید میں اپنے اللہ سے بھی نہ رجوع ہوا ہوتا اب تو واپس چلی جا۔"

کنیز نے دھمکی دی "عبداللہ! اگر تم نے دروازہ نہ کھولا تو میں یہیں بیٹھ جاؤں گی اور چیخ چیخ کر روؤں گی، یہاں تک کہ یہاں لوگوں کا مجمع لگ جائے گا اس وقت میں تمہیں ذلیل اور رسوا کر ڈالوں گی۔"

عبداللہ نے ہنس کر کہا "عورت! میں دنیا سے نہیں ڈرتا، میں اپنے خدا سے ڈرتا ہوں۔ اس وقت بھی میں اسی لیے دروازہ کھول رہا ہوں کہ کہیں خدا یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ میں تجھ سے یا تیری جیسی دوسری عورتوں سے خوفزدہ رہتا ہوں۔ آ اور بے تکلفی سے میرے روبرو آ کے کھڑی ہو جا اور تجھے قسم ہے کہ اپنے ناز و ادا کے جتنے کرشمے دکھا سکتی ہے، مجھ پر آزما ڈال، میں دیکھوں گا کہ میں ان سے کس طرح گھائل ہوتا ہوں۔"

حجرے کا در کھل گیا۔ کنیز اندر داخل ہو گئی۔ رنگین لباس میں ملبوس کنیز آسمانی حور معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اشکبار نظروں سے عبداللہ کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا "عبداللہ! کیا تم نے مجھے واقعی بھلا دیا ہے؟"

عبداللہ نے جواب دیا "میرے پاس اس فضول سوال کا کوئی جواب نہیں"

کنیز نے کہا "میں تمہاری جدائی اور مفارقت میں زندہ نہیں رہونگی"

عبداللہ نے جواب دیا "یقیناً جب گناہ بڑھ جائیں اور نیک بننے کی راہیں بند ہو جائیں تو اس شخص کے لیے زمین کا اُوپر نہیں، اندر بہتر ہے"

کنیز نے دانت پیستے ہوئے کہا "اب تم اتنے بڑے دیندار ہو گئے ہو کہ تمہارے دل میں انسانی حُسن کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی۔ کیا تم دنیا سے اس حد تک تعلق منقطع کر لوگے کہ اس کی کسی شے کی تمہیں ضرورت ہی نہ پیش آئے؟"

عبداللہ نے جواب دیا "میں نے دنیا سے اپنا تعلق منقطع ہی کہاں کیا ہے ہاں میں اس کی عیّاریوں اور مکّاریوں سے بچنے کی کوشش ضرور کر رہا ہوں۔ اگر اس کی مدد شامل حال رہی تو میں اپنی کوشش میں کامیاب ضرور ہو جاؤں گا۔ اس کی تائید کے بغیر ہر کام مشکل ہے"

کنیز نے پوچھا "کیا میں واپس جاؤں؟"

عبداللہ نے کہا "ہاں تو واپس جا اور یہ سمجھ لے کہ وہ عبداللہ جو کبھی اپنے سینے میں تیرے عشق کا چراغ فروزاں رکھتا تھا، وہ مر چکا اب اس کی جگہ دوسرے عبداللہ نے لے لی ہے اور اس عبداللہ کے دل میں جو چراغ روشن ہوا ہے اسے بجھایا نہیں جا سکتا"

کنیز کھڑی حسرت سے عبداللہ کو دیکھتی رہی اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی واپس چلی گئی۔

✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣

آپ ایک عرصے تک خلوت نشین رہے اور عبادت و ریاضت کی کڑی

مشقیں جھیلتے رہے، پھر سیر و سیاحت کا شوق ہوا۔ مرو سے نکل کر مختلف دیار و امصار کی سیر کرتے رہے۔ اب ان میں وہ اوصاف پیدا ہو چکے تھے جو مردانِ خدا و خود آگاہ کا خاصہ سمجھتے جاتے ہیں۔ آپ کو ان دنوں یہ خواہش بہت ستاتی رہتی تھی کہ خدا انہیں اپنا مقبول بندہ بنالے۔ اس خواہش کو لیے ہوئے وہ نیشاپور میں داخل ہوئے۔ یہ شدید سردیوں کا موسم تھا، اس کڑے موسم میں آپ نے نیشاپور کے ایک بازار میں کسی شخص کو سردی میں ٹھٹھرتے سکڑتے دیکھا۔ آپ کو اس کی حالتِ زار پر رحم آگیا، اس سے پوچھا "اے شخص! تو کون ہے؟"

اس نے جواب دیا "میں اس شہر کے ایک رئیس کا غلام ہوں۔"

آپ نے پوچھا "کیا تیرے پاس سردیوں سے بچنے کا لباس نہیں ہے؟"

اس نے جواب دیا "کیا تو نے میری بات نہیں سنی؟ میں نے ابھی تجھے بتایا ہے کہ میں اس شہر کے ایک رئیس کا غلام ہوں اور گرم لباسوں کی اس کے پاس کوئی کمی نہیں۔"

آپ نے کہا "پھر تو اس سے ایک آدھ پوستین ہی مانگ لے تاکہ تو سردی کی اذیت سے بچ جائے۔"

غلام نے جھنجلا کر جواب دیا "تو کیسا نوجوان ہے کہ تیری سمجھ میں میری کوئی بات ہی نہیں آتی۔ پوستین وغیرہ میرے مالک کے پاس ہیں۔ کیا اسے نہیں معلوم کہ یہ شدید سردیوں کا موسم ہے اور اس میں ہر جاندار کو گرمی کی ضرورت ہے۔ کیا میرا مالک یہ نہیں جانتا کہ مجھے گرم لباس کی ضرورت ہے؟ اسے میری یہ بنیادی ضرورت کسی خواہش اور مطالبے کے بغیر ہی پوری کر دینا

چاہیئے۔ اگر اسے اس کا خود خیال نہیں ہے تو میں بھی درخواست کر کے اپنی بات بیکار نہیں کرنا چاہتا۔"

عبداللہ کے دل میں ایک تیر سا پیوست ہو گیا۔ غلام نے معرفت کا وہ نکتہ بیان کر دیا تھا جو ابھی تک ان کی فکر و نظر سے اوجھل تھا۔ آپ نے آہستہ سے کہا۔" بیشک جب اسے تیری ضرورتوں کا یقینی علم ہے تو اسے زبان سے ادا کرنا فضول اور بے معنی ہے۔"

آپ نے اسی وقت اپنے دل سے یہ خواہش نکال دی کہ خدا انہیں مردان خدا و خود آگاہ کی صف میں شامل فرما کے اپنا مقبول بندہ بنا لے۔

آپ حج کے لیے مکۂ معظمہ روانہ ہو گئے۔ راستے میں تاخیر ہو گئی اور آپ کو اس احساس نے پریشان کر دیا کہ حج میں صرف چار دن باقی رہ گئے ہیں اور راستہ دنل بارہ دن سے زیادہ کا تھا۔ ابھی وہ اسی فکر میں تھے کہ انہیں ایک بڑھیا اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ بڑھیا قریب آکر بولی" نوجوان! تو پریشان کیوں ہے؟"

آپ نے جواب دیا" بڑی بی! مجھے اپنے حج کے ضائع جانے کا بڑا افسوس ہے۔ حج میں چار دن باقی رہ گئے ہیں۔ اب میں وہاں کسی طرح بھی نہیں پہنچ سکتا۔"

بڑی بی نے کہا" تو فکر نہ کر، حج کراؤں گی تیرا۔ آ میرے ساتھ چل۔"

آپ نے حیرت سے کہا" کیا میں یہ طویل سفر چار دن کے اندر طے کر لوں گا؟"

بڑی بی نے اطمینان سے جواب دیا" تو فکر نہ کر، میرے ساتھ ساتھ چل۔"

عبداللہ بڑی بی کے ساتھ سفر کرنے لگے۔ یہ دونوں دیر تک سفر کرتے رہے۔ راستے میں دریا آگیا۔ عبداللہ نے بے بسی سے کہا "اب اس دریا کو میں کس طرح عبور کروں گا۔ نہ کشتی ہے نہ پُل"

بڑی بی نے کہا "اپنی آنکھیں بند کر لے نوجوان"

عبداللہ نے آنکھیں بند کرلیں۔ بڑی بی اس کا ہاتھ پکڑ کے دریا میں داخل ہوگئیں۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ دریا عبور کرنے لگے۔ عبداللہ نے محسوس کیا کہ وہ کمر تک پانی میں سفر کر رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد بڑی بی نے حکم دیا۔ "اپنی آنکھیں کھول دے نوجوان"

عبداللہ نے آنکھیں کھول دیں اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ دریا کو عبور کر چکے ہیں۔ راستے میں کئی دریا آئے اور انہیں اسی طرح عبور کیا گیا اور پھر انہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ دونوں اپنی امید اور توقع سے زیادہ سفر طے کر چکے ہیں۔ ہر دریا کو عبور کرنے کے بعد انہیں محسوس ہوتا کہ وہ خاصا فاصلہ طے کر چکے ہیں۔ یہاں تک کہ ٹھیک چوتھے دن وہ دونوں عرفات کے میدان میں داخل ہو چکے تھے۔ دونوں نے حج کیا۔ عبداللہ نے خدا کا شکر ادا کیا۔

بڑی بی نے عبداللہ سے کہا "اب تو تیرا حج ہو چکا، اب کیا ارادے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "جیسا آپ حکم دیں"

بڑی بی نے کہا "اگر تیرے پاس وقت ہے تو ذرا میرے ساتھ چل، میں تجھے اپنے بیٹے کے پاس لے چلوں۔ اس سے ملاقات کراؤں، امید ہے تو اس سے مل کر بہت خوش ہوگا"

آپ نے کہا: "میں آپ کی بات کس طرح ٹال سکتا ہوں؟"

بڑی بی عبداللہ کو ساتھ لے کر ایک جگہ پہنچیں وہاں ایک دبلا پتلا نحیف و نزار نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ اس نقاہت اور کمزوری میں بھی اس کے چہرے سے نور ٹپک رہا تھا۔ بڑی بی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ میرا بیٹا ہے۔ اس سے مل۔ میں اسی کی خاطر اتنا لمبا سفر طے کر کے آئی ہوں۔"

کمزور نوجوان، ماں کو دیکھتے ہی ان کے قدموں میں گر گیا اور بشاش لہجے میں کہنے لگا: "ماں! میں جانتا ہوں کہ آپ دونوں یہاں کیوں آئے ہیں۔"

آپ نے پوچھا: "بھلا بتانا تو ہم دونوں یہاں کیوں آئے ہیں؟"

نوجوان نے جواب دیا: "میری تجہیز و تکفین کے لیے!"

بڑی بی نے عبداللہ سے کہا: "کیا تو میرے بیٹے کے چہرے پر کوئی خاص بات محسوس کر رہا ہے؟"

عبداللہ نے جواب دیا: "ہاں میں اس کے چہرے پر حیرت انگیز طمانیت اور بشاشت محسوس کر رہا ہوں، حالانکہ دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے انسان کو بڑا دکھ اور خوف محسوس ہوتا ہے!"

نوجوان نے ہنس کر کہا: "لیکن جن کے نامۂ اعمال میں راضی بہ رضائے الٰہی لکھا ہوتا ہے وہ کسی قسم کا خوف یا دکھ نہیں محسوس کرتے۔"

بڑی بی نے کہا: "ہم لوگ مشیتِ الٰہی پر شاکر رہتے ہیں اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے اس میں خدا کی طرف سے کسی ظلم و زیادتی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔"

نوجوان نے ماں سے کہا: "ماں! میں جا رہا ہوں، خدا حافظ۔"

بڑی بی نے اٹھ کر بیٹے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور اس نے

آخر ہچکی لی اور دنیا سے رخصت ہو گیا۔

دونوں نے اس کی تکفین و تدفین کا کام انجام دیا۔ عبداللہ نے سوچا کہ معلوم نہیں اب بڑی بی انہیں کیا حکم دیں۔ بڑی بی نے خود ہی کہا "نوجوان! اب تو جا سکتا ہے۔ میں یہیں بیٹے کی قبر کی مجاوری کروں گی۔"

عبداللہ نے دکھ سے پوچھا "اب آپ سے کب اور کہاں ملاقات ہوگی؟"

بڑی بی نے جواب دیا "کبھی اور کہیں بھی نہیں۔ یہاں سے ہم دونوں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے!"

عبداللہ نے بے چینی سے پوچھا "یہ کیوں؟ آخر ایسا کیوں؟"

بڑی بی نے کہا "عبداللہ! میں جانتی ہوں کہ تو اگلے سال پھر ادھر آئے گا لیکن اس وقت تک میں اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہوں گی۔"

عبداللہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

بڑی بی نے اس نمی کو محسوس کر لیا، بولیں "کیا تو ابھی تک راضی بہ رضائے الٰہی کے نکتے سے واقف نہیں ہوا؟ تو روتا کیوں ہے جا اور میرے بعد میرے حق میں دعائے خیر کرتا رہ۔"

عبداللہ وہاں سے چلے آئے اور اپنے وطن واپس پہنچے۔ یہاں انہوں نے اپنے لیے ایک معمولی پیشہ اختیار کیا۔ آپ نے طے کیا کہ ایک سال تو حج کریں گے، دوسرے سال جہاد میں شریک ہوں گے اور تیسرے سال تجارت کریں گے اور اس سے جو نفع کمائیں گے اسے مستحقین میں تقسیم فرما دیں گے، چنانچہ اس پر آپ نے سختی سے عمل کیا۔

آپ نے حج اور جہاد کے بعد تجارت شروع کی اور اس سے جو نفع کمایا اسے مستحقین اور فقراء میں تقسیم کر دیا۔ اس موقع پر آپ نے ایک عجیب سا طریقہ

اختیار کیا۔ آپ نے فقراء کے سامنے بہت ساری کھجوریں رکھ دیں اور کہا کھجوریں کھا کھا کر گٹھلیاں اپنے سامنے رکھتے جاؤ۔"

جب یہ لوگ کھجوریں کھا چکے تو آپ نے ان کے سامنے رکھی ہوئی گٹھلیاں شمار کیں اور جس کے سامنے جتنی گٹھلیاں رکھی ملیں آپ نے اسے اتنے ہی درہم مرحمت فرما دیے۔

آپ کے گھر میں ایک غلام کام دھندے پہ متعین تھا۔ آپ نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ اگر تم مجھے اتنی رقم ادا کر دو جتنی میں نے تیری خریداری پر خرچ کی ہے تو میں تجھے آزاد کر دوں گا۔ یہ غلام گھر کے کاموں سے فرصت پا کر محنت مزدوری کرنے چلا جاتا۔

ایک دن آپ کے پاس قبرستان سے ایک آدمی آیا اور آپ سے پوچھا۔
"جناب! آپ کا غلام گھر کے کاموں سے فرصت پاکر کہاں چلا جاتا ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔" میں نے اپنے غلام سے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ اگر وہ اپنی ادا کی ہوئی قیمت مجھے ادا کر دے تو میں اسے آزاد کر دوں گا۔ وہ اس رقم کی حصولیابی کے لیے محنت مزدوری کرنے نکل جاتا ہے۔"

اجنبی نے کہا۔" حضرت! آپ کا یہ خیال ہی خیال ہے کہ وہ محنت مزدوری کرنے جاتا ہے لیکن میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ فرصت پاکر ہر روز قبرستان پہنچ جاتا ہے اور وہاں سے کفن چرا کر، اسے فروخت کر دیتا ہے۔"

آپ نے چونک کر پوچھا۔" کیا یہ تم پورے وثوق سے کہہ رہے ہو؟"

اجنبی نے جواب دیا۔" یہ سب کچھ میں پورے وثوق اور اعتماد سے کہہ رہا ہوں۔"

"اس کا ثبوت؟"

"اس کا پہلا ثبوت تو یہ ہے کہ آپ ذرا سوچ کر بتائیے کہ آپ کا غلام کیا رات کو بھی گھر کے اندر ہی موجود رہتا ہے؟"

آپ نے غور کیا تو یاد آیا کہ ان کا غلام واقعی رات کو گھر میں موجود نہیں ہوتا۔ کہاں جاتا ہے؟ انہیں کچھ پتہ نہ تھا۔ اجنبی کو جواب دیا "ہاں، اب مجھے یاد آیا کہ وہ رات کو گھر میں نہیں ہوتا۔"

اجنبی نے کہا۔ "تب پھر آپ آج کی رات میرے ساتھ زحمت کیجیے میں سارا تماشا دکھا دوں گا۔"

آپ نے اس اجنبی کو گھر ہی میں روک لیا۔ رات کو حسب معمول غلام، گھر کے کام دھندوں سے نجات حاصل کر کے باہر نکلا، اسی وقت غلام کے پیچھے اجنبی کے ساتھ آپ بھی چل پڑے۔ غلام واقعی قبرستان کی طرف جا رہا تھا۔ آپ کو اس وقت بہت دکھ تھا۔ انہیں اس وقت یہ غم بہت ستا رہا تھا کہ اب تک غلام نے انہیں جتنی رقم ادا کی تھی وہ ساری کفن چوری کر کے دی گئی تھی۔

غلام قبرستان میں داخل ہو کر ایک قبر کے قریب جا کھڑا ہوا۔ کچھ دیر وہ یونہی کھڑا رہا، پھر اس نے قبر کے اوپر سے پتھر ہٹایا اور اندر داخل ہو گیا۔ آپ اجنبی کے ساتھ باہر کھڑے غلام کی واپسی کا انتظار کرتے رہے لیکن جب وہ دیر تک باہر نہ نکلا تو آپ نے احتیاط سے اندر جھانک کر دیکھا۔ اندر ایک دیا روشن تھا، آپ نے اس کی روشنی میں دیکھا، غلام نے ٹاٹ کے کپڑے پہن رکھے تھے اس کے گلے میں ایک طوق پڑا تھا، وہ عبادت میں مشغول تھا۔ پھر آپ نے اس کی گریہ وزاری کی آواز سنی۔ آپ کو اپنے شک وشبہ اور سوءظنی پر بے حد افسوس ہوا۔ آپ کو رونا آ گیا، اجنبی سے کہا۔ "تو تو یہ کہتا تھا

کہ میرا غلام چوری کرتا ہے، کفن چرا کے فروخت کرتا ہے لیکن اس کے برعکس میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟"

اجنبی بھی شرمسار تھا، افسوس کرتا ہوا بولا۔"میں نے اسے قبر کے اندر سے نکلتے دیکھا تھا اس لیے یہ خیال ہوا کہ یہ کفن چوری کرتا ہے۔ دلوں کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔"

آپ نے اجنبی سے کہا۔"اب تم جا سکتے ہو۔"

اجنبی نے پوچھا۔"کیا آپ یہیں ٹھہریں گے؟"

"ہاں۔"

"کب تک؟"

"جب تک کہ یہ قبر کے اندر رہے گا۔ جب یہ باہر نکلے گا تو میں اس سے معافی چاہوں گا۔"

اجنبی چلا گیا۔ غلام اندر نماز پڑھتا رہا اور آپ باہر عبادت میں مشغول رہے۔

فجر کی نماز سے ذرا پہلے غلام قبر سے باہر نکلا۔ آپ نے بھی عبادت بند کی اور اس کے پیچھے پیچھے چل دیے۔ وہ ایک مسجد میں داخل ہو گیا، آپ بھی مسجد میں چلے گئے۔ وہاں دونوں نے الگ الگ صفوں میں کھڑے ہو کر نماز فجر ادا کی۔ لوگ نماز پڑھ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ آپ غلام سے ذرا دور وہیں موجود رہے۔ غلام نے بارگاہ ایزدی میں الحاح وزاری شروع کر دی۔

"خدایا! میں نے پوری رات حسب معمول تیری یاد میں گزار دی، کیونکہ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تیرے ذکر سے افضل بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ اب میں اپنے مالک کے پاس جاؤں گا وہ مجھ سے درہموں کا مطالبہ کرے گا۔ اب تو ہی بتا

بتا کہ میں یہ درہم کہاں سے لاؤں ؟"

ابھی اس کی دعا ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ اوپر سے ایک نور سا نمودار ہوا۔ اس کا رخ غلام کے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کی طرف تھا۔ یہ نور ہتھیلیوں میں درہموں کی شکل اختیار کر گیا۔ آپ اسی وقت غلام کے قدموں میں گر گئے۔ غلام آپ کو اپنے قدموں میں گرا ہوا دیکھ کر گھبرا گیا، آپ کو قدموں سے اٹھاتا ہوا بولا۔

"حضرت! یہ آپ! آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟"

آپ نے رقت زدہ لہجے میں فرمایا۔ "کاش میں تیرا غلام ہوتا اور تو میرا آقا۔ میں تجھ سے بہت شرمسار ہوں۔"

غلام نے آپ کو قدموں سے اٹھا کر، خدا سے دعا کی۔ "اے اللہ میرا راز فاش ہو چکا ہے اس لیے میں اب اس دنیا میں نہیں رہنا چاہتا۔ تو مجھے اب اٹھا لے۔"

یہ کہتا ہوا وہ آپ کی آغوش میں گر گیا اور جان دے دی۔ آپ نے اسے اسی ٹاٹ کے لباس میں دفن کر دیا۔ اسی رات آپ نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں اور شکایتاً فرما رہے ہیں کہ "عبداللہ! تو نے میرے دوست کو ٹاٹ کے کفن میں کیوں دفن کیا؟"

آپ نے شرمندگی سے عرض کیا۔ "حضورؐ! آپ کے دوست کو یہی لباس پسند تھا اس لیے اس کے پسندیدہ لباس ہی میں میں نے دفن کر دیا۔"

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

وہ سال آپ کے جہاد کا سال تھا۔ آپ جہاد پر تشریف لے گئے۔ ہنگامۂ کارزار گرم تھا آپ نہایت جوش و خروش سے جنگ کر رہے تھے کہ نماز کا وقت آ گیا۔ آپ نے اپنے مقابل سپہ سالار سے کہا۔ "میں نماز پڑھنا

چاہتا ہوں کیا تیری جنگی اخلاقیات میں اتنی گنجائش ہے کہ وہ عبادت کے دوران مجھ سے تعرض نہ کرے؟"

مقابل سپہ سالار نے فراخدلی کا ثبوت دیا۔" آپ نماز پڑھ لیں، اتنی دیر جنگ رکی رہے گی۔"

آپ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ نماز پڑھی اور ادھر سے فارغ ہو کر آپ نے دوبارہ جنگ شروع کرنے کا اعلان کر دیا۔

کچھ دیر بعد مقابل سپہ سالار آپ کے پاس آیا اور عرض کیا۔" حضرت! اب ہماری عبادت کا وقت آگیا ہے کیا آپ کی جنگی اخلاقیات میں تھوڑی دیر کے وقفے کی گنجائش ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔" بالکل۔ ہم لوگ اس وقت تک اپنے ہاتھ روکے رکھیں گے جب تک کہ آپ دوبارہ جنگ شروع کرنے کا اعلان نہ کریں گے۔"

کفّار اپنی عبادت میں مشغول ہو گئے۔ اسی دوران شیطان نے آپ کے دل میں وسوسہ ڈالا۔" عبداللہ! فتح حاصل کرنے کا یہ بہترین موقع ہے، اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان غافلوں پر حملہ کر کے شاندار فتح حاصل کی جا سکتی ہے اور اس طرح حق کو باطل سے نجات بھی مل جائے گی۔"

آپ اپنے دشمنوں کے خلاف قدم اٹھانے ہی والے تھے کہ کسی نے کان میں قرآن پاک کی یہ آیت ڈال دی۔ .... ترجمہ:" تم سے قیامت میں عہد شکنی کی باز پرس ہو گی، لہٰذا اپنے ارادے سے باز آجاؤ۔"

اس تنبیہ نے آپ کی حالت غیر کر دی۔ رونے لگے۔ مقابل سپہ سالار نے، عبادت سے فارغ ہو کر آپ کو روتے ہو دیکھا تو اس کا سبب دریافت کیا۔

آپ نے بلا جھجک سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ حریف سپہ سالار کسی سوچ میں پڑ گیا۔ آپ نے روتے ہوئے پوچھا "کیا جنگ کا اعلان کر دیا جائے؟"

حریف سپہ سالار نے کہا "ابھی نہیں، ذرا ٹھہریے۔"

آپ اس کی شکل دیکھتے رہے، وہ بہت زیادہ فکرمند نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے آپ سے سوال کیا "کیا آپ واقعی بدعہدی پر مائل تھے اور آپ کے خدا نے آپ کو اس سے باز رکھا؟"

آپ نے جواب دیا "میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ خدا کی تنبیہہ نے میرے ہاتھ پکڑ لیے تھے ورنہ میں یہ غلط قدم ضرور اٹھاتا۔"

مقابل سپہ سالار نے اپنا فیصلہ سنا دیا "میں آپ سے جنگ نہیں کروں گا کیونکہ میرے دل پر آپ کے خدا کی تنبیہہ کا بڑا اثر ہوا ہے۔ آپ کے خدا نے دشمنوں کی حمایت میں آپ کو یعنی اپنے دوست کو ڈانٹ دیا۔ اس بات نے میرے دل پر بڑا اثر کیا ہے۔ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔"

وہ اسی وقت مسلمان ہو گیا اور آپ نے یہ جنگ مزید خون ریزی کے بغیر ہی جیت لی۔

واپسی میں آپ نے ایک گرجے میں کسی پادری کو دیکھا جو حد درجہ عبادت اور مجاہدوں کی وجہ سے بہت کمزور ہو گیا تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا "کیا تو خدا کے راستے سے واقف ہے؟"

اس نے جواب دیا "عبداللہ! تم یہ سوال مجھ سے کر رہے ہو؟ تم تو عارف ہو اور تم خدا کے راستے سے ضرور واقف ہو گے پھر تم نے یہ سوال مجھ سے کیوں کیا؟"

آپ نے کہا "عبادات اور مجاہدوں نے تیری صحت کو تباہ کر کے رکھ دیا

ہے، کیا اب بھی تو خدا کے راستے سے واقف نہیں ہوا؟"

پادری نے عاجزی سے جواب دیا "عبداللہ! یہ حقیقت ہے کہ میں نے خدا کو اب تک نہیں پہچانا اور اسے نہ پہچاننے کے باوجود اس سے خوف زدہ ہونے کا یہ عالم ہے کہ میں ہر دم سوکھتا چلا جا رہا ہوں اور تم عارف ہونے کے باوجود اس سے خوف زدہ نہیں نظر آتے۔"

پادری کی باتوں نے آپ کو اتنا خوف زدہ کر دیا کہ اس کے بعد کوئی دن بھی ایسا نہ آیا کہ آپ نے اللہ کا خوف نہ محسوس کیا ہو۔

اسی خوف زدگی کی حالت میں لوگ آپ سے ملے تو بڑا تغیّر محسوس کیا۔ ملنے والے آپ کی پریشانی کا اصل سبب نہیں جانتے تھے۔ وہ طرح طرح سے دل جوئی اور دل داری کرتے رہے لیکن آپ کو کسی طرح سکون ہی نہ ملتا تھا۔ ان ہی لوگوں میں ایک آتش پرست بھی آپ کے پاس آیا۔ اس نے حاضرین سے کہا "لوگو میں نہیں جانتا کہ عبداللہ کیوں پریشان ہیں؟ لیکن میں ایک بات ضرور جانتا ہوں۔ تم میں سے جو لوگ اس پر پہلے ہی سے کاربند ہیں، انہیں اس پر توجہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن جو اس نکتے سے ناواقف یا لاعلم ہیں انہیں اس پر آج ہی سے عملدرآمد شروع کر دینا چاہیئے۔"

آپ نے کہا "تو بولتا ہی رہے گا یا کچھ کہے گا بھی؟"

آتش پرست نے کہا "دانشمند وہ ہے جو اوّل دن ہی وہ کام انجام دے جس کو نادان تیسرے دن انجام دیتے ہیں۔" پھر حاضرین سے پوچھا "کیا تم لوگوں نے میری بات کا مفہوم پالیا؟"

آپ نے لوگوں سے کہا "لوگو! اس آتش پرست کے قول کو ہر وقت اور ہمیشہ یاد رکھنا۔ یہ بڑی عظیم نصیحت ہے اور اس نصیحت سے لاعلم رہ کر میں اپنے

ماضی کا ماتم کر رہا ہوں۔"

اسی موقعے پر لوگوں نے آپ سے پوچھا "حضرت! یہ تو بتائیے کون سی عادتیں سود مند ہو سکتی ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "عقلِ کامل سے متعلقہ عادتیں سود مند ہوتی ہیں۔"

کسی نے کہا "اگر کسی کے پاس عقلِ کامل نہ ہو تو؟"

آپ نے کہا "پھر تو اس کے پاس حسنِ ادب کا ہونا ضروری ہے۔"

کسی دوسرے نے کہا "اگر کوئی حسنِ ادب سے بھی محروم ہو تو؟"

آپ نے جواب دیا "تب پھر اسے اتنا شفیق بن جانا چاہیئے کہ لوگ اسے اپنا مخلص اور شفیق بھائی سمجھ کر مشورے کیا کریں۔"

کسی اور نے کہا "اگر یہ بھی ناممکن ہو تو؟"

آپ نے جواب دیا "پھر تو اسے سکوت اختیار کر لینا چاہیئے کیونکہ سکوت بہت سے عیوب کی پردہ پوشی کرتا ہے۔"

معترض نے کہا "اگر کوئی اس پر بھی قدرت نہ رکھتا ہو تو؟"

آپ نے جواب دیا "تب پھر ایسے شخص کے لیے مرگِ ناگہاں بہت سود مند ہے تاکہ لوگ اور وہ خود اپنی نحوست سے چھٹکارا پا جائے۔"

اس مجلس میں کچھ ایسے لوگ بھی موجود تھے جنھوں نے سکوت اختیار کر رکھا تھا، ان میں سے کسی نے دریافت کیا "حضرت! یہ تو فرمائیے کہ قلب کا معالجہ کس طرح کیا جائے؟"

آپ نے جواب دیا "لوگوں سے کنارہ کشی اور قربِ الٰہی سے۔"

اس نے وضاحت چاہی "وہ کس طرح؟"

آپ نے جواب دیا "لوگوں سے بچو اور کوشش یہ رہے کہ ان کی

امداد واعانت کے عادی نہ رہو۔ اللہ پہ توکل رکھو۔"

کسی اور نے دریافت کیا۔" تواضع کا مفہوم کیا ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ تواضع کا اصل مفہوم یہ ہے کہ تم امراء سے غرور کرو اور فقراء کے ساتھ عاجزی سے پیش آؤ۔" پھر ذرا سکوت اختیار کیا اور دوبارہ فرمایا۔" لوگو! جو لوگ دنیاوی مراتب میں تم سے برتر ہوں، ان کے ساتھ تم تکبر سے پیش آؤ اور جو تم سے کمتر ہوں ان کے ساتھ عاجزی اور انکسار سے پیش آؤ۔"

کسی نے پھر سوال کیا۔" کیا رجا سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔" یہ درست ہے لیکن جس رجا میں خوف نہ شامل ہوگا وہ بہت جلد ختم ہو جائے گا۔"

ایک نے کہا۔" اور آپ کے نزدیک مراقبے کا کیا مطلب ہے؟

آپ نے کہا۔" مراقبے دو ہوتے ہیں۔ ایک ظاہری دوسرا باطنی۔ دونوں مراقبوں کا مطلب یہ ہے کہ قلب کا خوف دور ہو جائے اور اس کی جگہ سکون لے لے۔"

کسی نے اپنے کسی ساتھی کی شکایت کی۔" حضرت! میرا ایک دوست ہے وہ اکثر کسی نہ کسی کی غیبت کیا کرتا ہے آپ اس کے حق میں دعا فرمائیے کہ اس کی یہ عادت قبیحہ چھوٹ جائے۔"

آپ نے جواب دیا۔" تو اپنے دوست سے کہہ دے کہ اگر اسے غیبت ہی کرنا ہے تو سب سے پہلے اپنے والدین کی غیبت کرے، کیونکہ ان کے گناہ اتنے زیادہ ہیں کہ ان کی اولاد کی نیکیاں ان کے نامۂ اعمال میں لکھی جاتی ہیں۔"

اس دوران ایک شخص شرمسار و پشیمان آپ کے قریب پہنچا اور

آہستہ سے کہا۔ "حضرت! میں ایک ایسے گناہ کا مرتکب ہوگیا ہوں کہ ندامت کی وجہ سے آپ کے سامنے نہیں بیان کر سکتا۔"

آپ نے کہا۔ "اگر تو سب کے سامنے کہتے ہوئے شرماتا ہے تو چپکے سے میرے کان میں کہہ دے۔"

اس نے کان میں کہا۔ "حضرت! میں زنا کا ارتکاب کر بیٹھا ہوں۔"

آپ نے کہا۔ "توبہ ہے۔ میں تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ شاید تو نے غیبت کا گناہ کیا ہے کیونکہ زنا کا تعلق تو خدا کے گناہ سے ہے جو توبہ کے بعد معاف بھی ہو سکتا ہے لیکن غیبت بندے کا گناہ ہے جس کو بندہ ہی معاف کرے تو کرے۔ خدا معاف نہیں کر سکتا۔"

❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊

آپ کہیں جا رہے تھے کہ سامنے سے ایک سیّد کا گزر ہوا۔ یہ سیّد اپنے افعال کے اعتبار سے رسوائے زمانہ تھا۔ اس نے آپ کو دیکھا تو ذرا تمکنت سے کہا۔ "میں سیّد ہوں اور اس اعتبار سے تجھ سے کسی طرح بھی کم نہیں ہوں۔"

آپ کو اس کا طرزِ تخاطب پسند نہیں آیا، آپ نے جواب دیا۔ "بیشک تیرے جدِّ اعلیٰ خاتم الانبیاءؐ تھے اور میرا باپ گمراہ۔ مگر تیرے جدِّ اعلیٰ نے جو ترکہ چھوڑا تھا اس کو میں نے حاصل کر لیا اس لیے تو رسوا ہو گیا۔"

سیّد چُپ ہو کر ایک طرف چلا گیا۔

اس رات آپ نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہؐ آپ سے بہت ناراض ہیں۔ آپ نے وجہ دریافت کی۔ "یا رسول اللہؐ! کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں؟"

رسول اللہؐ نے جواب دیا۔ "اے عبداللہ! میں تجھ سے یہ پوچھتا ہوں کہ تو نے میری آل کے عیوب کی پردہ دری کیوں کی؟"

اسی وقت آپ کی آنکھ کھل گئی۔ آپ پریشان اور خوفزدہ اس سید کی جستجو میں نکل کھڑے ہوئے۔ یہ ابھی کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ سید سے ملاقات ہو گئی۔ وہ خود بھی آپ کو تلاش کر رہا تھا۔ وہ آپ کو دیکھتے ہی لپٹ گیا اور روتا ہوا بولا "اے عبداللہ! میں نے تم سے جو کچھ کہا اس پر شرمندہ ہوں، ابھی ذرا دیر پہلے میں نے رسول اللہؐ کو خواب میں دیکھا۔ وہ مجھے ڈانٹ رہے تھے کہ اگر تیرے اعمال و افعال بہتر ہوتے تو عبداللہ تیری اہانت کیوں کرتا؟"

آپ نے اپنا خواب بیان کر دیا۔ دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر روتے رہے اور اپنے اپنے رویوں سے تائب ہو گئے۔

آپ کی خدمت میں ایک بد طینت حاضر ہوا اور گذارش کی "حضرت مجھے کچھ دن اپنی صحبت میں رہنے کا شرف عطا فرمائیں تاکہ میں آپ کے فیضانِ روحانی سے نیک اور خدارسیدہ بن جاؤں۔"

آپ نے جواب دیا "میری صحبت اختیار کرنے سے کچھ بھی حاصل نہ ہو گا جب تک کہ تو خود بھی نیک بننے کا ارادہ اور کوشش نہ کرے۔ یہ تیرا خیال خام ہے کہ میری صحبت تجھے نیک اور پارسا بنا دے گی۔"

اس شخص نے کہا "اگر آپ کی صحبت مجھے نیک اور پارسا نہ بنا سکی تو پھر آپ کی عظمت اور بزرگی کا فائدہ ؟"

آپ نے جواب دیا "بھائی! میں تو ایک معمولی انسان ہوں۔ رسول اللہؐ تو افضل الکائنات اور اشرف الانبیاء تھے لیکن آپؐ ابو جہل کو راہِ راست پر نہ لا سکے، تو میں کیا چیز ہوں۔"

لیکن وہ شخص نہیں مانا اور آپ کی صحبت میں رہنے لگا لیکن اس کا عالم یہ تھا کہ وہ آپ کی نہ تو باتیں سنتا تھا اور نہ آپ کے مشاغل میں دلچسپی لیتا

تھا۔ کچھ عرصہ رہ کر جانے کی اجازت طلب کی۔ آپ نے کہا "اس میں اجازت طلب کرنے کی کیا بات ہے تو جا سکتا ہے۔"

اس نے ہنستے ہوئے کہا "لیکن حضرت! یہ یاد رہے کہ میں جیسا آیا تھا ویسا ہی جا رہا ہوں، اس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔"

آپ نے کہا "اس میں افسوس کی کیا بات ہے۔ کوا اگر زندگی بھر بلبلوں کی صحبت میں رہے تو اس کی کائیں کائیں میں فرق نہیں آئے گا۔"

جب وہ چلا گیا تو آپ نے لوگوں سے فرمایا "صد حیف کہ وہ تو مجھ سے رخصت ہو گیا لیکن اس کی بری خصلتیں اس سے رخصت نہ ہو سکیں۔"

آپ کے ہم عصر ایک دوسرے بزرگ سہیل، اکثر آپ کے پاس آتے رہتے تھے، لیکن ایک بار آئے تو واپس ہوتے وقت غیر متوقع شکایتاً عرض کیا "عبداللہ! افسوس کہ یہ ہم دونوں کی آخری ملاقات ہے، اب میں یہاں کبھی بھی نہ آؤں گا۔"

آپ نے پوچھا "خیریت تو ہے؟ آپ کو یہاں کی کوئی بات ناگوار گزری ہے؟"

سہیل نے آزردہ خاطری سے جواب دیا "میں اس گھر کو فضل و برکت کا گھر سمجھ کر آتا رہا لیکن آج میرے ساتھ جیسا سلوک کیا گیا ہے اسے میں بیان کرتے ہوئے بھی شرما رہا ہوں۔"

آپ نے کہا "سہیل! تمھیں جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہو۔ آخر اس گھر میں وہ کون سی بات تمہیں ناگوار گزری ہے کہ تم یہاں آئندہ نہ آنے کی قسم کھا رہے ہو!"

سہیل نے کہا "عبداللہ! آج خلاف معمول آپ کی چھت پر سے کنیزوں

نے مجھے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ وہ مجھے "سہیل یہاں آؤ۔ میرے پاس آؤ۔ میرے پاس آؤ سہیل" کہہ کر بلا رہی تھیں۔ کیا آپ پسند کریں گے کہ میری زندگی بھر کا تقویٰ یوں ضائع جاتا؟"

آپ نے اپنے ارادت مندوں سے کہا "لوگو! اٹھو اور میرے ساتھ سہیل کی نمازِ جنازہ ادا کرو۔"

لوگوں نے حیرت سے سہیل کو اور سہیل نے حاضرین کو دیکھا لیکن اسی وقت سہیل گر گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے ایک بار پھر اپنے ارادت مندوں سے کہا "کیا میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ آؤ میرے ساتھ سہیل کی نماز جنازہ ادا کرو۔ اب اٹھو، ان کی تجہیز و تکفین کا انتظام کر کے نمازِ جنازہ پڑھا دیں اور پھر دفن کر دیں۔"

لوگوں نے حیرت سے پوچھا "لیکن آپ کو ان کی موت کا علم کیونکر ہو گیا تھا؟"

آپ نے جواب دیا "سہیل نے کہا تھا کہ میری چھت پر سے کنیزیں پکار رہی تھیں حالانکہ تم لوگ خوب اچھی طرح جانتے ہو کہ میرے یہاں ایک بھی لونڈی نہیں۔ اس لیے یقیناً وہ حوریں تھیں جو سہیل کو بلا رہی تھیں اس لیے مجھے یقین ہو گیا کہ ان کا وقت پورا ہو چکا ہے۔"

آپ حج کرنے خانہ کعبہ تشریف لے گئے۔ بعد فراغتِ حج آپ وہیں بیت اللہ ہی میں سو گئے۔ آپ نے خواب میں دیکھا دو فرشتے باتوں میں مشغول ہیں۔ ایک فرشتے نے دوسرے سے پوچھا "اس سال کتنے لوگ حج میں شریک ہوئے۔"

دوسرے نے جواب دیا "چھ لاکھ انسانوں نے حج کیا ہے۔"

پہلے فرشتے نے پوچھا "ان میں سے کتنوں کا حج قبول کیا گیا؟

دوسرے نے جواب دیا "دمشق کا ایک موچی حج میں شریک تو نہیں ہو سکا لیکن خدا نے اس کا حج قبول کر لیا اور اس کے طفیل میں دوسروں کا حج بھی قبول کر لیا گیا۔"

اس کے بعد آپ کی آنکھ کھل گئی۔ آپ نے فوراً دمشق کا رُخ کیا۔ آپ اس موچی کو دیکھنا چاہتے تھے جو حج کرنے تو نہیں آسکا تھا لیکن اس کا حج قبول کر لیا گیا اور اس کے طفیل میں دوسروں کا حج بھی قبول کر لیا گیا۔ آپ نے دمشق میں اسے تلاش کر لیا اور اس سے دریافت کیا "تو حج پر کیوں نہیں جا سکا؟"

اس نے پوچھا "تمہارا نام؟ تم کہاں سے آئے ہو اور مجھ سے یہ سوال کیوں کر رہے ہو؟"

آپ نے جواب دیا "میرا نام عبداللہ بن مبارک ہے۔"

وہ آپ کا نام سنتے ہی چیخ مار کر رو دیا جب ذرا ہوش و حواس درست ہوئے تو کہا "عبداللہ! ایک عرصے سے میں حج کی خواہش میں جی رہا تھا اور میں نے اپنے موچی کے پیشے سے اس مقصد کے لیے تین سو درہم جمع کر لیے تھے اور جب میں حج کا سفر اختیار کرنے والا تھا۔ ایک دن میرے پڑوسی کے یہاں سے کھانا پکنے کی خوشبو آئی۔ یہ خوشبو اتنی اچھی لگی کہ میری بیوی نے مجھ سے کہا کہ اپنے پڑوسی کے پاس جاؤ اور جو کچھ پک رہا ہے اس میں سے ذرا سا مانگ لاؤ۔ میں پڑوسی کے پاس پہنچا اور اس سے تھوڑا سا کھانا مانگا۔ اس نے جواب دیا، افسوس کہ وہ کھانا تیرے مطلب کا نہیں ہے ورنہ ضرور حاضر کرتا۔ میں نے پوچھا "وہ کیوں، میرے مطلب کا کیوں نہیں ہے؟" اس نے جواب دیا "میرے اہل و عیال سات دن سے مسلسل فاقہ کشی کر رہے تھے۔ آج صبح میں نے ایک گدھے کو مرا ہوا پڑا دیکھا میں نے اس کو غنیمت جانا اور اس مردہ گدھے کو بمشکل گھر تک لے آیا اور اس

کا گوشت پکا رہا ہوں تاکہ کسی طرح اپنا اور اپنے بیوی بچّوں کا جہنم بھر سکوں۔"
میں اس کی باتوں سے لرز گیا، اسی وقت گھر آیا اور حج کے لیے جمع کی ہوئی رقم اس شخص کے حوالے کر دی اور یہ تصور کر لیا کہ ایک مسلمان کی امداد میرے حج کے برابر ہے۔"

آپ نے موچی کو اپنا خواب سنایا اور کہا "تیرے حج کی قبولیابی کی خوشخبری میں سُن چکا ہوں اب تو بھی سُن لے۔ واقعی اللہ تعالیٰ قضا و قدر کا مالک ہے۔"

آخری دنوں میں آپ نے لوگوں سے کہا۔ لوگو! مشائخ نے ادب کی بہت سی تعریفیں کی ہیں لیکن میرے نزدیک ادب، نفس شناسی کو کہتے ہیں۔" مزید فرمایا "قرض حسنہ میں ایک درہم دینا، خیرات میں ہزار درہم دینے سے زیادہ موجب ثواب ہے۔ لوگو! جس نے ناجائز مال کا ایک حصہ بھی لیا وہ توکل سے محروم رہے گا، اور جانتے ہو توکل کسے کہتے ہیں؟ توکل وہ نہیں ہے جس کو تمہارا نفس سمجھتا ہے بلکہ وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ توکل سمجھے۔ اہلِ توکل کا اتنا پس انداز کر لینا کہ بیماری اور موت میں کام آ جائے معیوب نہیں ہے۔"

لوگوں نے پوچھا "اگر ہم جہاد کے ثواب سے محروم رہیں تو اس کے بدلے میں ہمیں کون سا عمل اختیار کرنا چاہیئے؟"

آپ نے جواب دیا "اگر تم اپنے بال بچّوں کی پرورش کے ساتھ علمِ دین بھی سکھلاؤ تو اس کا اجر جہاد سے فزوں تر ہے۔"

وصال سے پہلے آپ نے اپنا سارا اثاثہ فقراء میں تقسیم کر دیا۔ کسی ارادتمند کو اس پر اعتراض ہوا۔ اس نے کہا "حضرت! آپ کی تین صاحبزادیاں ہیں آپ نے ان کے لیے کیا چھوڑا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "میں نے ان کے لیے خدا چھوڑا ہے، کیونکہ جس کا کفیل

اللہ ہو اس کو عبداللہ کی کیا حاجت ہے؟"

موت سے تھوڑی دیر پہلے آپ نے آنکھیں کھولیں اور مسکراتے ہوئے فرمایا "عمل کرنے والوں کو ایسے ہی عمل کرنا چاہئیں" اس کے بعد آپ کا انتقال ہو گیا۔

آپ کو، اس عہد کے مشہور صوفی بزرگ فضیل بن عیاض اور سفیان ثوری نہایت ادب و احترام سے دیکھتے تھے۔ ایک بار آپ کو آتے دیکھ کر سفیان ثوری نے کہا تھا "دیکھو مردِ مشرق آ رہا ہے!"

فضیل بن عیاض نے کہا "مردِ مشرق ہی نہیں مردِ مغرب بھی اور مشرق و مغرب کے درمیان جو کچھ ہے وہ بھی" بعد میں عظیم مشائخ نے متفقہ طور پر یہ کہا کہ جس کی تعریف میں فضیل بن عیاض اور سفیان ثوری جیسے بزرگوں نے اہم جذبات کا اظہار کیا ہو، اس کے اوصاف کوئی اور کیا بیان کر سکتا ہے۔

خواجہ بہاری

گوداپور (بہار) کے قصبہ حاجی پورہ میں خواجہ بہاری کی ولادت ہوئی یہیں انہوں نے ہوش سنبھالا، پھر معلوم نہیں کیا ہوا کہ انہیں اپنے خاندان سے جدا ہو جانا پڑا۔ وطن سے نکلے تو قصبہ کورا میں شیخ جمال اولیا کی صحبت میسّر آئی۔ یہ ان کی خانقاہ کے دروازے پر پردیسی کی طرح بیٹھ گئے۔ آتے جاتے مرید انہیں یہاں بیٹھے دیکھ کر کوئی توجہ ہی نہ دیتے سمجھتے، کوئی ہوگا، کچھ دیر بیٹھ کر چلا جائے گا۔ ایک دن ایک رات گزر گئے، یہ جہاں بیٹھے تھے بیٹھے رہے۔ اب مریدوں نے ان کے بارے میں آپس میں چہ میگوئیاں شروع کر دیں۔ ایک نے کہا "آخر یہ ہے کون اور یہاں کیوں بیٹھا ہے، چاہتا کیا ہے؟"

دوسرے نے کہا "یہ سوالات اسی سے کرو، دیکھو کیا جواب دیتا ہے۔"

آخر ایک مرید ان کے پاس بیٹھ گیا اور جھک کے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا "میاں صاحبزادے! آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا "میں ایک پردیسی ہوں اور حاجی پورے سے آیا ہوں۔"

کسی نے پوچھا "تنہا ہو یا کوئی اور بھی ہے تمہارے ساتھ؟"

انہوں نے جواب دیا "بالکل تنہا ہوں۔"

ان سے کہا گیا "پھر یہاں کیوں پڑے ہو، اپنا راستہ لو، کہیں اور جاؤ"

انہوں نے بڑے حسرت ناک لہجے میں پوچھا "کہاں جاؤں؟ کس کے پاس جاؤں؟"

جواب ملا "کہیں بھی چلے جاؤ۔ ہم کیا بتائیں کہ تم کہاں جاؤ۔"

ابھی سوال و جواب کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ اندر سے حضرت جمال اولیاء نمودار ہوئے اور پوچھا "یہ کیا بھیڑ لگا رکھی ہے تم لوگوں نے؟"

مرید سامنے سے ہٹ کر اِدھر اُدھر ہو گئے۔

ایک مرید نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "حضرت یہ لڑکا کل سے یہیں بیٹھا ہے ہم اس سے پوچھ رہے تھے کہ تو کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے؟"

آپ نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ کل سے یہاں بیٹھا ہوا ہے! خیریت تو ہے میاں صاحبزادے؟"

انہوں نے جواب دیا "میں بالکل خیریت سے ہوں، اگر میرا یہاں بیٹھنا آپ حضرات کو گراں گزر رہا ہے تو میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔"

حضرت جمالؒ نے فرمایا "نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ تم یہاں بلکہ اندر چل کے رہو۔ یہ بتاؤ کل سے کچھ کھایا پیا بھی ہے یا نہیں؟"

خواجہ بہاری نے جواب دیا "نہیں، میں نے کل سے کچھ بھی نہیں کھایا۔"

حضرت جمال انہیں خانقاہ میں لے گئے، کھانا کھلوایا اور فرمایا "اگر آرام کرنا چاہو، تو آرام کر لو۔"

انہوں نے کہا" ایک بھوک تو مٹ گئی، اب دوسری بھوک کس طرح مٹے گی۔"

حضرت جمال نے جواب دیا" خدا وسیلے پیدا کر دیتا ہے جس نے ایک بھوک مٹائی ہے وہی دوسری بھی مٹائے گا۔"

انہوں نے پوچھا" پھر کب سے؟ ابھی سے یا کل سے؟"

حضرت جمال نے جواب دیا" آج تو آرام کر لو، کل سے پڑھاؤں گا۔"

حضرت جمال انہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ تو کسی مرید نے آپ سے پوچھا" میاں صاحبزادے! یہ دوسری بھوک کیا ہوتی ہے؟"

انہوں نے جواب دیا" علم۔ علم کی بھوک!"

اس جواب نے مریدوں کے کان کھڑے کر دیے اور انہیں اس لڑکے کے مقام کا ہلکا سا اندازہ ہو گیا۔

دوسرے دن سے حضرت جمال اولیاء نے انہیں پڑھانا شروع کر دیا۔ پیر مرشد کو چند دنوں میں اندازہ ہو گیا کہ یہ طالب علم کوئی معمولی لڑکا نہیں غیر معمولی انسان ہے، خواجہ بہاری دن میں تعلیم حاصل کرتے اور رات کو سربسجود روتے گڑگڑاتے رہتے۔ حضرت جمال اولیاء پہ آپ کی کیفیت منکشف تھی ایک دن انہوں نے خواجہ بہاری سے پوچھا" صاحبزادے تمہارے والدین کہاں ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا" کچھ پتہ نہیں۔ میں تنہا ہوں اس دنیا میں۔"

حضرت جمال نے آنکھیں بند کر لیں اور مراقبے میں چلے گئے، پھر کچھ دیر بعد آنکھیں کھول دیں اور ان سے کہا" صاحبزادے میں تیرے والدین کی تلاش میں نکلا تھا، لیکن وہ روئے زمین پہ تو کہیں ہیں نہیں اب میں انہیں دوسری دنیا میں تلاش کرتا ہوں۔"

خواجہ بہاری خاموش رہے اور حضرت جمال دوبارہ مراقبے میں چلے گئے۔

مریدوں کو ان سے حسد ہونے لگا کہ یہ کیسا لڑکا ہے جس پر ان کے پیر کا غیر معمولی رجحان اور لگاؤ ہے۔

پیر و مرشد نے مراقبے سے نکل کر فرمایا "صاحبزادے! تمہارے والدین دوسری دنیا میں موجود ہیں۔ ان سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ بھیانک زلزلے کے نتیجے میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔"

خواجہ بہاری آبدیدہ ہو گئے، کہا "پیر و مرشد! براہ کرم آپ انہیں تکلیف نہ دیجئے۔"

خانقاہ میں جو باتیں ہو رہی تھیں مریدوں میں ان کا بڑا چرچا تھا، خواجہ کی علمیت میں غیر معمولی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

ایک دن حضرت جمال اولیا رتے آپ سے کہا "صاحبزادے میں تمہیں جو کچھ دے سکتا تھا، دے چکا، بقیہ کے لیے تمہیں لمبا سفر کرنا پڑے گا۔ اب اس خانقاہ میں تمہارے لیے کچھ بھی نہیں رہ گیا۔"

انہوں نے پوچھا "اب مجھے کہاں جانا پڑے گا؟"

حضرت جمال نے جواب دیا "پنجاب کے شہر لاہور۔ وہاں کئی بزرگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

خواجہ بہاری راضی بہ رضائے الٰہی تھے، پیر و مرشد سے پوچھا "کیا مشیت ایزدی یہی ہے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔"

حضرت جمال نے جواب دیا "بالکل۔ مجھے عالم رویا میں حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہیں بتاؤں کہ لاہور میں کئی بزرگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

خواجہ بہاری نے کہا: "اگر یہ بات ہے تو میں یہاں سے فوراً ہی چلا جاؤں گا۔"

حضرت جمال نے انہیں اسی دن ایک قافلے کے حوالے کر دیا، یہ قافلہ براستہ اودھ اور روہیلکھنڈ دہلی جا رہا تھا، یہ اپنے استاد سے بچشم پُرنم جدا ہو گئے، مریدوں کو قرار آ گیا۔

یہ الٰہ آباد، اعظم گڑھ، لکھنؤ ہوتے ہوئے مراد آباد پہنچے، یہاں سے میرٹھ اور میرٹھ سے دہلی میں داخل ہوئے۔ ان کی خوش قسمتی سے دہلی میں ایک قافلہ اور مل گیا۔ یہ قافلہ لاہور جا رہا تھا، خواجہ بہاری اس قافلے میں شامل ہو گئے۔ قافلے والوں نے اس بے یار و مددگار لڑکے پر خاص توجہ دی اور ان کا بڑا خیال رکھا۔

لاہور میں بھی وہی حال ہوا، پورے شہر میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا، جو آپ سے یا آپ اس سے واقف ہوتے۔ آپ ادھر اُدھر بھٹک رہے تھے لوگ آپ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ انہوں نے ایک لڑکے کو بے یار و مددگار اِدھر اُدھر بھٹکتے دیکھا تو پوچھا "صاحبزادے! تمہیں کس کی تلاش ہے؟"

انہوں نے جواب دیا: "اس شخص کی جو میرے علم کی پیاس مٹا سکے۔"

ایک بزرگ نے پوچھا: "اس شخص کا نام اور پتہ بھی تمہیں معلوم ہے؟"

انہوں نے جواب دیا: "اگر مجھے اس کا نام اور پتہ معلوم ہوتا تو پوچھتا پاچھتا اس کے پاس پہنچ جاتا۔"

ان بزرگ کو ان پر رحم آ گیا، بولے: "تو یہ معاملہ ہے۔ میں سمجھ گیا، تم پردیسی اور علم کے جویا ہو، ماشاء اللہ سبحان اللہ۔ میں تمہاری مدد کروں گا، یہ کم سنی، یہ نو عمری اور اتنی زیادہ علم کی پیاس۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں

کامیاب کرے۔"

وہ بزرگ انہیں لاہور کے مشہور عالم ملّا فاضل لاہوری کے پاس لے گئے اور ان سے خواجہ بہاری کا یوں تعارف کرایا "جناب یہ لڑکا بہار سے آیا ہے، علم کی پیاس نے اسے آوارہ و سرگرداں کر رکھا ہے۔ یہ لاہور میں اِدھر اُدھر بھٹک رہا تھا کہ مجھے مل گیا اور میں اسے آپ کے پاس لے آیا۔"

ملا فاضل نے ان کی طرف دیکھا اور پوچھا "اس سے پہلے بھی کسی سے پڑھا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا "جی ہاں، بہار کے قصبہ کورا میں حضرت جمال اولیاء سے درس لیا ہے۔"

ملّا فاضل نے حیرت سے پوچھا "کیا سچ ہے جمال اولیاء نے تجھے پڑھایا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا "جی میں جھوٹ نہیں بول رہا انہوں نے مجھے اپنی خانقاہ میں رہنے کی جگہ بھی دی تھی۔"

ملّا فاضل نے کہا "اگر یہ بات ہے تو میں بھی تجھے پڑھاؤں گا اور اپنے پاس ہی رکھوں گا۔ ضرور تجھ میں کوئی ایسی بات ہے جس نے جمال اولیاء جیسے صاف کشف اور حامل علوم باطنیہ کو تجھ پہ مائل اور ملتفت کر دیا۔"

جو بزرگ انہیں ملّا فاضل کے پاس لے گئے تھے وہ یہ سب جان کر بے حد خوش ہوئے۔ بولے "صاحبزادے۔ میرا کام ختم ہوا۔" اس کے بعد ملا فاضل سے کہا "جناب میں تو چلا، اب آپ جانیں اور آپ کا شاگرد جانے۔ میں نے آپ کو ایک سچا طالب علم دیا ہے۔"

ملّا فاضل نے انہیں اپنے گھر میں رکھ لیا اور انہیں پوری توجہ سے پڑھانا شروع کر دیا۔ جیسے جیسے دن گزرے استاد کی توجہ اور محبت

میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ استاد کو جلدی ہی اس کا معترف ہو جانا پڑا کہ ان کا یہ شاگرد غیر معمولی اور ذہین اور سمجھدار ہے۔

ملا فاضل کی بیوی ان کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ دونوں وقت کا کھانا انہیں ان کے حجرے میں پہنچایا جاتا اور یہ کام کسی اور سے نہیں لیا جاتا تھا بلکہ ملّا فاضل کی بیوی خود انجام دیتی تھیں۔ ملا فاضل چند دنوں سے یہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کا شاگرد روحانی کمالات کا بھی حامل ہے۔ اس کا اندازہ اس طرح ہوا کہ ایک دفعہ انہیں شدید پیاس لگی ہوئی تھی، ملّا فاضل پانی کے لیے خواجہ بہاری کو آواز دینے ہی والے تھے سر اوپر جو اٹھایا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ خواجہ بہاری پانی کا پیالہ مؤدب لیے کھڑے ہیں۔

ملّا نے پانی پینے کے بعد شاگرد سے پوچھا۔ تمہیں یہ کس طرح معلوم ہوا کہ میں پیاسا ہوں؟"

خواجہ بہاری نے جواب دیا" اندازے سے۔ آپ بہت دیر سے درس و تدریس میں مشغول ہیں۔ میں نے سوچا اب آپ کو پیاس لگنی چاہیئے پانی لے آیا۔"

لیکن ملّا فاضل کو ان کی باتوں کا یقین نہیں آیا۔

کئی سال بعد ملّا فاضل نے اپنے دل میں سوچا۔ خواجہ بہاری کو روحانی اور باطنی علوم کی طرف بھی توجہ دینی چاہیئے۔

خواجہ بہاری اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنے استاد کے پاس پہنچے اور عرض کیا" استاد محترم! ابھی ابھی میرے دل میں خیال آیا کہ مجھے باطنی علوم بھی حاصل کرنا چاہئیں۔"

استاد تو اچھل پڑے اور ان سے کہا۔" صاحبزادے! بُرا نہ ماننا، تم

کتنے ہی بڑے ہو جاؤ میری نظر میں صاحبزادے ہی رہو گے تو ہاں میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہیں لوگوں کے دلوں کا حال کیونکر معلوم ہو جاتا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا "ایسی تو کوئی بات نہیں، مجھے تو لوگوں کے دلوں کا حال اس وقت تک نہیں معلوم ہوتا جب تک مجھے بتایا نہ جائے۔"

ملا فاضل خاموش ہو گئے۔

ملا کی بیوی نے آش تیار کیا تھا، اس کا بھرا ہوا پیالہ خواجہ بہاری کے لیے لے گئیں۔ اس وقت خواجہ بہاری اپنے حجرے میں تھے۔ یہ وقت نہ تو کھانے کا تھا نہ نشستے کا۔ ملا کی بیوی نے حجرے میں قدم رکھا تو یہ دیکھ کر سہم گئیں کہ یہاں خواجہ بہاری کو کسی نے قتل کر دیا تھا، ان کے اعضاء حجرے میں بکھرے پڑے تھے یہ آش کا پیالہ ایک طرف رکھ دیا بد حواسی سے بھاگیں اور شوہر سے کہا "آپ کو کچھ پتہ بھی ہے کہ حجرے میں کیا غضب ہو گیا۔"

ملا فاضل نے پوچھا "کیا غضب ہو گیا ہے؟"

بیوی کو ملا کے اطمینان پر غصہ آ رہا تھا، چیخ کر کہا "آپ یہاں اطمینان سے بیٹھے ہیں وہاں آپ کے شاگرد خواجہ بہاری کو کسی نے انتہائی بے دردی سے ہلاک کر دیا، ان کے ہاتھ، پاؤں اور سر ادھر اُدھر کٹے پڑے ہیں بڑی سفاکی سے کسی نے قتل کیا ہے انہیں؟"

ملا فاضل بھی یہ خبر سُن کر پریشان ہو گئے۔ بیوی کے ساتھ بھاگے بھاگے خواجہ بہاری کے حجرے میں پہنچے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ سر جھکائے مراقبے میں بیٹھے ہیں۔ ملا نے اپنی بیوی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور انہیں چپ چاپ باہر لے آئے بیوی سے پوچھا "تم نے اندر کیا دیکھا؟"

بیوی نے جواب دیا "میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ میں نے اس کے کٹے

ہوئے اعضاء کو اِدھر اُدھر بکھرا ہوا دیکھا تھا۔"

ملا نے کہا۔"میں یہ کب کہتا ہوں کہ تم جھوٹ بولی تھیں تمہیں نہیں معلوم کہ خواجہ بہاری کیا ہیں۔ یہ ولی ہیں اور ولیوں کی عبادت کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے تمام اعضائے جسمانی الگ الگ کر دیتے ہیں، میں خواجہ بہاری سے یوں ہی اتنی زیادہ محبت نہیں کرتا۔"

اب راز فاش ہو چکا تھا اس لیے خواجہ بہاری کا دل یہاں سے اچاٹ ہو گیا انہوں نے استاد کی بیوی سے شکایتاً کہا۔" آپ کو میرے تخلیہ میں بے وقت نہیں آنا چاہیئے تھا۔"

استاد کی بیوی نے کہا۔" میں تو تمہارے لیے آش کا پیالہ لے کر پہنچی تھی مجھے کیا پتہ تھا کہ تم یہ سب کرتے ہو۔"

آپ خاموش ہو گئے، کچھ توقف کے بعد کہا۔" اب میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔"

استاد کی بیوی نے کہا۔" کہاں چلے جاؤ گے؟"

انہوں نے جواب دیا۔" ابھی مجھے خود پتہ نہیں کہ کہاں جاؤں گا لیکن یہ جانتا ہوں کہ کہیں اور چلا جاؤں گا اور جہاں بھی جاؤں گا وہ میرے محرمِ اسرار ہوں گے۔"

جب یہ بات استاد کو معلوم ہوئی تو وہ بہت غمگین ہو گئے۔ انہوں نے خواجہ بہاری سے پوچھا۔" بیٹے! یہ میں کیا سُن رہا ہوں۔"

انہوں نے جواب دیا۔" آپ نے جو کچھ سُنا" بجا" سنا اب میں پیرو مرشد کی تلاش میں جا رہا ہوں۔"

استاد نے کہا۔" بیٹے! تجھے معلوم ہے کہ میں نے ہمیشہ تجھے اپنا بیٹا

سمجھا ہے تو میرا بیٹا ہے، کیا تو اپنے باپ کو روتا تڑپتا چھوڑ جائے گا؟"

آپ نے جواب دیا "میں نے بھی آپ کو اپنا باپ ہی سمجھا ہے اور یوں بھی آپ پدرِ معنوی ہیں میرے، میں آپ کو کس طرح بھلا سکتا ہوں میں کہیں بھی رہوں آپ کو بھلا نہیں سکتا۔ اس در کی حاضری مجھ پر فرض ہو گئی ہے۔"

ان محبت آمیز کلمات نے استاد اور ان کی بیوی کے زخموں پر مرہم کا کام کیا اور وہ انہیں رخصت کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

استاد کی بیوی نے اشکبار آنکھوں سے پوچھا "اپنے اس وعدے کو یاد رکھنا، بھول نہ جانا، کیا یہ سچ ہے کہ تم یہاں سے میری وجہ سے جا رہے ہو؟"

انہوں نے جواب دیا "ایسی تو کوئی بات نہیں، لیکن اس واقعہ نے میری منزل کی نشاندہی ضرور کر دی ہے۔"

استاد کی بیوی نے کہا "میں جب بھی تمہاری جدائی کو یاد کروں گی یہ سوچ کر تڑپ جایا کروں گی کہ اس گھر کو تم نے میری وجہ سے چھوڑا تھا۔"

وہ دونوں دیر تک یوں ہی باتیں کرتے رہے اور خواجہ بہاری نے استاد کی بیوی کو یہ یقین دلایا کہ وہ ان کے پاس آتے جاتے رہیں گے۔

دورانِ تحصیل علوم ان کے کانوں میں اس عہد کے پیر کامل حضرت میاں میرؒ کے اذکار پہنچتے رہے۔ اس زمانے میں کون تھا جو حضرت میاں میر سے متاثر اور مرعوب نہ ہوا ہو، انہیں بھی شوق ہوا کہ حضرت میاں میر سے ملیں اور دیکھیں کہ وہ کیا ہیں اور ایک زمانہ ان کا معترف اور معتقد کیوں ہے!

آپ حضرت میاں میر کی خدمت میں پہنچے اور ان سے نظریں ملاتے ہی ایسے بے خود ہوئے کہ کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا۔ ملّا فاضل کا مدرسہ اور گھر دونوں ہی چھوٹ گئے اور آپ اسی در کے ہو رہے۔

حضرت میاں میر نے پوچھا۔ "میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "آپ یہ سوال مجھ سے کیوں کر رہے ہیں، حالانکہ آپ خوب جانتے ہیں کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔"

حضرت میاں میر نے فرمایا۔ "ملا فاضل ایک عالم فاضل انسان ہیں ان ہی سے پڑھتے رہو یہاں تمہیں کیا ملے گا؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "حضرت! سچی بات تو یہ ہے کہ میں جیسے جیسے تحصیل علوم ظاہری میں آگے بڑھ رہا ہوں۔ تشنگی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے شاید میری تربیت اس در سے وابستہ نہیں ہے اور جس علم کی تلاش میں میں مارا مارا پھر رہا ہوں وہ یہیں آپ ہی کے در سے حاصل ہو گا۔"

حضرت میاں میر نے فرمایا۔ "صاحبزادے! میں تمہیں قبول کرنے کو تیار ہوں مگر یہ سوچ لو کہ یہاں آنے کے بعد تمہیں بڑی قربانیاں دینا ہوں گی اس دنیا میں آرام نہیں ہے چھٹیاں نہیں ہیں۔ یہاں جس کو سبق یاد ہو جاتا ہے اس کی چھٹیاں منسوخ ہو جاتی ہیں۔"

انہوں نے جواب دیا۔ "میں ہر محنت اور مشقت کے لیے تیار ہوں۔ انشاء اللہ آپ کو شرمندگی نہیں اٹھانا پڑے گی۔"

حضرت میاں میر نے انہیں باقاعدہ شاگرد اور مرید کر لیا۔ یہ بھی نہایت انہماک اور محنت سے علوم ظاہری اور باطنی حاصل کرنے لگے۔

ایک مدت بعد جب آپ ادھیڑ عمر کے ہو گئے تو حضرت میاں میر نے فرمایا۔ "خواجہ! اب جبکہ تم بہت کچھ حاصل کر چکے ہو، مجھ سے ایک وعدہ کرو۔"

انہوں نے جواب دیا۔ "پیر و مرشد! آپ مجھ سے وعدہ نہ لیں، حکم دیں

اور پھر دیکھیے کہ میں اسے کس حد تک بجا لاتا ہوں۔"

حضرت میاں میر نے فرمایا "علم کی جس پیاس نے تجھے ایک زمانے تک آوارہ و سرگرداں رکھا ہے اب وقت آگیا ہے کہ تم اس علم کو دوسرے متلاشیانِ علم تک پہنچاؤ تو ایک مدرسہ قائم کر جہاں تیرے ہی جیسے طالب علم اپنی پیاس بجھائیں یہ ایک صدقہ جاریہ ہے جس کا ثواب اور اثرات مدتوں اِرہتی دنیا تک باقی رہیں گے۔"

انہوں نے وعدہ کر لیا اور کہا "پیر مرشد! اللہ نے چاہا تو میں بہت جلد اس پر عمل کر کے دکھا دوں گا۔"

اس کے بعد آپ نے دہلی دروازے کے اندر ایک مدرسہ قائم کر دیا اور تن دہی اور توجہ سے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔

اس عہد و پیمان کے کچھ عرصہ بعد ہی حضرت میاں میر کا انتقال ہو گیا، آپ کو اس کا بہت دکھ ہوا، انہیں بار بار یہی احساس ہوتا تھا کہ انہوں نے کوئی قیمتی چیز گم کر دی ہے۔ اب ان کی پوری توجہ اپنے مدرسے کی طرف تھی، اس مدرسے سے لائق ترین لوگ تکمیل درس کر کے نکلے، شاہجہاں کا وزیر نواب سعد اللہ خان بھی اسی مدرسے سے فارغ التحصیل تھا۔ یہاں پورے ملک سے طلبہ پہنچتے اور علم کی پیاس بجھاتے۔

ان دنوں شاہجہاں لاہور آیا ہوا تھا، خواجہ بہاری کی محنت، بزرگی اور ذہانت کا چرچا شاہجہاں کے کانوں تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے سوچا، لاہور آیا ہوں تو خواجہ بہاری سے بھی مل لوں۔

بادشاہ نے اپنے امراء سے مشورۃً پوچھا "میں خواجہ بہاری سے ملنا چاہتا ہوں، آپ حضرات کیا مشورہ دیتے ہیں؟"

نواب سعد اللہ خان نے پوچھا "آپ ان سے کہاں ملیں گے؟ انہیں بلائیں گے یا خود تشریف لے جائیں گے۔"

بادشاہ نے پوچھا "مجھے کیا کرنا چاہیئے، وہاں جانا چاہیئے یا انہیں بلوانا چاہیئے؟"

نواب صاحب نے جواب دیا "انہیں بلوانا تو گستاخی ہے حضور خود تشریف لے چلیں۔"

بادشاہ کو یہ مشورہ پسند آیا۔ وہ اپنے امراء کے ساتھ آپ کے مدرسے میں پہنچا، بادشاہ کی سواری نے ہر طرف چرچا کر دیا، لوگ بادشاہ کی زیارت کے لیے جمع ہونے لگے، آپ نے اپنی خانقاہ کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ کسی نے کہا۔ "حضرت! بادشاہ آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے!"

آپ نے جواب دیا "لیکن میں اس سے نہیں ملنا چاہتا۔"

وزیر نے کہا "حضرت! یہ آپ کیا غضب کر رہے ہیں، اس طرح آپ بادشاہ کو ناراض کر لیں گے۔"

آپ نے جواب دیا "میں بادشاہ کی زیارت سے بہتر اس سے کنارہ کشی کو سمجھتا ہوں بادشاہ سے کہہ دو میں اس سے نہیں ملنا چاہتا۔"

کسی امیر نے کہا "حضرت یہ آپ اچھا نہیں کر رہے ہیں، بادشاہ سلامت آپ سے ملنے آئے ہیں اور آپ ان سے بھاگ رہے ہیں۔"

آپ نے جب یہ دیکھا کہ لوگ نہیں مان رہے ہیں اور آپ کو بادشاہ سے ملاقات کرانے پر مصر ہیں تو مدرسہ کے پچھلے دروازے سے نکل کر کہیں اور چلے گئے۔

آخر بادشاہ مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔

کسی نے آپ سے پوچھا کہ "آپ نے ایسا کیوں کیا، بادشاہ سے ملاقات کیوں نہیں کی ہے"

انہوں نے جواب دیا "میں اپنا سکون قلب کھونا نہیں چاہتا، ایک فقیر کو بادشاہوں کی ملاقات سے کیا سروکار!"

* * * * * *

غازی خان نامی ایک امیر کے ہاں عرس کی تقریب میں بڑی گہما گہمی تھی آپ بھی وہاں تشریف لے گئے۔

فارغ اوقات میں لوگوں نے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں، ان میں بعض علمی باتیں کر رہے تھے۔ ان میں چند ایسے بھی تھے جو توحید پہ گفتگو کر رہے تھے۔

ایک نے عالمانہ شان سے کہا "توحید کے بغیر انسان ضلالت وگمراہی سے نہیں نکل سکتا۔ حجر و وحدانیت بڑی مشکل شے ہے۔"

دوسرے نے کہا "توحید اور وحدانیت پہ بات کرنے کے لیے علم اور وجدان کی یکسانی ضروری ہے، اگر آدمی محض عالم ہے تو وہ توحید کی سچی تعریف نہیں کر سکتا۔ جبکہ حاملِ وجدان عالم ہو یا نہ ہو، علم کی سچی تعریف کر سکتا ہے۔"

محفل میں کسی نے پوچھا "حضرت پھر یہاں کون ہے جو توحید کے معانی و مطالب سمجھائے گا۔"

اب ہر طرف سے توحید کی آوازیں آ رہی تھیں، یہ پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ آخر جوش میں آ کر حاضرین سے پوچھا "آپ حضرات توحید پہ باتیں تو کر رہے ہیں کیا آپ توحید سے واقف ہیں؟"

کئی نے ایک ساتھ جواب دیا "کیوں اس میں کیا خاص بات ہے؟"

ایک زیادہ لائق شخص نے کہا: "توحید خالص سے آپ کا کیا مطلب ہے؟"

انہوں نے جواب دیا: "توحید خالص وہ شے ہے کہ اگر یہ آدمی کو حاصل ہو تو اسے کسی اور چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔"

ایک آدمی ان دقیق علمی باتوں سے عاجز آیا ہوا تھا۔ کہنے لگا: "یہ اچھی بات کہی آپ نے کہ اگر کسی کو توحید خالص حاصل ہو تو پھر اسے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔"

آپ نے فرمایا: "میں نے جو کچھ کہا، یہ واقعہ ہے، اگر اس کا مشاہدہ کرنا ہے تو یہ بھی کر لو، ادھر دیکھو میری طرف مجھے توحید خالص حاصل ہے، اس کے نتیجے میں کائنات کی ہر چیز میرے قابو میں ہے۔"

یہ کہتے ہوئے آپ آگ کی طرف بڑھے بولے: "توحید خالص میں قیل و قال کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ آگ جو دوسروں کو جلا دیتی ہے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

آپ یہ کہتے ہوئے آگ میں داخل ہو گئے، کچھ دیر اس میں کھڑے رہ کر آپ باہر نکل آئے، آپ کو آگ نے ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچایا تھا دیکھنے والوں کو اس پر بڑی حیرت تھی۔

آپ کے ارادت مندوں میں ایک شخص اپنے بیٹے کو لے کر آپ کی خدمت میں آیا، وہ بہت غمزدہ نظر آتا تھا، آپ نے اس سے پوچھا: "تو غمزدہ کیوں ہے؟"

اس نے جواب دیا: "اب آپ سے کیا عرض کروں۔" پھر اپنے بیٹے کی طرف اشارہ کیا: "یہ میرا بیٹا ہے، اس کو ایک ایسا مرض لاحق ہو گیا ہے جس

سے میں پریشان ہو گیا ہوں۔ یہاں ایک طبیب ہے جس کا بڑا شہرہ ہے میں اس کو ان کے پاس لے جاؤں گا۔ آپ دعا فرمائیں کہ خدا اسے صحت یاب فرمائے۔"

آپ نے پوچھا، "آخر اس کو بیماری کون سی ہے۔ مجھے بھی تو بتاؤ۔"

اس شخص نے لڑکے کے جسم پر سے لباس ہٹا دیا۔ اس کا پورا جسم سفید داغوں سے پُر تھا، بولا، "یہ مرض ہے اس کو۔"

آپ نے دریافت فرمایا، "تو کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ وہ طبیب اس کو اپنی دواؤں سے اچھا کر دے گا۔"

اس شخص نے جواب دیا، "امید تو یہی ہے۔ آگے اللہ کی مرضی۔"

آپ نے فرمایا، "اس کو طبیب کے پاس مت لے جانا اس کا علاج میں خود کروں گا۔"

وہ شخص حیران ہوا، پوچھا، "اس کا علاج آپ کریں گے وہ کس طرح؟"

آپ نے لڑکے کے جسم پر موجود بہت سارے داغوں میں سے ایک پر اپنی انگلی رکھ دی اور فرمایا، "ایک تو گیا، کل پھر آجانا۔"

دوسرے دن جب لڑکا آپ کے پاس لایا گیا تو اس کا ایک داغ دور ہو چکا تھا، اس بار آپ نے اپنا ہاتھ دوسرے داغ پر رکھ دیا، صبح تک یہ بھی جاتا رہا اس طرح سارے داغ جاتے رہے۔

وہ شخص بے حد خوش ہوا اور آپ کے ارادتمندوں میں یہ سب سے زیادہ عقیدت رکھتا تھا۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب شہزادہ دارا شکوہ قندھار پر حکومت کرتا تھا، دارا شکوہ آپ کی بے حد عزت کرتا تھا۔ انہی دنوں دارا شکوہ کو اس کے

وقائع نویسوں نے بتایا کہ مرزا آصف بیگ والئ ایران عنقریب قندھار پر حملہ کرنے والا ہے اس کا کوئی تدارک کیجئے۔"

آپ نے جوش میں فرمایا "اس کی کیا مجال جو تمہاری مملکت پر دست درازی کرے۔ انشاءاللہ وہ خود ہی مارا جائے گا میں ان کی فکر نہیں کرتا۔"

آپ یہ فرما کر خاموش ہو گئے۔ ایک ماہ بعد ایران سے یہ خبر آئی کہ مرزا آصف بیگ کو اس کے دشمنوں نے زہر دے کر ہلاک کر دیا۔

داراشکوہ بے حد خوش ہوا، اس نے عرض کیا "حضرت! میں آپ کو شالامار باغ کی سیر کرانا چاہتا ہوں۔"

انہوں نے جواب دیا "میں ٹھہرا فقیر۔ یہ باغوں کی سیر میں کیا کروں گا۔"

شہزادہ بضد ہوا، بولا "نہیں حضرت میرا دل نہ توڑیے۔ میں آپ کو ضرور لے چلوں گا۔"

آپ نے فرمایا "اگر تو بضد ہے تو میں چلا چلوں گا۔"

شہزادہ داراشکوہ آپ کو شالامار باغ لے گیا، آپ اس میں دیر تک گھومتے پھرتے رہے۔

آپ ایک جگہ چلتے چلتے رک گئے اور آنکھیں بند کر لیں اور فرمایا "شہزادے! وہ مجھے طلب نہیں کرتے۔"

شہزادے نے پوچھا "حضرت کون؟"

آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

کچھ دیر بعد آپ پھر رک گئے اور پھر وہی فرمایا "وہ مجھے طلب نہیں کرتے۔"

داراشکوہ پھر بے چین ہو گیا اور پھر وہی سوال کیا "حضرت کون ؟ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں ؟

آپ پھر خاموش ہو گئے اور شہزادے کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

اچانک گھاس پر بیٹھ گئے اور شہزادے سے کہا "وہ مجھے طلب نہیں کرتے، اگر وہ طلب کریں تو مجھے میرے مرشد کی قبر کے پاس دفن کر دینا"

داراشکوہ اس وقت تو آپ کی باتوں کا مطلب نہیں سمجھ سکا، لیکن اس کا مفہوم چند دنوں بعد لیوں آگیا کہ آپ نے وصال فرمایا اور شہزادہ داراشکوہ نے حسب وصیت آپ کو حضرت میاں میر کے پاس دفن کر دیا۔

آپ کی تاریخ وفات ۱۰۶۰ھ ہے تاریخ پیدائش کا کچھ پتہ نہیں۔

دو بھائی دو ولی

حضرت مجدد الف ثانی کو خدا نے تین بیٹے دے رکھے تھے۔ ان تینوں کی ذہانت اور لیاقت کا بڑا شہرہ تھا اور کبھی کبھی ان کی بزرگی کا بھی مشاہدہ ہو جاتا تھا۔ ان کے حال و قال سے باپ کو بڑی خوشی مل رہی تھی۔ آپ درگاہ ربّ العزت میں شکرانہ پیش فرماتے اور کہتے۔ الٰہ العالمین تو عالم الغیب ہے اور خوب جانتا ہے کہ ان بیٹوں کے بعد ہمیں جو اولاد ملے گی وہ کیسی ہوگی۔ یہ تیری امانتیں ہیں، جس طرح اپنی مرضی سے دی ہیں اسی طرح اپنی مرضی سے جب چاہے واپس لے لے۔ میں شکوے میں ایک لفظ بھی بولوں تو گناہگار۔ بس اتنی التجا ہے تجھ سے کہ اس گھر میں نوحؑ کے بیٹے ہند جیسا کوئی بیٹا نہ ہو۔ اے اللہ! تو ہی عزت دیتا ہے اور تیری ہی طرف سے ذلت ہوتی ہے۔

اس دُعا کے بعد ایک بچّے کی اور ولادت ہوئی آپ نے اس بچّے کا نام رکھا "محمد فرخ"

فرخ کی عادات و اطوار کچھ عجیب سی تھیں، ننھا فرخ تنہائی میں کچھ سوچتا رہتا، ایسا لگتا اسے کسی کی تلاش ہے۔ کسی کا انتظار ہے اور تنہائی اسے اچھی نہیں لگ رہی ہے۔ وہ کبھی ماں کی طرف دیکھتے اور کبھی باپ کی طرف

اور پھر آسمان کی طرف دیکھنے لگتے۔

ایک دن حضرت مجدد الف ثانی نے خواب میں دیکھا کہ حضرت عیسیٰ تشریف لائے ہیں۔ حضرت مجدد ادب سے کھڑے ہو گئے۔

حضرت عیسیٰ نے پوچھا "کیوں شیخ احمد! تم نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟"

آپ نے جواب دیا "حضرت! یہ میری مجال کہ میں آپ سے سوال جواب کروں، اس وقت تو میں اپنی قسمت پہ ناز کر رہا ہوں کہ روح اللہ نے اس عاجز و ناچیز کے گھر میں قدم رنجہ فرمایا۔"

حضرت مسیح نے فرمایا "شیخ احمد! یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ میں دنیا میں کتنے سالوں کے لیے آیا تھا، صرف تیس سالوں کے لیے۔ ستائیس سال کی عمر میں فریضہ نبوت کی عملاً تلقین کی اور تین سال بعد، تیس سال کی عمر میں خدا نے مجھے اٹھا لیا۔ اب یہی سنت تمہارے گھر میں انجام دی جانے والی ہے اس لیے میری باتیں غور سے سنو اور ان پر عمل کرو۔"

شیخ احمد نے جواب میں فرمایا "یا حضرت ارشاد۔ بندہ تابعدار رہے گا۔"

حضرت عیسیٰ نے فرمایا "اللہ نے تمہیں چار بیٹے دے رکھے ہیں۔ اب پانچویں کی آمد آمد ہے اس پانچویں کا نام میرے نام پر رکھنا یعنی محمد عیسیٰ۔"

شیخ احمد کو کیا انکار ہو سکتا تھا۔ آپ نے جواب دیا "بہتر ہے۔ ان کی پیدائش کا کوئی خاص مقصد ہے؟"

حضرت عیسیٰ نے فرمایا "ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے اس میں کوئی خاص مقصد ضرور ودیعت کیا ہوا ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس خاص مقصد

کا کسی کو پتہ نہ چل سکے۔“

اس کے بعد شیخ احمد کی آنکھ کھل گئی۔ جستجو کرنے پر معلوم ہوا کہ پانچویں بچے کا جنین مادر میں استقرار ہو چکا ہے آپ نے اپنی زوجہ کی اچھی طرح دیکھ بھال کی۔ جب وضع حمل کی مدت پوری ہو گئی تو حسب بشارت گھر میں پانچواں بیٹا پیدا ہوا۔ آپ نے حضرت عیسیٰ کی بشارت والا واقعہ کسی کو بھی نہیں بتایا تھا۔ بیوی کا خیال تھا کہ نومولود کا نام برگزیدہ صحابہ کرام میں سے کسی ایک کے نام پر رکھ دیا جائے نومولود کے بھائیوں نے بھی چند نام تجویز کیے لیکن حضرت شیخ احمد نے فرمایا۔ ”اس نومولود کا نام کوئی نہ تجویز کرے کیونکہ اس کا نام ایک جلیل القدر پیغمبر نے اس کی ولادت سے پہلے ہی تجویز کر دیا تھا۔“

گھر والے اس حیران کن اعلان سے خاموش ہو گئے۔ ان میں سے کسی نے بھی آپ سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کون سا جلیل القدر پیغمبر ہے جس نے اس بچے کا نام پہلے ہی تجویز کر رکھا ہے۔ خاموش سبھی تھے لیکن یہ سوال ہر کسی کے چہرے پر لکھا ہوا تھا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”وہ جلیل القدر پیغمبر حضرت عیسیٰ ہیں آپ نے فرمایا تھا کہ اس کا نام میرے نام پر رکھنا چنانچہ میں نے عرصہ پہلے ہی اس کا نام محمد عیسیٰ رکھ دیا تھا۔“

اس نام کو ہر کسی نے ہنسی خوشی قبول کر لیا اور محمد عیسیٰ پر ہر کوئی اپنی جان چھڑکنے لگا۔

عیسیٰ کی ولادت نے فرخ کو پُرسکون کر دیا تھا، وہ بہت خوش تھے اور ہر وقت بھائی کے آس پاس رہتے۔ کبھی گود میں اٹھانے کی کوشش کرتے اور کبھی نومولود کے پاس لیٹ کر اس سے کھیلنے کی کوشش کرتے۔ فرخ اپنے

چھوٹے بھائی عیسیٰ سے پانچ سال بڑے تھے۔

پھر جب عیسیٰ نے کچھ کچھ ہوش سنبھالا تو وہ بھی فرخ سے بہت مانوس ہو گئے۔ لوگوں نے کئی بار یہ عجیب و غریب منظر بھی دیکھا کہ بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کو اٹھانے کی کوشش میں زمین پر گرا دیا۔ مگر چوٹ ذرا سی بھی نہیں آئی۔ ان دونوں کی مثالی محبت نے یک جان دو قالب مشہور کر دیا تھا۔

جب عیسیٰ کی عمر چار سال کی ہو گئی اور فرخ کی عمر نو سال تو ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آ گیا اس واقعہ نے سبھی کو ان دونوں کی طرف متوجہ کر دیا۔

ان دونوں کے مثالی میل ملاپ اور چاہت نے انہیں ہر طرف مشہور کر دیا تھا، پاس پڑوس کی عورتیں انہیں دیکھنے آئیں پھر دور کے لوگ بھی ان کی زیارت کو آنے لگے۔

پڑوس کے مولوی صاحب کی بیوی ان دنوں امید سے تھیں وہ عورتوں میں بیٹھی آنے والے کی باتیں کر رہی تھیں۔

ایک خاتون بولیں: ”کسی کو کیا پتہ کہ آنے والا لڑکا ہے یا لڑکی ہے“

کوئی دوسری خاتون بولیں: ”یہ تو اللہ ہی جانے کہ وہ کیا دیتا ہے۔“

مولوی صاحب کی زوجہ بولیں: ”اللہ نے پانچ لڑکے پہلے ہی دے رکھے ہیں اب تو اپنی یہ خواہش ہے کہ ایک لڑکی بھی عطا ہو جائے، ویسے اللہ کی مرضی میں کسی کو کیا دخل، وہ جو بھی دے گا شکریہ کے ساتھ قبول کر لوں گی۔“

ایک عمر رسیدہ خاتون نے کہا: ”اے کاش یہ ممکن ہوتا کہ آنے والے کو ماں کے پیٹ ہی میں دیکھا جا سکتا اور ہمیں یہ معلوم ہو جاتا کہ آنے والا لڑکا ہے یا لڑکی۔“

ایک دوسری عورت نے جواب دیا "بی بی! یہ اللہ کا بھید ہے۔ کوئی انسان کس طرح جان سکتا ہے۔"

قریب ہی محمد عیسٰی اور محمد فرخ کھیل میں مشغول تھے۔ عیسٰی ان عورتوں کی باتیں نہایت توجہ سے سُن رہے تھے۔ جب یہ عورتیں باتیں کرتے کرتے چُپ ہو گئیں تو چار سالہ عیسٰی نے مولوی صاحب کی بیوی سے کہا۔

"خالہ! میں بتاؤں کہ آنے والا کون ہے؟"

مولوی صاحب کی بیوی نے حیرت سے پوچھا "بیٹے! تم کیا بتاؤ گے، تمہیں کیا معلوم؟"

عیسٰی نے جواب دیا "خالہ! میں یہ بتا سکتا ہوں اسی لیے تو کہہ رہا ہوں آپ پوچھیں تو سہی۔"

عورتوں کو اس معصوم کی باتوں پر یقین نہیں آیا مگر پھر بھی خالہ نے پوچھ ہی لیا "اچھا بیٹے! بتانا تو سہی کہ میرے ہاں لڑکا ہوگا یا لڑکی؟"

عیسٰی نے اس عورت کو بغور دیکھا اور جواب دیا "لڑکی۔"

تمام عورتیں انہیں حیرت سے دیکھنے لگیں اور عیسٰی اپنے بھائی فرخ کے ساتھ کھیلنے لگے۔

مولوی صاحب کی بیوی نے انتظار کا زمانہ مشکلوں سے گزارا، دوسری عورتیں بھی عیسٰی کی پیش گوئی کے سچ یا جھوٹ ہونے کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں۔ اللہ اللہ کر کے دن پورے ہوئے اور دائی کی مدد سے نومولود نے دنیا میں جب قدم رکھا تو یہ دیکھ کر سبھی حیران رہ گئے کہ وہ بچی تھی۔ مولوی صاحب کی بیوی کو اس ننھے ولی سے بڑی عقیدت ہو گئی، مگر دو چار ایسی عورتیں بھی تھیں جو کہہ رہی تھیں کہ یہ تو اتفاق سے پیش گوئی سچی ہو گئی ورنہ اس معصوم

میں ولیوں جیسی خصوصیات اور اوصاف کہاں۔

اس بات کا شہرہ ہوا تو عیسیٰ کے پاس عورتوں کی آمدورفت شروع ہوگئی ، ان عورتوں کی عجیب وغریب خواہشیں ہوتی تھیں ایک نے پوچھا۔

" ننھے ولی ! تین سال ہوئے میرا شوہر پردیس چلا گیا ، اس کی دو سال سے کوئی خیریت بھی نہیں معلوم ہوسکی ، کیا آپ بتائیں گے کہ میرا شوہر کب واپس آئے گا یا پھر وہ اگر نہیں آئے گا تو اس کی خیریت ہمیں کب معلوم ہوگی ؟"

عیسیٰ نے کسی قدر غور سے اس عورت کو دیکھا اور منہ پھیر کر جواب دیا۔

"آپ اپنے کس شوہر کی بابت جاننا چاہتی ہیں کیونکہ آپ یہاں بیٹھی ہیں اور آپ کا شوہر آپ کے گھر میں آپ کا انتظار کر رہا ہے "

اس عورت کو ایسا لگا جیسے آپ غلط بیانی سے کام لے رہے ہوں ، اس نے دوسری عورتوں سے کہا ، " ننھے کی بات پر یقین تو نہیں آتا بہرحال میں گھر جاتی ہوں اور اس کے جھوٹ سچ کی بابت ابھی واپس آکے بتاتی ہوں "

ایک عورت نے اس معصوم بچے کو سمجھانے کی کوشش کی ، اس نے کہا ، " عیسیٰ ! تم کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ تم کس باپ کے بیٹے ہو ، تم نے اتنی بڑی بات سوچے سمجھے بغیر کس طرح کہہ دی ۔ بہرحال اگر آج تم جھوٹے ٹھہرے تو تم ہمیشہ کے لیے ذلیل وخوار ہو جاؤ گے ، اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم سے جب کوئی کچھ پوچھے تو اس سے یہ صاف صاف کہہ دو کہ غیب کی باتوں کا حال صرف اللہ جانتا ہے ، میں اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں جانتا "

ننھے ولی نے جواب دیا ، " میں ایسی بات کیوں کر کہہ سکتا ہوں ، میں وہی بتاتا ہوں جس کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہوں ، اس لیے کوئی ڈر کی بات ہی نہیں "

بات یہاں تک پہنچ کر ختم ہوگئی، وہ عورت جس کا شوہر کئی سال سے پردیس گیا ہوا تھا اور جس کی خیریت تک کئی سال سے نہیں معلوم ہوسکی تھی، اسے لے کر وہ عورت آپ کے پاس حاضر ہوئی آپ کا منہ زبردستی کھلوایا، اور اس میں ایک گلاب جامن ڈال دیا اور کہا "میاں صاحبزادے میں تم سے پوچھتی ہوں کہ تم ہو کیا آخر ہے"

عیسٰی نے جواب دیا۔"میں آدمی ہوں، بالکل آپ لوگوں جیسا لیکن مجھ میں اور آپ میں ایک فرق بھی ہے، میں آدمی بھی ہوں اور اللہ کی عنایات سے ایک خاص انسان بھی۔"

اس واقعہ نے آپ کی شہرت میں چار چاند لگا دیے اور ننھے عیسٰی کی زیارت کو دور دور سے لوگ آنے لگے۔

اور فرخ کا بھی یہی حال تھا، ان کی باتیں بھی حیرت انگیز حد تک صحیح ہوتی جا رہی تھیں۔

شیخ احمد نے ان دونوں کو آمنے سامنے بٹھا کر سمجھانے کی کوشش کی۔"بچو! ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ تم ابھی سے اپنے کمالات کی تشہیر میں لگ گئے! احتیاط کرو، محتاط رہو۔ ورنہ دنیا والے تمہیں چاروں طرف سے گھیر لیں گے اور تمہارا سکھ چین لٹ جائے گا۔"

فرخ نے جواب دیا۔"بابا جان! ہمیں جو کچھ معلوم ہو جاتا ہے بتا دیتے ہیں، نہ بتائیں تو بخیل کہلائیں۔ ہم بھی مجبور ہیں اور لوگ بھی مجبور ہیں۔"

عیسٰی نے جواب میں عرض کیا۔" یہی حال میرا بھی ہے۔ میں جو کچھ دیکھتا ہوں کھلی کتاب کی طرح دیکھ لیتا ہوں۔ میں خود بھی بخل سے بچتا ہوں اور ہر بات صاف صاف بتا دیتا ہوں۔"

ایک دن جب ایک عورت کو عیسیٰ نے یہ بتایا کہ تیرے ہاں جڑواں بچے پیدا ہوں گے اور ان میں ایک لڑکی ہو گی اور دوسرا لڑکا تو وہ عورت پریشان ہو کے بولی "معصوم بچے! یہ جو تم مسائل پر ایک نظر ڈالتے ہی فر فر بتانے لگتے ہو کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ یہ کس طرح ہے؟"

عیسیٰ نے جواب دیا "اس میں کمال کی کوئی بات نہیں، میں جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں، زبان سے بتا دیتا ہوں، بس اتنی سی بات ہے۔"

عورت چکرا گئی، پوچھا "اپنی آنکھوں سے تم کیا دیکھ لیتے ہو؟"

عیسیٰ نے جواب دیا "سوال کا جواب۔ ابھی ابھی آپ نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میرے ہاں لڑکی پیدا ہو گی یا لڑکا؟ میں نے آپ کے پیٹ کی طرف دیکھا تو مجھے آپ کا پیٹ آئینے کی طرح شفاف نظر آیا۔ میں نے اس آئینے میں دو جڑواں بچے دیکھے، ان میں ایک لڑکا ہے اور دوسری لڑکی۔ بس میں نے جو کچھ مشاہدہ کیا تھا، اسے اپنی زبان سے ادا کر دیا۔"

عورت کی سمجھ میں آپ کی یہ آخری باتیں ذرا بھی نہیں آئیں، اس نے کہا۔ "میاں صاحبزادے! اپنے حواسوں میں تو ہو؟"

عیسیٰ نے جواب دیا "میں بالکل اپنے حواسوں میں ہوں، آپ میری باتوں پر تعجب کیوں فرما رہی ہیں؟"

عورت نے کہا "صاحبزادے! تم نے مجھ سے جو کچھ کہا، خدا کے لیے کسی اور سے نہ کہہ دینا۔ اگر تم نے میری یہ بات نہیں مانی تو آگے چل کر پریشان ہو جاؤ گے۔"

عیسیٰ نے پوچھا "میں کیا پریشان ہو جاؤں گا، یہ آپ مجھے ڈرا سہما کیوں رہی ہیں؟"

عورت نے جواب دیا۔ "میں کوئی ڈرا سہما نہیں رہی۔ میں تو تم سے یہ کہہ رہی ہوں کہ تم کسی سے یہی باتیں نہ کہہ دینا کہ آپ کا پیٹ آئینے کی طرف شفاف نظر آرہا ہے، تمہاری یہ بات ملنے گا کون ہے؟"

عیسٰی نے جواب دیا۔ "ہر وہ شخص میری یہ بات مان لے گا جس کو میں بتاؤں گا اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟"

عورت نے کہا۔ "اچھا اگر یہ بات ہے تو میں تم سے یہ کہتی ہوں کہ میں تمہاری جڑواں بچوں والی پیش گوئی پہ یقین نہیں رکھتی، میں کس طرح یہ یقین کرلوں کہ میرا پیٹ آئینے کی طرف صاف نظر آرہا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "اس طرح! اے عورت! ذرا اپنے پیٹ کی طرف دیکھ تو سہی، اللہ نے چاہا تو جو میں دیکھ رہا ہوں وہی سب دوسرے بھی دیکھنے لگیں گے۔"

اس عورت نے اپنے پیٹ کی طرف نظر جو کی تو وہ واقعی آئینے کی طرح شفاف نظر آرہا تھا اور اس میں دو بچے ایک لڑکی اور ایک لڑکا ہم آغوش صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اب یہ عورت آپ پہ پورا ایمان لاچکی تھی۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

حضرت مجدد الف ثانی کے ایک مرید مولانا امان اللہ فقیہہ ایک روز آپ کے پاس نہایت اداس اور افسردہ آئے۔ حضرت مجدد الف ثانی نے ان سے پوچھا۔ "امان اللہ تم اداس کیوں ہو؟"

مولانا نے ایک سرد آہ بھری اور عرض کیا۔ "حضرت! کیا بتاؤں، زبان نہیں کھلتی، ذرا شرمناک سی بات ہے۔"

حضرت مجدد الف ثانی نے فرمایا۔ "وہ شرمناک بات ہمیں بھی تو معلوم ہو!"

مولانا امان اللہ فقیہہ نے رک رک کر بتایا "حضرت! یہاں سے چند منزل دور ایک گاؤں میں میری شادی ہو رہی تھی، عین نکاح کے وقت کسی مفسد نے میری بابت لڑکی والوں سے یہ کہہ دیا کہ امان اللہ اس لائق ہی نہیں کہ اس کو لڑکی دی جائے، چنانچہ ہزاروں آدمیوں میں مجھے شرمندہ اور سبک سار ہونا پڑا۔"

حضرت مجدد الف ثانی نے اس وقت عیسیٰ کو طلب کیا اور ان سے پوچھا۔ "بیٹا عیسیٰ! مولانا امان اللہ فقیہہ پر ایک شرمناک الزام لگایا گیا ہے ذرا تم بتانا تو سہی کہ اس میں کتنا جھوٹ اور کتنا سچ ہے؟"

عیسیٰ نے مولانا کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے جواب دیا "گاؤں والوں نے آپ کے ساتھ بڑی زیادتی کی حالانکہ اس لڑکی سے ان کا نکاح ہو چکا ہے اور میں ان کی اولاد کو ان کے گھر میں شاداں و فرحاں دیکھ رہا ہوں۔"

عیسیٰ نے ابھی بات ختم ہی کی تھی کہ معلوم ہوا کہ گاؤں والے مولانا امان اللہ کو تلاش کرتے ہوئے حضرت مجدد الف ثانی کی خانقاہ تک آ چکے ہیں۔ حضرت مجدد نے انہیں طلب فرمایا تو وہ رونے لگے، بولے "حضرت! ہم سے بڑی غلطی ہو گئی ہے، ہم اپنے کیے پر بے حد شرمندہ ہیں اور مولانا امان کو لینے کے لیے آئے ہیں۔"

وہ لوگ مولانا امان اللہ کو اپنے ساتھ لے گئے اور اپنی لڑکی کا نکاح پڑھا کر ان کے حوالے کر دیا۔

اب محمد فرخ پندرہ سال کے ہو چکے تھے اور محمد عیسیٰ آٹھ سال کے۔ دونوں پڑھنے میں لاجواب تھے۔ اساتذہ کو ان کی ذہانت اور حافظہ پر رشک آتا تھا۔

ایک دن حضرت مجدد الف ثانی نے ان دونوں بھائیوں کو کمرے میں بند روتے ہوئے دیکھا۔ آپ اندر گئے اور کچھ دیر کھڑے رہ کر یہ افسوسناک منظر دیکھا کہ دونوں توبہ استغفار کرتے جا رہے ہیں اور روتے جا رہے ہیں۔

آپ نے ان سے پوچھا "میرے بچو! تمہارا یہ کیا حال ہے؟ خیریت تو ہے تم رو کیوں رہے ہو؟"

فرخ نے جواب دیا۔ "باوا جان! دنیا میں معصیت کی حکمرانی ہے۔ میں اس سے لرزاں و ترساں ہوں، کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ میں اس سے محفوظ و مسعون رہوں۔"

حضرت مجدد نے فرمایا "تم اپنے اللہ سے پناہ مانگتے رہو، تمہارے لیے بس یہی کافی ہے۔"

عیسیٰ نے عرض کیا۔ "اور باواجان! جو لوگ لمبی لمبی عمریں لے کر اس دنیا میں آتے ہیں، آخر میں ان کا کیا حال ہو جاتا ہے؟"

حضرت مجدد کا اس سوال پر ماتھا ٹھنکا، آپ نے جواب دیا "میرے بچو! یہاں جو کچھ ہے اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ ہی کے لیے ہے۔ تائید ایزدی اور توفیق ربی شامل حال نہ ہو تو انسان بے نیل و مرام ہی رخصت ہو جاتا ہے ورنہ دنیا سے پاک و منزہ اٹھتا ہے۔"

فرخ نے عرض کیا "باواجان! جینے سے اپنی طبیعت سیر ہو چکی ہے دنیا اچھی نہیں لگ رہی۔"

حضرت مجدد نے اپنی پریشانی چھپائی اور دونوں کو سمجھانے کی کوشش کی "یہ تم دونوں مایوسی کے شکار کیوں اور کب سے ہو گئے؟ ابھی تمہاری عمریں ہی کیا ہیں۔ ایسی باتیں نہ کرو کہ تمہارے باپ کا دل دہل جائے۔"

فرخ نے عرض کیا۔"مشیت ایزدی تو پوری ہو کر رہے گی۔"

حضرت مجدد ان دونوں کو سمجھا بجھا کر باہر نکلے تو آپ کے ایک مرید نے بتایا۔"حضرت! سرہند کے شمالی حصے سے طاعون کی وبا نمودار ہوگئی ہے لوگ۔ لوگ بستی خالی کر رہے ہیں۔ آپ کیا فرماتے ہیں؟"

حضرت مجدد نے جواب دیا۔"لوگ بھاگ کر کہاں جا رہے ہیں؟ قضائے الٰہی کہاں نہیں ہے؟ کیا انسان میں اتنی طاقت ہے کہ وہ قضائے الٰہی سے بھاگ سکے؟"

مرید نے کہا۔"حضرت! جب رسول اللہ ؐ کے مشہور صحابی امین الامت ابوعبیدہ بن الجراح ؓ اسی بیماری میں مبتلا ہوئے تھے تو حضرت عمر ؓ نے انہیں یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ کہ اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں تو حضرت امین الامت ؓ نے یہی فرمایا تھا کہ عمر! کیا تقدیر الٰہی سے بھاگا جا سکتا ہے؟"

حضرت عمر نے اس جگہ کو فوراً ہی چھوڑ دیا تھا اور امین الامت ؓ سے کہا تھا کہ"حضرت! میں تو چلا۔"

اس پر حضرت ابوعبیدہ ؓ نے ان سے کہا تھا کہ"عمر! تم قضائے الٰہی سے بھاگ رہے ہو۔"

حضرت عمر ؓ نے انہیں برجستہ جواب دیا تھا۔"جی میں قضائے الٰہی سے قضائے الٰہی کی طرف بھاگ رہا ہوں۔"

اس کے بعد حضرت عمر تو اس بیماری سے بچ گئے تھے مگر ابوعبیدہ نے اسی مرض میں وفات پائی۔"

حضرت مجدد نے پوچھا۔"تو کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم سب طاعون سے خوفزدہ ہو کر راہ فرار اختیار کریں؟"

مریدنے عرض کیا "حضور میں یہ مشورہ آپ کو کس طرح دے سکتا ہوں میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ لوگ ایسا کر رہے ہیں۔"

اس دن شام تک یہ وبا سیلاب کی طرح پورے شہر میں داخل ہو گئی صبح بخار آیا۔ شام کو گلٹی نکلی اور دوسرے دن صبح مریض رخصت۔ گھر کے گھر صاف ہونے لگے۔ ہر طرف سے اذانوں کی آوازیں آنے لگیں۔

اسی عالم میں گھر کے اندر سے حضرت مجدد کو مطلع کیا گیا کہ فرخ بخار میں مبتلا ہیں۔

آپ انہیں دیکھنے گئے، پیشانی پہ ہاتھ رکھا تو وہ آگ ہو رہی تھی اور فرخ کو ہوش نہیں تھی۔

کچھ ہی دیر بعد کسی نے حضرت مجدد کو مطلع کیا "عیسیٰ بھی بیمار پڑ گئے۔"

حضرت مجدد عیسیٰ کو دیکھنے چلے گئے جو ایک دوسرے کمرے میں لیٹے ہوئے تھے، آپ نے ان کی پیشانی ٹٹولی تو وہ بھی آگ ہو رہی تھی مگر یہ ابھی ہوش میں تھے۔ حضرت مجدد نے پوچھا "عیسیٰ! کیا حال ہے؟"

عیسیٰ نے کمزور آواز میں جواب دیا "ٹھیک ہوں باوا جان!"

ان کی آنکھوں میں آنسو آ چکے تھے۔

کسی مرید نے مشورہ دیا کہ دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے کی بیماری سے لاعلم رکھا جائے۔

حضرت مجدد نے فرمایا "یہ کس طرح ممکن ہے ان دونوں کو ہر بات کا علم ہو جاتا ہے۔"

مرید نے عرض کیا "حضرت بشریت کی حد تک۔ آپ فرخ کو عیسیٰ کی بیماری سے اور عیسیٰ کو فرخ کی بیماری سے لاعلم رکھیں۔ کیونکہ اگر دونوں کو

اس بیماری کا پتہ چل گیا تو معلوم نہیں ان پر اس کا کیا اثر ہو۔"

حضرت مجدد نے مرید کے مشورے پر اس طرح عمل کیا کہ فرخ کو خانقاہ کے ایک حجرے میں منتقل کر دیا اور عیسیٰ کو زنان خانے میں رکھا۔ علاج اور تیمارداری کا سلسلہ شدومد سے جاری تھا۔

حضرت مجدد نے عیسیٰ کی بغل کو ٹٹول کر دیکھا تو وہاں دونوں طرف گلٹیاں نمودار ہو چکی تھیں۔ آپ نے آہستہ سے انا للہ کہا اور آسمان کی طرف دیکھا۔ فرمایا "مرضی مولا از ہمہ اولیٰ۔"

بعد میں اپنے بیٹے عیسیٰ سے پوچھا "بیٹے! اب کیسی طبیعت ہے؟"
میں نے نہایت کمزور آواز میں جواب دیا "ٹھیک ہوں بابا جان۔ اس کے سوا اور کیا عرض کروں؟"

حضرت مجدد نے ان پر کچھ پڑھ کر دم کیا اور فرمایا "خدا تمہاری مشکل آسان کرے۔"

ابھی آپ کا یہ فقرہ پورا ہی ہوا تھا کہ عیسیٰ نے حسرت ناک نظروں سے اپنے باپ کو دیکھا اور ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ باپ نے چہرے پر چادر ڈال دی اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے فرمایا "تیری امانت بصد صبر و شکر تجھے پہنچ گئی۔"

گھر والوں کو آپ نے منع کر دیا کہ رونے کی کوئی ضرورت نہیں، ہاں اس طرح کہ شور نہ ہو، دلوں میں رو لیا جائے۔

کسی نے مشورہ دیا "حضرت! فرخ کے پاس تشریف لے جائیں مگر انہیں عیسیٰ کی وفات کا پتہ نہ چلے۔"

حضرت مجدد نے جواب دیا "مگر یہ کس طرح ممکن ہے کہ فرخ کو یہ سب

نہ معلوم ہو، اسے ضرور معلوم ہو چکا ہوگا۔"

دوسرے حضرات عیسیٰ کی تجہیز و تکفین میں مشغول ہو گئے اور حضرت مجدد فرخ کے پاس چلے گئے۔

فرخ نے حضرت مجدد سے کہا۔" باوا جان! میری دونوں بغلوں میں یہ پھوڑے کیسے ہیں؟"

حضرت مجدد کا دل بھر آیا۔ آپ نے فرمایا۔" کوئی بات نہیں بیٹے۔ اس بیماری میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

فرخ نے کہا۔" باوا جان! میری طرف دیکھئے۔ ادھر میری آنکھوں میں۔"

آپ نے ان آنکھوں میں دیکھا، آنسوؤں سے لبریز تھیں دونوں آنکھیں۔

فرخ نے اپنے باپ سے شکایت کی۔" باوا جان! یہ کیسی بے وفائی ہے کہ بھائی عیسیٰ مجھ سے پہلے چلے گئے اور آپ نے مجھے بتایا تک نہیں۔"

اب باپ کے لیے مزید صبر دشوار ہو گیا تھا۔ مختصراً جواب دیا۔" بیٹے! جو بات تجھے از خود معلوم ہو چکی ہے اس کا بتانا فضول سمجھ کر خاموش ہو گیا تھا۔"

حضرت مجدد الف ثانی ذرا دیر کے لیے وہاں سے ہٹ گئے۔ ان کے ہٹتے ہی مولانا عبدالحیؒ فرخ کے پاس بیٹھ گئے۔ اس وقت فرخ کہہ رہے تھے۔

" بھائی عیسیٰ! تم نے بڑی بے وفائی کی۔ ہم سے پہلے چلے گئے۔"

مولانا عبدالحیؒ نے پوچھا۔" بابا فرخ یہ آپ کس سے مخاطب ہیں؟"

فرخ نے جواب دیا۔" بھائی عیسیٰ سے جو رحلت میں ہم سے سبقت لے گئے۔"

مولانا عبدالحیؒ نے بات بنائی۔" لیکن بابا عیسیٰ تو اندر موجود ہیں ان کے انتقال کی خبر تم کو کس نے دی ہے؟"

فرخ نے جواب دیا۔" ہاں وہ اندر موجود ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ ملائکہ اس کو غسل دے رہے ہیں۔"

یہ فرمایا اور ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔

حضرت مجدد الف ثانی نے ان دونوں کی وفات پر فرمایا۔" یہ دونوں قیمتی موتی تھے جو امانت کے طور پر ہمارے سپرد کیے گئے تھے، اللہ تیرا شکر اور احسان ہے کہ ہم بلا جبر و کراہ تیری امانت واپس کرنے میں سرخرو اور کامیاب ہوئے۔ اے اللہ! تو ان کے اجر سے ہمیں محروم نہ رکھ اور ان کے بعد ہمیں کسی فتنے میں نہ ڈال۔ بحرمتہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم۔"

خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود۔

خواجہ محمد فرخ :۔ پیدائش ۱۰۱۰ھ وفات ۷، ربیع الاول ۱۰۲۵ھ

خواجہ محمد عیسیٰ :۔ پیدائش ۱۰۱۵ھ وفات ۷، ربیع الاول ۱۰۲۵ھ

شیخ مادھو لعل حسین لاہوری

لاہور کے مشہور صوفی شیخ حسین اپنی بیٹھک میں تشریف فرما تھے۔ انہیں ان کے ارادت مندوں نے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ بیٹھک کا دروازہ کھلا ہوا تھا، سامنے کی سڑک کا نظارہ کھلی آنکھوں کے لیے عام تھا، آتے جاتے لوگ ان درویشوں کو دیکھتے اور کچھ عجیب قسم کا احساس لیے گزر جاتے۔ کسی کسی لمحہ درویش بھی انہیں دیکھ لیتے۔ صوفی شیخ حسین تصوف کے مسائل بیان فرما رہے تھے۔ اسی دوران سامنے کی سڑک پر ایک خوبصورت نوجوان برہمن زادہ اپنے شاندار لباس میں گزرا۔ شیخ حسین کی نظریں اچانک اس نوجوان برہمن زادے سے ٹکرائیں۔ اس نظری تصادم میں معلوم نہیں کیا جادو تھا کہ شیخ حسین کا حال غیر ہو گیا، آپ نے اپنے ارادت مندوں کو وہیں چھوڑا اور باہر نکل کر اس برہمن زادے کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔

ارادت مندوں کو حیرت تھی کہ یہ اچانک پیر و مرشد کو کیا ہو گیا۔ شیخ حسین کی نظریں دیر تک اس برہمن زادے کا تعاقب کرتی رہیں، جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو آپ مضطرب اور بے چین ہو کر ایک ایک سے پوچھنے لگے۔

"کیا تم میں سے کوئی اس خوش جمال سوار سے واقف ہے؟"

ایک مرید نے جواب دیا "حضرت! میں جانتا ہوں اس نوجوان کو۔"

شیخ حسین نے بے قراری سے پوچھا "یہ کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟"

مرید نے جواب دیا "جناب والا! یہ شاہدرہ میں رہتا ہے، اس کا نام مادھولال ہے، خود کچھ نہیں کرتا، اس کا باپ بہت بڑا کاروباری ہے اپنی ذات کے اعتبار سے یہ برہمن ہے۔"

آپ نے کہا "تو یہ شاہدرہ میں رہتا ہے، یعنی میں اس سے شاہدرہ میں مل سکتا ہے۔"

مرید پریشان ہو رہے تھے کہ یہ پیر و مرشد کو ہو کیا گیا ہے۔

مرید سوچتے رہے اور شیخ حسین شاہدرہ روانہ ہو گئے۔ سب کو چھوڑ چھاڑ کر شاہدرہ کی گلی کوچوں میں وہ برہمن زادے کا گھر تلاش کر لیا، آپ نے اس گھر کے سامنے ایک درخت تلے رہائش اختیار کر لی۔

دن بھر تو آپ خاموش رہے لیکن رات کو آپ نے وہ جگہ چھوڑ دی اور اس برہمن زادے کے مکان کے چاروں طرف پھرنا شروع کر دیا۔

مادھولال برہمن زادے کو ابھی تک کوئی پتہ نہ تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے کئی دن بعد شیخ حسین کا ایک مرید چھپتا چھپاتا مادھولال کے پاس پہنچا۔ اس نے پچھلے در پہ دستک دی، اندر سے ملازم نمودار ہوا، پوچھا "کیا ہے؟ کس سے ملنا ہے؟"

مرید نے جواب دیا "میں مادھولال سے ملنا چاہتا ہوں۔"

ملازم اندر چلا گیا، اور کچھ دیر بعد مادھولال نے آ کر دریافت کیا "کیا بات ہے تم کون ہو؟"

مرید نے جواب دیا" صاحبزادے! میں تم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں، لیکن یہاں نہیں، کہیں اور چلو، اس مکان اس بستی سے دور"

مادھولال نے حیرت سے پوچھا" یہاں کیوں نہیں؟ کہیں اور کیوں؟"

مرید نے جواب دیا" میں یہاں وہ باتیں نہیں کر سکتا۔ تم میرے ساتھ چلو تو سہی"

مادھولال کو اس پُر اسرار انسان پر کسی قسم کا شبہ ہو رہا تھا۔ پوچھا۔ "آخر کچھ تو معلوم ہو کہ تم کون ہو اور مجھ سے کس قسم کی باتیں کرنا چاہتے ہو؟"

مادھولال اسے اپنی حویلی کے ایک گوشے میں لے گیا اور کہا" دیکھو یہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی بھی نہیں، اب بتاؤ تم مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہو"

مرید نے کہا" دیکھو مادھولال! تم بے حد حسین ہو، شاید تمہیں اپنے بے مثال اور فتنہ ساماں حسن کا احساس بھی نہ ہو لیکن تمہارے خانہ خراب حسن نے میرے پیر و مرشد کو کہیں کا بھی نہیں رکھا۔ انہوں نے کئی دن پہلے اچانک تمہیں دیکھ لیا تھا، اس کے بعد سے ان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں، انہوں نے تمہارے گھر کے سامنے ایک درخت کے نیچے مستقلاً بسیرا کر لیا ہے اور سننے میں یہ آیا ہے کہ وہ رات کو تمہاری حویلی کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں وہ تقریباً دیوانے ہو گئے ہیں۔

مادھولال کو مرید کی ان باتوں پہ یقین نہیں آیا، حیرت سے کہا" کیا تم یہ سب کچھ کہہ رہے ہو؟"

مرید نے جواب دیا" میں اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولوں گا۔ میں نے جو کچھ کہا، اس کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر سکتے ہو"

مرید تو یہ سب بتا کر پچھلے دروازے ہی سے چلتا بنا، مادھولال نے

حویلی کے صدر دروازے سے شیخ حسین کو ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے دیکھا اس وقت بھی وہ مادھو لال ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مادھو لال پریشان ہو گیا، اس نے حویلی کا صدر دروازہ بند کر کے اپنے مینم جی کو اپنا رازدار بنا لیا اور پورا واقعہ اس کے علم میں لا کر پوچھا "مینم جی! اب آپ ہی بتائیں کہ میں کیا کروں یہ شخص تو مجھے بدنام کر دے گا۔"

مینم جی نے یہ سب کچھ بہت غور سے سُن کر جواب دیا "مادھو بیٹے! کیا تمہیں یقین ہے کہ جو کچھ تم نے بتایا، بالکل درست ہے۔"

مادھو لال نے کہا "آپ باہر جا کے خود مشاہدہ کر لیں۔"

مینم جی نے باہر جا کر جائزہ جو لیا تو شیخ حسین نے انہیں روک لیا، کہا۔

"مینم جی! میں جانتا ہوں کہ تم یہاں کیا دیکھنے آئے تھے، بہر حال تم مادھو لال سے کہہ دو کہ میں نے اس کے چہرے اور حُسن میں جس کا پرتو دیکھا ہے میں اس پر عاشق ہوا ہوں، عشق کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے محبوب کو اپنی آنکھوں سے دیکھے میں نے خدا کو نہیں دیکھا اس لیے میں خدا سے والہانہ عشق نہیں کر سکتا۔ لیکن جب میں نے مادھو لال میں اس کی جھلک دیکھی تو میں نے از خود رفتہ ہو کر مادھو لال کو اپنا محبوب بنا لیا۔ میں نے مادھو لال میں جو کچھ دیکھا ہے افسوس ہے کہ وہ کسی اور کو نہیں دکھا سکتا۔"

مینم جی کو حیرت تھی کہ ان کی اور مادھو لال کی باہمی گفتگو کا شیخ حسین کو کس طرح علم ہو گیا۔ مینم جی نے مرعوب لہجے میں کہا "میاں جی! اب آپ سے کیا چھپانا، مادھو لال کو جب آپ کے عشق کا علم ہوا تو وہ حویلی میں قید ہو کر رہ گیا، وہ کہتا ہے کہ اس طرح تو آپ اسے رسوا کر دیں گے۔"

شیخ حسین نے ہنس کر جواب دیا "حُسن، عشق اور رسوائی یہ آپس میں

لازم و ملزوم ہیں، مادھولال کو حُسن ملا، مجھے عشق عطا ہوا، اب رسوائی کا بوجھ ہم دونوں کو مل جل کر اٹھانا ہوگا، رسوائی سے کیا ڈرنا۔"

مینم جی کو غصہ آگیا، کہا "میاں جی! آپ خود تو بے گھر ہیں، بے در ہیں، آپ رسوا ہوئے تو کیا نہ ہوئے تو کیا، موت تو مادھولال کی ہے وہ ایک صاحب حیثیت باپ کا بیٹا اور عزت دار خاندان کا عزت دار فرد ہے وہ بدنام ہوا تو کہیں کا بھی نہیں رہے گا۔"

شیخ حسین نے جواب دیا "مینم جی! صاحب حیثیت باپ کا بیٹا اور عزت دار خاندان کا عزت دار فرد اپنی اس شاندار حیثیت کو بس زندگی بھر محفوظ رکھ سکتا ہے مگر مرنے کے بعد دوسرے فانی انسانوں کی طرح فنا ہو جائے گا لیکن میرا عشق مادھولال کو لافانی بنا دے گا، وہ جسم کی موت کے بعد بھی زندہ رہے گا۔

مینم جی نے پوچھا "میاں جی! آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟"

شیخ حسین نے جواب دیا "مادھولال کی دید، اس کا قرب، تاکہ اپنے دل کی آگ اس کے دل میں منتقل کر دوں، اپنا سوز اس میں منتقل کر دوں، میں اس کے سینے میں گدافت اور دل میں گداز پیدا کرنا چاہتا ہوں۔"

مینم جی نے کہا "میاں جی! آپ کی یہ خواہش کبھی بھی پوری نہیں ہوگی۔"

شیخ حسین نے حقارت سے جواب دیا "تو یہ دعویٰ کس طرح کر سکتا ہے"

مادھولال مینم جی کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا، مینم جی نے دل برداشتہ لہجے میں اپنی رائے دے دی "مادھولال جی میاں جی کا دماغ چل گیا ہے اگر تم کہو تو میں سیٹھ جی سے کہہ کے میاں جی کو قتل کرادوں۔"

مادھولال نے خوفزدہ لہجے میں کہا "قتل کرادو گے انہیں؟ آخر یہ کیوں؟"

مینم جی نے جواب دیا " مادھولال جی! وہ بہت ہی سر پھرا آدمی ہے، باتوں سے قابو میں آئے گا۔"

مادھولال نے کہا " میں آپ کے اس خطرناک مشورے کی تائید نہیں کر سکتا۔"

مینم جی بہت بے چین ہو رہے تھے، بولے " تب پھر میں سیٹھ جی کو سارے واقعات بتا دوں گا وہ جیسا مناسب سمجھیں گے کریں گے۔"

مادھولال نے خوشامد کی " ابھی پتا جی کو کچھ بھی نہ بتانا چند دن صبر کر لو، اس کے بعد دیکھا جائے گا۔"

مینم جی کو سخت غصہ چڑھا ہوا تھا، بولے " مادھولال جی! آپ کو جلد یا بدیر آخر وہی کرنا ہو گا جس کا میں نے مشورہ دیا ہے۔"

مادھولال نے جواب دیا " جب مجھے آپ کے مشورے پر عمل کرنا ہو گا تو میں آپ کو اس سے مطلع کر کے آپ کا انتظار کروں گا اور آپ کو دعا دوں گا۔"

مینم جی نے مجبوری سے کہا " مادھولال جی! بدنامی اور رسوائی کے بعد کچھ کیا تو کیا فائدہ ہے؟"

مینم جی بُرا مان کر چلے گئے۔ مادھولال اس عجیب و غریب شخص سے ملنا چاہتا تھا، دوسرے دن وہ پچھلے دروازے سے نکل کر بازار میں چلا گیا، وہاں اس کو اپنے چند دوستوں سے اس موضوع پہ بات کرنا تھی، اس لیے اپنے ایک دوست کے در پہ دستک دی اور جب دوست باہر نکلا تو اسے سارا واقعہ بتا دیا اور پوچھا " دوست! تمہیں بتاؤ کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیئے؟"

دوست بھی چکرا گیا، بولا " یہ کیا کہہ رہے ہو مادھولال! کہیں کوئی پریشان

خواب تو نہیں دیکھا؟"

مادھولال نے جواب دیا "یہ خواب نہیں دوست۔ یہ ایک واقعہ ہے پریشان کن واقعہ۔"

دوست نے مشورہ دیا "اگر یہ واقعہ ہے تو پھر میتھم جی کا مشورہ درست ہے۔ تم ان میاں جی کو کسی بھی طرح قتل کرادو، ورنہ وہ ذلت وہ بدنامی اٹھاؤ گے کہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق بھی نہ رہو گے۔"

مادھولال نے جواب دیا "لیکن میں قتل نہیں کرا سکتا۔"

دوست نے کہا "تب پھر جو جی میں آئے کرو، مجھ سے مشورہ لینے کیوں آئے تھے۔"

مادھولال نے جواب دیا "میں مشورہ لینے نہیں آیا تھا بلکہ یہ بتانے آیا تھا کہ میں جس مصیبت میں پھنس گیا ہوں، تم اس پہ سنجیدگی سے غور کرو اور میاں جی کو دل نشیں پیرائے میں سمجھا بجھا کر راہِ راست پہ لانے کی کوشش کرو۔"

دوست نے کہا "تم کہتے ہو تو میں اس دیوانے کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔"

مادھولال اس دوست سے مل کر دوسرے کے پاس گیا۔ اس نے بھی یہی مشورہ دیا کہ ان میاں جی کو جلد از جلد خاموشی سے پرلوک روانہ کردو، ورنہ یہ مصیبت بن جائیں گے۔"

مادھولال ہر طرف سے مایوس ہو کر گھر واپس ہوا، بازار میں ایک جگہ سامنے سے شیخ حسین کو آتے دیکھا تو جان ہی نکل گئی، آنکھ بچا کے نکل جانا چاہا، مگر شیخ حسین نے اس کا موقع نہیں دیا۔ مادھولال کو روک لیا اور کہا۔

"مادھولال! قبل از مرگ واویلا یہ کیا چکر رکھا ہے تو نے!"

مادھولال کو پسینہ آ گیا۔

شیخ حسین نے کئی راہ چلتوں کو روک لیا اور انہیں مخاطب کر کے سوال کیا۔"دوستو! تم نہ تو میرے دوست ہو نہ مادھولال کے۔ تمہارے لیے ہم دونوں اجنبی ہیں کیا انسانی عدالت میں اسے قتل کیا جا سکتا ہے جس نے قتل کے لائق جرم نہ کیا ہو۔"

لوگوں نے جواب دیا۔"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔"

شیخ حسین نے مادھولال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔"بھائیو! دیکھو تو سہی، مادھولال کا مینم کہتا ہے کہ حسین کو قتل کرا دو، اس کے دوست بھی اس کو یہی مشورہ دیتے ہیں، تم سب مادھولال سے پوچھو کہ میں نے کون سا ایسا جرم کیا ہے جس کی سزا میں میرا قتل جائز ہے۔"

مادھولال کا حال اور زیادہ غیر ہو گیا کیونکہ شیخ حسین نے مادھولال کا وہ راز فاش کر دیا تھا، جس کا علم مینم جی اور دوستوں کے علاوہ کسی کو بھی نہیں تھا۔

مادھولال نے پوچھا۔"میاں جی! اگر میں یہ کہوں کہ مینم جی اور میرے دوستوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تو آپ کیا کہیں گے۔"

شیخ حسین نے جواب دیا۔"مادھولال! میں تیری جھوٹ بولنے کی قوت سلب کر لوں گا۔"

اور مادھولال کو ذرا سی دیر میں یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔ وہ شیخ حسین کو ایک طرف لے گیا اور پوچھا۔"میاں جی! آپ چاہتے کیا ہیں؟"

شیخ حسین نے جواب دیا۔"تیرا قرب، تیرا دیدار، میں تیرے قریب رہنا چاہتا ہوں۔"

مادھولال نے کہا: "آپ نے اس پر بھی غور کیا کہ لوگ کیسی باتیں بنائیں گے۔"

شیخ حسین نے جواب دیا: "مجھے اس کی پرواہ نہیں، باتیں بنانے والے رخصت ہو جائیں گے۔ ان کے ساتھ ان کی باتیں بھی چلی جائیں گی۔"

مادھولال نے کہا: "تب پھر مجھے موقع دیجئے کہ میں اس پر بھی غور کر لوں۔"

شیخ حسین مسکرائے، ایک سرد آہ بھری، بولے: "تجھے اختیار ہے غور کرتا رہ۔"

مادھولال ان سے جدا ہو کر اپنی حویلی میں پہنچا، وہ بہت خوفزدہ تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں منیم جی نے ساری روداد مادھولال کے باپ کے گوش گزار کر دی تھی، باپ نے بیٹے کو پریشان حال، خوفزدہ، جو دیکھا تو پوچھا۔ "بیٹے مادھولال! تو پریشان کیوں ہے؟"

مادھولال نے جواب دیا: "کیا بتاؤں پتا جی۔ بات کچھ ایسی ہے کہ کچھ کہتے سنتے نہیں بنتا۔"

باپ نے کہا: "مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے اور میں کافی غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ....."

مادھولال نے بات کاٹ دی، بولا: "پتا جی! بات وہ نہیں ہے جو عام طور پر سمجھی جا رہی ہے۔ میاں جی کو ان تمام باتوں کا علم ہو جاتا ہے جو ہم تخلیے میں کرتے ہیں، میں حیران ہوں کہ یہ کیا ہے۔"

باپ نے جواب دیا: "یہ سب شعبدہ بازی ہے اس من چلے فقیر کی۔ میرے پاس دولت ہے میں دس ہٹے کٹے نوجوانوں کو اس کام پر لگا دوں گا وہ اسے اغوا کر کے سندھ کے ریگستان میں ایسی جگہ چھوڑ آئیں گے جہاں میلوں نہ تو آبادی ہوگی، نہ کھانا نہ پانی۔ میاں جی تڑپ تڑپ کر وہیں جان دے دیں گے۔"

مادھولال نے پوچھا۔ "مگر میاں جی کو یہ سزا کس جرم کی دی جائے گی؟"

باپ نے مادھولال کو غصہ کی نظروں سے دیکھا۔ "یعنی تو میاں جی کی وکالت کر رہا ہے ان کا جرم پوچھ رہا ہے کیا ان کا یہ جرم اس سزا کے جواز میں کافی نہیں ہے کہ وہ تجھے، ہمیں اور ہمارے نامی گرامی عزت دار خاندان کو ذلیل اور رسوا کرنا چاہتے ہیں۔"

مادھولال نے جواب دیا۔ "مگر پتا جی بات کچھ اور ہے، ہماری اور آپ کی سمجھ سے بالاتر۔ بھگوان جانے ان میاں جی میں کیا کشش ہے کہ میں خود کو ان کی طرف کھنچتا ہوا محسوس کرنے لگا ہوں۔"

باپ کے پاؤں تلے کی زمین سرکنے لگی، انھوں نے بیٹے کو ڈانٹ دیا "اچھا، خبردار جو تو باہر نکلا، میں خود اس موذی فقیر سے بات کروں گا اور کسی نہ کسی طرح اسے یہاں سے دفع کر دوں گا۔"

اس دن تو باپ نے کچھ بھی نہیں کیا، سوائے اس کے کہ مادھولال کو ایک کمرے میں قید کر دیا۔

رات بڑی بے چینی اور کرب میں گزری اور دوسرے دن صبح ہوتے ہی باپ نے حویلی کے مندر میں گھنٹی بجا کر بھولا کے قدموں میں پھول چڑھائے اور ان سے استمداد چاہی کہ وہ ان میاں جی کو کسی طرح دفع کر کے ان کی خاندانی عزت کو بچالیں۔ مندر سے نکلتے وقت پھر گھنٹی بجا کر بھولے کو جاگتے رہنے کا اشارہ کیا اور میاں جی کے پاس چل دیے۔

اس وقت شیخ حسین اپنے چاروں طرف جمع ہو جانے والوں سے مخاطب تھے۔ یہ تماشائی شیخ حسین میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگے تھے۔ آپ ان سے کہہ رہے تھے۔ "لوگو! کیا ایسا ممکن ہے کہ اللہ کے ایک خاص بندے کو

دس نوجوان بدمعاش اغوا کرکے سندھ کے ریگستان میں بھوکا پیاسا مرنے کے لیے چھوڑ آئیں اور اللہ اپنے خاص بندے کی کوئی مدد نہ کرے۔"

کسی نے پوچھا "ایسا آپ کے بارے میں کس نے سوچا ہے؟"

انہوں نے مادھولال کے باپ کی طرف اشارہ کیا "اس نے اور کس نے۔ اور جانتے ہو اس نے دوسری حماقت کیا کی ہے؟"

لوگوں کو آپ کی باتوں میں بڑا مزہ آرہا تھا، ایک نے پوچھا "دوسری کیا حماقت کی ان پنڈت جی نے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "یہ ابھی ابھی بھولے کے مندر میں گیا تھا اور ان سے مدد مانگ رہا تھا، بھلا وہ پتھر اس کی کیا مدد کرے گا جو جامد اور بے جان ہے۔"

مادھولال کا باپ آپ کی باتوں سے سراسیمہ اور خوفزدہ ہو گیا۔ اس نے کہا "میاں جی! مادھولال کی وہ بات تو صحیح ہو گئی کہ آپ ہماری ایک ایک بات سے واقف ہو جاتے ہیں یہ کیا بات ہے۔"

شیخ حسین نے جواب دیا "یہ وہ باتیں ہیں جو تیری سمجھ میں نہیں آسکتیں۔"

پنڈت جی تقریباً بے بس ہو چکے تھے، بولے "میاں جی! میں آپ سے ہار گیا۔ جو دلوں کی باتیں بتائے بغیر ہی جان لیتا ہو، اس سے لڑا نہیں جا سکتا اس سے جھگڑا نہیں کیا جا سکتا۔"

شیخ حسین نے پوچھا "تو کیا چاہتا ہے؟"

پنڈت جی نے جواب دیا "بس یہ کہ میں، میرا بیٹا مادھولال اور میرا نامور خاندان یہ تینوں ذلیل اور رسوا نہ ہوں۔"

شیخ حسین نے کہا "میں وعدہ کرتا ہوں کہ تو جس بات سے خوفزدہ ہے وہ نہیں ہوگی۔"

پنڈت جی نے کہا۔ تب پھر میں مادھولال کو اجازت دے دوں گا کہ وہ آپ سے ملتا رہے آپ کے پاس آتا جاتا رہے۔"

شیخ حسین نے پنڈت جی کا مذاق اڑایا۔" تو نے مادھولال کو کمرے میں مقفل کر دیا ہے تیرا دل صاف نہیں ہے ابھی تو اس وقت مجھ سے جس نرم لب و لہجے میں باتیں کر رہا ہے وہ عارضی اور وقتی ہیں۔ یہاں سے جاتے ہی تو اپنی باتوں سے پھر جائے گا۔"

پنڈت جی نے جواب دیا۔" ایسا نہیں ہو گا میاں جی۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔"

شیخ حسین نے کہا۔" مجھے کوئی خوف نہیں، تو شوق سے مادھولال کو کمروں میں قید کر دے۔ انہیں تالے لگا دے۔ میں مادھولال کو جب بھی چاہوں گا بلا لوں گا۔ تیرے تالے، تیرے قید خانے مادھولال کو روک نہیں سکیں گے۔"

پنڈت جی نے اپنے دل میں سوچا کہ یہ میاں جی کچھ زیادہ ہی باتیں بنانے لگے ہیں، ورنہ مادھولال کو مقفل کر دینے کے بعد باہر کس طرح لایا جا سکتا ہے اور میں بھی دیکھوں گا کہ مادھولال اب کس طرح ان کے پاس آتا ہے۔

شیخ حسین مسکرا رہے تھے، بولے۔" کیا میں نہیں کہتا تھا کہ تیرا دل صاف نہیں ہے۔ تیرے دل میں کھوٹ ہے۔ رہ گئی یہ بات کہ تالوں میں بند مادھولال میرے پاس کس طرح آئے گا تو سامنے دیکھ، یہ کون ہے؟ جس طرح یہ ابھی آیا اسی طرح بعد میں بھی آتا رہے گا۔"

اب جو پنڈت جی نے نظریں اوپر اٹھائیں اور سامنے دیکھا تو مادھولال شیخ حسین کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔

پنڈت جی نے آگے بڑھ کر مادھولال کا راستہ روک لیا، پوچھا۔" بیٹے

تُو تو مقفل تھا، تجھے کس نے آزاد کیا؟ اور یہاں کیوں چلا آیا؟"

مادھولال نے اپنے باپ کو دونوں ہاتھوں سے ہٹا کر ایک طرف کر دیا اور بغیر کچھ کہے شیخ حسین کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

پنڈت جی نے مادھولال کو جھنجھوڑ ڈالا، پوچھا "مادھولال! تو نے میری بات کا جواب کیوں نہیں دیا؟"

مادھولال نے پنڈت جی کے دونوں ہاتھوں کو جھٹک کر ہٹا دیا اور بے تعلقی سے کہا "مجھے تنگ نہ کریں۔"

شیخ حسین نے مادھولال کو حکم دیا "مادھولال! واپس جاؤ، پنڈت جی تمہارے باپ ہیں ان کا احترام کرو۔"

مادھولال کھڑا ہو گیا، جواب دیا "اچھا جی۔ جیسا آپ کا حکم۔" وہ باپ کے قدموں میں جُھک گیا اور پھر جس طرح آیا تھا اسی طرح واپس چلا گیا۔ پنڈت جی کچھ دیر حیرت زدہ کھڑے میاں جی کو دیکھتے رہے۔

پھر کچھ دیر بعد جب وہ اپنی حویلی میں پہنچے اور مادھولال کے مقفل کمرے کو دیکھا تو یہ دیکھ کر سناٹے میں آگئے کہ وہ اسی طرح مقفل تھا اور اور مادھولال اس کے اندر موجود تھا۔ پنڈت جی نے گھر والوں سے پوچھا "ابھی کچھ دیر پہلے مادھولال کو کس نے آزاد کیا تھا؟"

حویلی کے ایک ایک شخص نے قسمیں کھا کھا کر پنڈت جی کو یہ یقین دلایا کہ مادھولال کو جس طرح مقفل کیا گیا تھا اسی طرح مقفل رہے اسے کسی نے بھی آزاد نہیں کیا۔

پنڈت جی نے غصّے میں کہا "یہ کس طرح ممکن ہے، ابھی کچھ دیر پہلے یہ میاں جی کے قدموں میں بیٹھا تھا، پھر انہی کے کہنے پر اس نے میرے

پاؤں چھوٹے اور حویلی میں واپس چلا آیا۔" لیکن گھر والے پنڈت جی کو باؤلا دیوانہ سمجھ رہے تھے۔ خود پنڈت جی بھی اپنے آپ کو پاگل سمجھ رہے تھے۔

* * * * * * *

اب والدین کی مرضی کے خلاف مادھولال شیخ حسین کی خدمت میں حاضریاں دینے لگے۔ پنڈت جی ہار مان چکے تھے مگر دل میں ابال اٹھتا رہتا، اسی دوران گنگا اشنان کا موسم آگیا۔ پنڈت جی نے مادھولال سے کہا "بیٹے! ہم لوگ پریاگ (الہ آباد) جانا چاہتے ہیں۔"

مادھولال نے پوچھا "وہ کیوں پتا جی، خیریت تو ہے؟"

باپ نے جواب دیا۔ زندگی میں پاپ ہی پاپ ہیں، سوچتا ہوں گنگا اشنان کرکے انہیں دھو ڈالوں۔"

مادھولال نے کہا "ضرور جائیں۔"

پنڈت جی نے کہا "میں اکیلا نہیں جاؤں گا تمہیں بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ تمہاری ماں بھی چلے گی۔"

مادھولال نے جواب دیا "پتا جی! میں آپ کے ساتھ چل تو سکتا ہوں مگر اس سلسلے میں مجھے میاں جی سے اجازت لینی ہوگی۔"

پنڈت جی کی تیوریوں پہ بل پڑ گئے، بولے "میاں جی سے اجازت لینا ضروری کیوں ہے؟ انہیں اپنی زندگی میں اتنا مت داخل کرو۔"

مادھولال نے جواب دیا "پتا جی! وہ تو میری زندگی میں داخل ہو چکے یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔"

پنڈت جی سوچ میں پڑ گئے، آخر کچھ دیر بعد کہا "اچھا پھر جاؤ میاں جی کے پاس ان سے اجازت لے لو۔ لیکن انہیں یہ بتا دینا کہ ہم لوگ کئی ماہ کے

لیے پریاگ جائیں گے، متھرا، کاشی، اجودھیا، اور پریاگ کئی تیرتھ یاترا ئیں کرنے کا منصوبہ ہے میرے ذہن میں۔"

مادھولال سیدھے شیخ حسین کے پاس پہنچے اور اپنا مدعا بیان کر دیا۔

شیخ حسین نے پوچھا "کب تک جانے کا ارادہ ہے؟"

مادھولال نے جواب دیا "آپ آج اجازت دے دیں ہم کل روانہ ہو جائیں گے۔"

شیخ حسین نے کہا "تب پھر مادھولال تم ایسا کرو کہ اپنے والدین سے کہہ دو کہ وہ جہاں جانا چاہتے ہیں جائیں۔ تم بعد میں چلے جانا، ہاں یہ ان سے وعدہ کر لو کہ وہ ہر تیرتھ یاترا پہ تمہیں اپنے پاس پائیں گے، کاشی، پریاگ، اجودھیا تم ہر جگہ اشنان کر سکو گے۔ میں تمہیں لے کر خود ہی پہنچ جاؤں گا ان ساری جگہوں پر، تم مت فکر کرنا۔ میں جو وعدہ کر رہا ہوں اسے پورا بھی میں ہی کروں گا۔ بہرحال تم اپنے والدین سے وہاں پہنچنے کا وعدہ کر سکتے ہو۔"

مادھولال یہاں سے چھوٹے اور سیدھے باپ کے پاس پہنچے اور سر جھکا کر جواب دیا "آپ لوگ جب بھی جانا چاہیں چلے جائیں میں بعد میں آ جاؤں گا۔"

باپ نے برا سا منہ بنایا۔ "بعد میں آجاؤں گا، کیا مطلب؟ ہم لوگ جہاں جا رہے ہیں وہ کوئی قریبی شہر تو ہیں نہیں۔"

مادھولال نے جواب دیا "میاں جی نے کہا ہے کہ آپ مجھے وہاں ہر جگہ پائیں گے اور میں تو یہ جانتا ہوں کہ میاں جی نے جو بات کہہ دی وہ پتھر کی لکیر ہے وہ ہو کر رہے گا۔"

باپ کو غصہ تو بہت آیا لیکن خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے، بولے "مادھو لال! تو میرے ساتھ چل۔ میاں جی جو کچھ کہہ رہے ہیں انہیں کہنے دے، وہ تو یہی کچھ کہیں گے! میں ان کی پرواہ کیے بغیر تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور

تمہیں میرے ساتھ ہر حال میں چلنا ہوگا۔"

مادھولال نے جواب دیا۔" پتا جی! میں میاں جی کی اجازت کے بغیر کہیں بھی نہیں جاؤں گا۔"

دونوں باپ بیٹے دیر تک اسی مسئلہ میں الجھے رہے۔ آخر کار مادھولال کی جیت ہوئی اور پنڈت جی ہار گئے۔ جب ان کا ضروری سامان بندھ گیا اور وہ جانے لگے تو مادھولال سے بڑے غمزدہ لہجے میں کہا۔" بیٹے! تم نے وعدہ تو کیا ہے کہ تم میرے پاس پہنچ جاؤ گے لیکن مجھے اس پر یقین نہیں آرہا۔"

مادھولال نے جواب دیا۔" پتا جی! آپ کو یقین آئے یا نہ آئے لیکن مجھے میاں جی کی باتوں پر پورا یقین ہے۔"

پنڈت جی بیٹے کو چھوڑ کر تیرتھ یاترا کو روانہ ہو گئے۔

کئی دن بعد مادھولال نے شیخ حسین سے کہا۔" میاں جی خیال ہے اب ماتا پتا متھرا پہنچ گئے ہوں گے۔"

شیخ حسین نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیر بعد کھول دیں، جواب دیا۔" ابھی نہیں کہیں پرسوں تک پہنچیں گے وہاں۔"

تیسرے دن شیخ حسینؒ نے مادھولال کو اپنے ساتھ لیا اور شہر کے باہر لے گئے۔ ایک جگہ کھڑے ہو کر کہا۔" مادھولال اپنی آنکھیں بند کر کے میری انگلی پکڑ لو۔"

مادھولال نے ایسا ہی کیا، شیخ نے چلنا شروع کر دیا اور کہا۔" بس میرے ساتھ چلتے رہو، میرے پیچھے پیچھے، میرے ساتھ ساتھ۔"

مادھولال نے حکم کی تعمیل کی اور شیخ کے ساتھ ساتھ ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

کچھ دیر بعد شیخ حسین نے حکم دیا۔" اپنی آنکھیں کھول دو۔"

مادھولال نے آنکھیں کھول دیں اور یہ دیکھ کر حیران ہوگیا کہ کرشن جی کی جنم بھومی متھرا ان کے سامنے تھا اور ان کے والدین مادھولال اور شیخ حسین کو حیرت اور خوشی سے دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد دونوں اسی طرح واپس آ گئے اور کئی دن بعد اسی طرح اجودھیا اور پھر کاشی پہنچے۔ کاشی کے بعد پریاگ کا نمبر تھا، پریاگ میں عین اس وقت پہنچے جب ان کے والدین گنگا جمنا کے سنگم پر ڈبکیاں لگا لگا کر اپنے پاپ دھو رہے تھے۔ مادھولال نے بھی غسل کیا اور اسی طرح واپس آ گیا۔ اب پنڈت جی بالکل مایوس ہو چکے تھے اور مادھولال پوری طرح ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

مادھولال نے شیخ حسین سے کہا، ”میاں جی! میں ابھی تک خاموش تھا، لیکن آج میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ سب کیا ہے اور اس میں میرا بھی کوئی حصہ ہے یا نہیں ہے؟“

شیخ حسین نے جواب دیا، ”یہ جو کچھ بھی ہے بتانے کا نہیں ہے، اس میں تیرا حصہ بھی ہے لیکن افسوس کہ اس وقت تک تو اپنا حصہ نہیں حاصل کر سکے گا جب تک کہ تو مسلمان نہیں ہو جائے گا۔“

مادھولال نے جواب دیا، ”میاں جی! میں اس کے لیے تیار ہوں، ابھی اس وقت، دیر کس بات کی!“

شیخ حسین نے مادھولال کو اسی وقت مسلمان کر لیا لیکن نام نہیں بدلا، بس اس میں ”شیخ“ کا اضافہ کیا، پہلے مادھولال تھے تو اب شیخ مادھو ہو گئے۔

چند ماہ بعد ہولی کا تہوار آ گیا۔ شیخ حسین نے کہا، ”امسال میں مادھو کے ساتھ ہولی کھیلوں گا۔“

چنانچہ خوب رنگ اڑے اور پچکاریاں چلیں، اس میں شیخ حسین کے

دوسرے مریدوں نے بھی حصہ لیا۔

اس میں ایک دوسرے پہ جو گلال پھینکا گیا تھا، اس کے اتباع میں آج بھی شیخ حسین کے معتقدین ان کے مزار پر بسنت میں گلال پھینکتے ہیں۔"

پھر محفل سماع منعقد ہوئی اور اس محفل میں مادھولال نے شیخ حسین سے بیعت کر لی۔ اب شیخ حسین کی نظر کیمیا اثر نے مادھولال میں انقلاب بپا کر دیا اور ان کے اندر بھی ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ اب مادھولال پہ بھی وہ دنیا آشکار ہو رہی تھی جس کو کئی بار شیخ حسین کے واسطے سے وہ دیکھ چکے تھے۔ جب وہ باطنی کمالات کا سفر مکمل کر چکے تو شیخ حسین نے انہیں حکم دیا کہ اب تم راجا مان سنگھ کی فوج میں ملازمت کر لو۔

مادھولال نے اپنے شیخ کے حکم کی تعمیل کی اور راجا مان سنگھ کی فوج میں ملازم ہو گئے۔

راجا مان سنگھ شہنشاہ اکبر کی طرف سے دکن کی مہم پر روانہ ہو رہا تھا۔ مادھولال بھی دکن چلے گئے۔ دشمن نے راجا مان سنگھ کو روک دیا اور معرکہ کارزار گرم ہو گیا۔ جب شام تک کوئی فیصلہ نہ ہوا تو دونوں لشکر اپنی اپنی جگہ واپس گئے۔

دوسرے دن پھر جنگ ہوئی مگر شام تک پھر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا اور تیسرے دن کے انتظار میں دونوں فوجیں آرام کرنے چلی گئیں۔

راجا مان سنگھ کو مادھولال اور شیخ حسین کی بزرگی کا علم ہو چکا تھا وہ رات کو مادھولال کے خیمے میں چوروں کی طرح پہنچا۔ اس وقت مادھولال نماز میں مشغول تھے۔ جب انہوں نے سلام پھیرا تو شمع کی کمزور روشنی میں کسی کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ پوچھا "تم کون ہو؟"

راجا مان سنگھ ادب سے کھڑا ہو گیا، بولا "میں ہوں راجا مان سنگھ!"

مادھولال راجا مان سنگھ سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوئے پوچھا "کیا بات ہے؟"

راجا مان سنگھ نے جواب دیا "مجھے آپ کی بزرگی کا علم ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کے پیر نے آپ کو میرے رسالے میں کیوں بھیجا ہے۔"

مادھولال نے کہا "تم اپنا مطلب بیان کرو۔"

راجا مان سنگھ نے کہا "دو دن کی لڑائی میں کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ آج شام میں نے یہ سُنا ہے کہ کل صبح تک دشمن کو مزید کمک پہنچ جائے گی میری فوج کمزور پڑ رہی ہے اب آپ ہی فرمائیں کہ اس جنگ کا انجام کیا ہو گا۔"

مادھولال نے جواب دیا "انجام اچھا ہی ہو گا۔ ویسے میں دُعا کر رہا ہوں۔"

راجا مان سنگھ نے اصرار کیا "مادھولال جی! صرف دعا سے کام نہیں چلے گا، آپ ایسی دُعا فرمائیں جس کی قبولیابی کا ہمیں بھی پتہ چل جائے میں قطعی فتح کا خواہاں ہوں۔"

مادھولال نے جواب دیا "راجا جی! تم اپنے خیمے میں جاؤ کچھ دیر بعد فتح کی بشارت کے ساتھ میں خود حاضری دوں گا۔"

راجا مان سنگھ اپنے خیمے میں واپس چلا گیا۔

مادھولال مصلیٰ پہ گر گئے اور رو رو کر دُعا مانگنے لگے "اے میرے آقا! تو جانتا ہے کہ میں برہمن زادہ ہوں، میں آبائی بُت پرست ہوں، مگر تیرے ایک صاحبِ دل اور نیک بندے نے مجھے تیری پرستش کے لائق بنایا۔ اب میں مسلمان ہوں، ایک خدا، تیری صرف تیری عبادت کرتا ہوں۔ راجا مان سنگھ

ہندو ہونے کے باوجود یہ سمجھتا ہے کہ میں خدا رسیدہ ہو گیا ہوں اور میری بات نہیں ٹالے گا، اپنے حبیبؐ کے صدقے میں میری لاج رکھ لے۔ میں اپنے پیر و مرشد شیخ حسین کا واسطہ دیتا ہوں کہ راجا مان سنگھ کو فتح عطا فرما۔"

مادھو لال کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور دل گداز ہو رہا تھا، پھر انہیں ایک دم قرار آگیا۔ طبیعت ٹھہر گئی، مصلے سے اٹھ کر آنسو کرتے کے دامن سے پونچھے اور مصلے کو تہہ کر کے ایک طرف رکھ دیا۔

پھر خیمے کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میاں جی! اب آ بھی جاؤ راجا مان سنگھ کو میں کیا تسلی دوں گا، تم میرے ساتھ چلو۔ کیونکہ راجا میری بات سے زیادہ تمہاری بات کا اعتبار کرے گا۔"

وہ کچھ دیر انتظار کر کے اٹھے اور خیمہ سے نکلتے ہوئے کہا "بہر حال میں چلتا ہوں لیکن پھر بھی یہی کہوں گا کہ تم آجاؤ اور میرے ساتھ چلو۔"

ابھی مادھو لال زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ کسی نے ان کے کاندھے پر پشت سے ہاتھ رکھ دیا اور پوچھا "مادھو لال! کہاں چلے؟"

یہ ان کے پیر شیخ حسین کی آواز تھی۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ ان کے پیر و مرشد ان کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

شیخ حسین نے کہا "مادھو لال! مجھے معلوم تھا کہ تجھے میری ضرورت پیش آئے گی۔ میں لاہور سے چل دیا اور تیرے پاس آگیا، کیا تو راجا مان سنگھ کے پاس جا رہا ہے؟"

مادھو لال نے جواب دیا۔ "جی پیر مرشد! راجا مان سنگھ مایوس ہو رہا ہے آپ اسے فتح کی بشارت دیں گے تو وہ مطمئن ہو گا ورنہ وہ تھڑ دلا ہو رہا ہے۔"

شیخ حسین نے کہا "تیرے ساتھ میں بھی راجا مان سنگھ کے پاس

چل رہا ہوں۔"

جب یہ دونوں راجا مان سنگھ کے خیمے کے قریب پہنچے تو دیکھا اسے راجا کے محافظ دستے نے چاروں طرف سے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے لیکن ان لوگوں نے ان دونوں کو نہیں روکا اور یہ دونوں راجا مان سنگھ کے خیمے میں داخل ہو گئے اور اندر بیٹھے ہوئے دربان سے کہا۔" راجا سے کہو شیخ حسین اور مادھولال تجھ سے ملنے آئے ہیں۔"

دربان آنکھیں مل مل کر ان دونوں کو دیکھنے لگا، پوچھا۔" آپ دونوں یہاں تک کیسے آ گئے آپ کو کسی نے روکا نہیں ہے؟"

شیخ نے جواب دیا۔" فضول باتیں نہ کر۔ تجھ سے جو کہا گیا ہے وہ کر، ورنہ ہم دونوں خود ہی راجا کے پاس چلے جائیں گے۔"

دربان بدحواس ہو کر راجا مان سنگھ کے پاس پہنچا اور ان دونوں کی آمد کی خبر کی۔ راجا مان سنگھ دربان کے ساتھ ہی ان دونوں کے استقبال کو بڑھا اور پھر انہیں اپنے ساتھ لے کر اندر گیا۔

شیخ حسین نے کہا۔" راجا جی! تم نے مادھولال سے استمداد چاہی تھی میں خود آ گیا، اللہ نے چاہا تو کل کی جنگ میں میں خود بھی شریک ہو جاؤں گا اور پھر دیکھوں گا کہ دشمن کس طرح زیر نہیں ہوتا۔"

راجا مان سنگھ نے خوش ہو کر کہا۔" حضرت جی! میں بھی یہی چاہتا ہوں۔"

شیخ حسین نے ہدایت کی۔" کل کی جنگ میں پہل تجھے کرنی ہوگی۔ دشمن کی پیش قدمی اور حملے کا انتظار کیے بغیر۔ میں آگے آگے رہوں گا اور پھر دیکھوں گا کہ تیری فوج کو کون روکتا ہے۔"

راجا مان سنگھ نے مادھولال کے ہاتھ عقیدت سے پکڑ لیے اور انہیں

بوسہ دیا۔ "مادھولال جی! میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ کل ہماری فتح ہوگی۔"

راجا نے ان دونوں کی خاطر تواضع کرنی چاہی مگر انہوں نے انکار کردیا اور واپس چلے آئے۔

دوسرے دن صبح دونوں طرف کی فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہوگئیں۔ شیخ حسین راجا کی فوج کے آگے کھڑے ہوکر دشمن کی طرف بڑھے ان کے پیچھے راجا کی فوج نے حرکت کی اور پھر جو خوفناک جنگ شروع ہوئی تو ظہر کی نماز تک اس کا فیصلہ ہوگیا۔ راجا مان سنگھ نے دشمن کو شکست فاش دی اور اس کی فوج فاتحانہ دشمن کے قلعہ میں داخل ہوگئی۔

فتح کے بعد راجا مان سنگھ نے ان دونوں کو تلاش کیا تو پتہ چلا، وہ دونوں لاہور چلے گئے۔ راجا کو بہت افسوس ہوا، مگر اس وقت حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے مادھولال کو تنہا اپنے خیمے میں دیکھا۔ شیخ حسین لاہور جا چکے تھے۔

مادھولال راجا مان سنگھ کی فوج میں اپنے فرائض منصبی نہایت دیانتداری سے انجام دیتے رہے۔

سالوں بعد مادھولال کی طبیعت اچانک اداس ہوگئی۔ کسی کام میں دل ہی نہ لگتا تھا، اس بے چینی اور افسردگی کا علم راجا مان سنگھ کو ہوا تو وہ مزاج پرسی کو حاضر ہوا اور پوچھا۔ "اگر آپ وطن جانا چاہتے ہیں تو چلے جائیں میری طرف سے اجازت ہے۔"

مادھولال نے جواب دیا۔ "راجا جی! پیر و مرشد رخصت ہو رہے ہیں اور انہوں نے اپنے مریدوں کو ہدایت کردی ہے کہ جب وہ وفات پا جائیں تو انہیں

شاہدرہ کے قریب ایک باغیچہ میں امانتاً دفن کر دیا جائے۔"

راجا مان سنگھ نے کہا۔" اگر یہ بات ہے تو آپ ابھی وقت اپنے پیر و مرشد کے پاس چلے جائیں۔

مادھولال نے جواب دیا۔" راجاجی! افسوس کہ میں نہیں جا سکتا۔ کیونکہ پیر و مرشد نے کہہ دیا ہے کہ مادھولال میری وفات کے ایک سال بعد آئے گا اور ان کے جسم کو عارضی مدفن سے نکال کر بابو پورہ (باغبانپورہ) میں دفن کرے گا چنانچہ میں پیر و مرشد کی وفات کے ایک سال بعد ہی جا سکتا ہوں۔"

راجا مان سنگھ نے حیرت سے پوچھا۔" جب آپ کو یہ ساری باتیں معلوم ہو چکی ہیں تو آپ فوراً ہی پیر و مرشد کے پاس چلے کیوں نہیں جاتے؟"

مادھولال نے جواب دیا۔" میں نے کہہ تو دیا کہ مجھے جانے کی اجازت نہیں ملی ہے ابھی۔"

راجا مان سنگھ نے خاموشی اختیار کی۔ دوسری طرف شیخ حسین کو انتقال کیے ہوئے ایک سال کا عرصہ بیت گیا تو مادھولال نے راجا سے رخصت لی اور لاہور روانہ ہو گئے۔ وہاں شاہدرہ کے باغیچے والے عارضی مدفن سے آپ کا جسدِ مبارک باہر نکلوایا اور باغبانپورہ میں دفن کر دیا۔ ان دنوں باغبانپورہ بابو پورہ تھا۔ ادھر سے فارغ ہو کر مادھولال پھر فوج میں واپس چلے گئے۔

راجا مان سنگھ نے کہا۔" اگر آپ چاہیں تو واپس چلے جائیں۔ میری طرف سے آپ کو اجازت ہے۔"

مادھولال نے جواب دیا "ابھی مجھے بارہ سال تمہاری ملازمت میں اور رہنا ہے اس کے بعد میں واپس چلا جاؤں گا اور پیر مرشد کے مزار کی مجاوری کروں گا۔"

راجا مان سنگھ نے پوچھا "وہ کیوں؟"

انہوں نے جواب دیا "پیر مرشد نے کشف کے ذریعے مجھے یہی ہدایت دے رکھی ہے۔"

چنانچہ مادھولال بارہ سال تک راجا مان سنگھ کی ملازمت میں رہے اور تیرھویں سال ملازمت چھوڑ کر اپنے پیر و مرشد کے مزار پر آ بیٹھے۔ جب تک جئے ان کی مجاوری کرتے رہے۔ مجاوری کی مدت ۳۵ سال ہے۔

مادھولال ۲۲ ذی الحجہ ۹۸۰ھ میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۰۵۶ھ میں وفات پائی۔

آپ کی تاریخ وفات اس قطعہ سے نکلتی ہے۔

حسین بندہ مادھو شیخ عالم
کہ بودے مست از پیمانۂ عشق
عیاں گردید سال ارتحالش
ز "ہادی ہدیٰ مستانۂ عشق"

۱۰۵۶ھ

شیخ حمید بنگالی

بنگال میں ضلع بردوان کے قصبہ منگل کو یہ شرف حاصل ہوا کہ وہاں شیخ حمید جیسا جامع علوم شخص پیدا ہوا، یہ عہد جہانگیر کا واقعہ ہے۔ دہلی اور لاہور میں پورے ملک سے طالبان علوم سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے پہنچتے اور زندگی کے خاصے ماہ و سال گزار کر اپنے وطن واپس جاتے۔ شیخ حمید بھی ان ہی میں شامل تھے انہوں نے تحصیل علوم کے لیے لاہور کو پسند کیا اور بنگال سے لاہور تک کا سفر اختیار کیا۔ خوب محنت اور لگن سے علوم معقول و منقول حاصل کیے اور اپنے اساتذہ کو خوش کر دیا۔ یہاں استادوں کی صحبت میں برصغیر کے عالموں، صوفیوں اور بادشاہوں اور امیروں کے تذکرے ہوتے رہتے تھے۔ ہر شخص نہایت آزادی اور عالمانہ شان سے کسی نہ کسی کے بارے میں اظہار خیال کرتا اور اپنی تقریر کے زور سے سننے والوں کو مسحور کر لیتا۔ ان استادوں میں وہ بھی تھے جنہیں درباروں اور شاہوں سے نفرت تھی اور وہ بھی جو امرا اور شاہوں کی صحبت کو ضروری خیال کرتے تھے ان میں علماء اور صوفیا سے نفرت کرنیوالے بھی تھے اور ان سے محبت کرنے والے بھی۔

ان صحبتوں اور تقریروں کا شیخ حمید پر یہ اثر ہوا کہ وہ تصوف اور صوفی سے

نفرت کرنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ صوفی ترک دنیا کر کے اچھا نہیں کرتے کیونکہ یہ حضرات دنیا کے کسی کام کے نہیں رہتے اور یہ بھی ایک قسم کی دکانداری ہے ایک قسم کا پیشہ ہے۔

لیکن جو استاد تصوف کے قائل تھے اور صوفیائے کرام کے دل سے قائل تھے وہ منکرین تصوف کو سمجھاتے کہ بھائیو! ایسا نہ کہو۔ تصوف کی دنیا ایک بالکل الگ دنیا ہے اور اس کے بارے میں ہم اس وقت تک اپنی کوئی حتمی اور فیصلہ کن رائے نہیں دے سکتے جب تک کہ خود اس کو اندر سے نہ دیکھیں۔

ان باتوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ شیخ حمید محض عالم اور دنیا دار رہ گئے۔

ایک دن استادوں کی محفل میں حضرت مجدد الف ثانی کا ذکر چھڑا ہوا تھا، اس محفل میں حضرت مجدد الف ثانی کے حامی کم تھے اور مخالف زیادہ۔ کسی عالم نے حضرت مجدد الف ثانی پر سخت تنقید کی اور کہا: "شیخ احمد سرہندی میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ خودسر، خودبین اور خودآرا ضرورت سے زیادہ ہیں، وہ جس مسئلہ کو خود جس طرح دیکھتے اور سمجھتے ہیں اسی کو برحق اور صحیح سمجھتے ہیں کسی اور کو خاطر میں نہیں لاتے اور اگر کوئی ان سے اختلاف رکھے تو وہ اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔"

شیخ سرہندی کے حامی نے ان کی مدافعت کی، اس نے کہا: "یہ بات نہیں ہے، آپ نے شیخ احمد کو سمجھنے میں سخت غلطی کی ہے ان کا اختلاف یا اتفاق فی سبیل اللہ ہے۔ دینی مسائل پر ان کی نظر گہری اور معلومات وسیع ہیں اور ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، ان کے پیچھے ان کے زبردست دلائل اور براہین ہوتے ہیں۔ اگر دوسرا نہیں قائل کر سکے تو وہ قائل ہو جائیں گے کیونکہ وہ ضدی اور ہٹ دھرم نہیں ہیں لیکن مشکل تو یہی ہے کہ ابھی

تک ایک عالم بھی انہیں قائل نہیں کر سکا۔"

مخالف عالم نے ان باتوں سے اتفاق نہیں کیا، کہا "ان کے ہاں شدت ہے، انتہا پسندی ہے، میانہ روی نہیں ہے اور اپنا تو یہ خیال ہے کہ ان کی پیروی کرنا، ان کے ساتھ چلنا بہت مشکل ہے۔"

بحث کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا، لیکن شیخ حمید کے دل و دماغ پر شیخ سرہندی کا ایک بڑا سا خاکہ مرتسم ہو گیا، یہ نام خاصا مشہور تھا، شیخ حمید نے اس نام پر اس سے پہلے زیادہ توجہ نہیں دی تھی، لیکن اب توجہ دینا پڑی۔

جب محفل برخاست ہو گئی اور لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے تو شیخ حمید نے اس عالم کے گھر کا رُخ کیا۔ جس نے شیخ سرہندی کی مخالفت کی۔ یہ عالم ان کا استاد تھا۔ اس نے جب اپنے دروازے پر شیخ حمید کو کھڑے دیکھا تو اسے بڑی حیرت ہوئی اس نے پوچھا "کیا بات ہے شیخ حمید؟ خیریت تو ہے ابھی ابھی تو میں تمہارے پاس سے اٹھ کر آیا ہوں۔"

شیخ حمید نے جواب دیا "جی ہاں! میں اس محفل میں شاگرد ہونے کی حیثیت سے باتیں نہیں کر سکتا تھا مگر اب تخلیہ میں آپ سے شیخ سرہندی کے بارے میں چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

استاد نے حیرت سے سر سے پاؤں تک شاگرد کو دیکھا اور پوچھا "وہ کون سی ایسی بات ہے جسے تم جاننا چاہتے ہو؟"

استاد نے انہیں بٹھایا اور باتیں شروع کر دیں۔

شیخ حمید نے پوچھا "جنابِ والا! آپ نے شیخ احمد سرہندی کی بابت یہ فرمایا تھا کہ وہ انتہا پسند اور ضدی ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟ اور یہ کہ اگر ان سے کبھی ملاقات ہو جائے تو ان سے ملنے میں کیا حرج ہے؟"

استاد نے جواب دیا "وہی بات میں پھر کہوں گا کہ سرہندی شیخ فندی اور انتہا پسند ہیں، اور ہمیشہ یہ کوشش کرنا چاہیئے کہ ان سے ملاقات ہی نہ ہو کیونکہ ملاقات کے بعد یہ احتمال رہتا ہے کہ وہ ملنے والے کو بھی اپنے ہی رنگ میں رنگ لیں"

شیخ حمید نے عرض کیا "اگر یہ درست ہے کہ شیخ سرہندی ملنے والے کو بھی اپنے ہی رنگ میں رنگ لیں تو یہ بڑی عجیب بات ہو گی اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسروں سے بہت زیادہ لائق اور مضبوط آدمی ہیں"

استاد کو غصہ آگیا، غضبناک نظروں سے شاگرد کو گھورا اور جواب دیا "ایسی بات نہیں کرتے، وہ لائق اور مضبوط آدمی کیونکر ہو سکتے ہیں، میں انہیں گمراہ اور بے دین سمجھتا ہوں کہ لوگ ان سے اپنے دین اور ایمان کو بچائیں"

شیخ حمید نے پوچھا "اگر وہ اس حد تک بُرے آدمی ہیں تو ملک بھر کے علماء کرام ان کے خلاف کوئی فتویٰ کیوں نہیں دیتے اور بادشاہ نے انہیں اب تک آزاد کیوں رہنے دیا ہے؟"

استاد نے جواب دیا "تم یہ سوال ملک بھر کے علمائے کرام سے کرو یا پھر بادشاہ سلامت سے، کیونکہ یہ سوال انہی سے متعلق ہے، میں اس کا کیا جواب دوں؟"

شیخ حمید بہت پریشان تھے، استاد کو ان کی بے چینی کا کوئی احساس نہ تھا، یہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور بولے "استاد محترم! میں جو کچھ جاننا چاہتا تھا نہیں جان سکا، اس لیے اب یہاں مزید رکنا فضول ہے اجازت

دیجئے کہ گھر جاؤں۔"

استاد نے اجازت دے دی اور کہا۔"اب تم جا سکتے ہو، میری طرف سے اجازت ہے!"

شیخ حمید اپنی تعلیم پوری کر چکے تھے اس لیے اب لاہور میں مزید رکنا فضول تھا، انہوں نے اپنا جملہ اساتذہ سے وطن واپسی کی اجازت لی اور لاہور کے دوست احباب سے مل کر رختِ سفر باندھا۔

واپس جاتے ہوئے وہ آگرے میں اپنے ایک پرانے دوست مفتی مولانا عبدالرحمٰن کے پاس ٹھہر گئے، یہ بادشاہ کی فوج میں مفتی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ شیخ حمید انہیں اس وقت سے جانتے تھے جب وہ خود بھی لاہور میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ لیکن مولانا عبدالرحمٰن تعلیم مکمل کر کے واپس جا رہے تھے اور شیخ حمید کو تعلیم حاصل کرتے ہوئے ابھی چند سال ہی گزرے تھے ان چند سالوں میں دونوں بہت بے تکلف دوست بن گئے۔

مولانا عبدالرحمٰن نے انہیں اپنے سامنے جو دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور ان کے لیے اپنے گھر کا ایک کشادہ کمرہ خالی کر دیا۔

شیخ حمید نے کہا۔" مولانا! اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے آگرے میں آپ سے ملاقات کر لی، بس میرے لیے یہی بہت کافی ہے۔"

مولانا نے ہنستے ہوئے پُرخلوص لہجے میں جواب دیا۔" شیخ صاحب! آپ آگرے میں اس خاکسار کے مہمان ہوں اور میں آپ کو فوراً ہی چلا جانے دوں، یہ تو قیامت تک نہیں ہو سکتا۔"

شیخ حمید نے کہا۔"میں اپنے گھر والوں کو اپنی واپسی کی اطلاع دے چکا ہوں، وہاں میرا بڑی بے چینی سے انتظار ہو رہا ہو گا بس اس لیے میں

کہیں رکے بغیر اپنا سفر جاری رکھنا چاہتا ہوں۔"

مولانا پھر بھی قائل نہیں ہوئے، بولے "جناب آپ کی ساری دلیلیں اپنی جگہ، مگر میں ان کا قائل یا بے بس نہیں ہو سکتا۔ میں جب تک شرفِ مہمان نوازی حاصل نہیں کر لوں گا نہیں مانوں گا۔"

شیخ حمید مجبور ہو گئے اور انہیں مجبوراً مولانا کے گھر میں قیام کرنا پڑا۔ رات کو کھانے کے بعد شیخ حمید نے پوچھا "مولانا! اس شہر میں شیخ احمد سرہندی بھی تو کہیں رہتے ہیں؟"

مولانا کے اس سوال پہ کان کھڑے ہو گئے، پوچھا "ہاں وہ اسی شہر میں رہتے تو ہیں، آپ کا ان سے کوئی کام ہے؟"

انہوں نے جواب دیا "میرا ان سے کام تو کوئی بھی نہیں۔ لیکن مجھے ان کی بابت جو کچھ معلوم ہوا ہے اس سے میں حیران ہوں کہ آخر اس ضدی، سرکش، انتہاپسند، خودسر، خودبین و خودآرا شخص کو اتنی آزادی کیوں ملی ہوئی ہے۔ علمائے کرام اور بادشاہ نے اسے اب تک آزاد کیوں چھوڑا ہوا ہے؟"

مولانا شیخ سرہندی کے عقیدت مندوں میں تھے، انہیں شیخ حمید کا طرزِ تخاطب بہت ناگوار اور گراں گزرا، انہوں نے کہا "شیخ صاحب! آپ حضرت مجدد الف ثانی کی بابت یہ کس قسم کے ناپسندیدہ خیالات کا اظہار فرماتے ہیں۔"

انہوں نے جواب دیا "میں نے ان کی بابت جو کچھ کہا ہے وہ میری اپنی رائے ہے۔ اٹل اور مضبوط رائے۔"

مولانا نے کہا "افسوس کہ آپ ابھی تک ان سے ملے نہیں ہیں۔ میں

ان سے ایک ملاقات کا وقت رکھتا ہوں، آپ ان سے مل لیں اور ان سے باتیں کرلیں، اس کے بعد کوئی رائے قائم کریں۔"

شیخ حمید نے منہ بنا کر بے زاری سے جواب دیا "میں ان سے ملنا ہی نہیں چاہتا، اور میں نے ان کی بابت جو رائے قائم کرلی ہے اس میں کوئی تبدیلی بھی نہیں کرنا چاہتا۔"

مولانا نے کہا "شیخ صاحب! یہ ہے بڑی زیادتی کی بات کہ آپ اب تک جس شخص سے ملے بھی نہیں ، اس کے بارے میں اتنی ناقص اور قابلِ اعتراض رائے رکھتے ہیں آپ ان سے مل لیں اس کے بعد کوئی رائے قائم کریں۔ تب میں آپ کا قائل ہو جاؤں گا۔ یوں میں آپ سے کبھی بھی اتفاق نہیں کروں گا۔"

شیخ حمید نے کہا "تو اس کا یہ مطلب ہوا مولانا کہ آپ بذاتِ خود ان کے بے حد مدّاح ہیں۔"

مولانا نے جواب دیا "ہاں میں ان کا بے حد مدّاح بھی ہوں اور عقیدت مند بھی۔"

شیخ حمید نے پوچھا "آخر ان میں وہ کون سی خوبی ہے جس نے آپ کو ان کا مدّاح اور عقیدتمند بنا رکھا ہے۔"

مولانا نے جواب دیا "اب میں آپ کے اس سوال کا کیا جواب دوں، وہ شخصیت ہی ایسی ہے کہ ان سے جو بھی ایک بار مل لیتا ہے ان کا دل وجان سے عقیدت مند اور مداح ہو جاتا ہے۔"

شیخ حمید نے خاموشی اختیار کی کیونکہ انہیں اس کا اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر یہ گفتگو کچھ دیر اور اسی طرح جاری رہی تو ان کے باہمی تعلقات متاثر ہو

جائیں گے۔ آخر شیخ حمید ہی نے انہیں یہ رائے دی "مولانا! چونکہ ہم دونوں سرہندی شیخ کے بارے میں یکساں رائے نہیں رکھتے اس لیے ہم آئندہ ان کے بارے میں کوئی بات بھی نہیں کریں گے، کیونکہ میں محسوس کر رہا ہوں کہ اگر ہم دونوں اس موضوع پر یوں ہی الجھتے رہے تو ایک نہ ایک دن آپس میں بے حد تلخی پیدا ہو جائے گی اور میں آپ کی دوستی کو کسی بھی قیمت پر گنوانا نہیں چاہتا۔"

مولانا خاموش ہو گئے کیونکہ انہیں یہ بات بالکل پسند نہیں تھی کہ شیخ حمید، شیخ سرہندی کے بارے میں سوئے ظنی اختیار کریں۔ انہوں نے پھر وہی بات کہی "شیخ صاحب اس سلسلے میں میں آپ سے بالکل اتفاق نہیں کروں گا۔ میرے دل میں ایک کانٹے کی نوک سی ٹوٹ چکی ہے اور میں ہمیشہ یہ سوچ سوچ کر کرب میں مبتلا رہوں گا کہ میں آپ کو حضرت مجدد الف ثانی کی عظمتوں کا قائل نہیں کر سکا۔"

شیخ حمید نے کہا "اب آپ براہِ کرم اس ذکر کو ختم ہی کر دیں تو اچھا ہے مجھے بھی اس سے تکلیف پہنچ رہی ہے۔"

مولانا نے پوچھا "اچھا اب آپ یہ بتائیں مجھے کہ آپ کو سرہندی شیخ سے اختلاف کیا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا "مولانا! میں نے سرہندی شیخ کو پڑھا ہے اور اس سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ بہت زیادہ خود سر، خود بین اور خود آرا ہیں دوسرے یہ کہ مجھے یاد آیا۔ سرہندی شیخ وحدت الوجود کے قائل ہیں جبکہ میں خود اس کا قائل نہیں ہوں۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو بھی اس عقیدے کا حامل ہے، وہ گمراہ ہے۔"

مولانا نے جواب دیا "حضرت شیخ سرہندی موحد ہیں اور موحد کے لیے ضروری ہے کہ وہ مشرب وحدۃ الوجود رکھتا ہو۔"

شیخ حمید نے کہا "بس اب ختم کیجئے یہ گفتگو۔ خواہ مخواہ تلخیاں بڑھانے سے فائدہ ؟"

بات ختم ہو گئی۔

کئی دن بعد مولانا کو معلوم ہوا کہ حضرت مجدد الف ثانی آگرے سے باہر جا رہے ہیں اور اس سفر سے پہلے وہ چند دن اپنے ایک عقیدت مند کے گھر میں گذارنا چاہتے ہیں اور یہ شخص مولانا کے پڑوس میں رہتا تھا، مولانا نے دل میں سوچا کہ یہ تو بہت ہی اچھا ہوا۔ اس طرح شیخ حمید کو حضرت کا قرب حاصل ہو جائے گا اور اس قرب سے بہت ممکن ہے کہ ان کے دوست شیخ حمید کی اصلاح ہو جائے۔

انہوں نے اس کا ذکر اپنے دوست شیخ حمید سے کر دیا، کہا "دوست! میں آپ کو ایک خوش خبری سنانا چاہتا ہوں۔"

شیخ حمید نے پوچھا "کس قسم کی خوشخبری۔ سنائیے میں ضرور سنوں گا۔"

مولانا نے کہا "آپ جس سے چڑتے ہیں، وہ عنقریب ہمارے پڑوس میں آجائیں گے۔ وہ چند یوم اپنے اس عقیدت مند کے پاس گزارنا چاہتے ہیں، چنانچہ جب وہ ہمارے آپ کے پڑوس میں آجائیں گے تو میں آپ کو ان سے ملوادوں گا۔ اس وقت آپ کو خود ہی اس کا اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کتنے محترم اور عظیم انسان ہیں۔"

شیخ حمید نے منہ بنا کر جواب دیا "جناب والا! میں آپ سے کہہ چکا

ہوں کہ میں ان کی عظمتوں کا قائل نہیں ہونا چاہتا۔ اور آپ آئندہ ان سے ملانے کی مجھ سے بات بھی نہ کیجئے گا۔"

مولانا خاموش ہو گئے۔

دوسرے ہی دن شیخ حمید نے مولانا سے پوچھا۔" مولانا وہ کب تک آپ کے پڑوس میں آجائیں گے؟"

مولانا نے جواب دیا۔" کل سے پرسوں تک۔"

شیخ حمید نے اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا اور مولانا سے کہا۔

"مولانا! افسوس کہ میں اس دوران کسی دوسرے محلے میں چلا جاؤں گا کیونکہ میں سرہندی شیخ کے پڑوس میں بھی نہیں رہنا چاہتا۔"

مولانا نے تلخ لہجے میں کہا۔" آپ کی مرضی۔ اب میں آپ کو روکوں گا بھی نہیں۔"

شیخ حمید اپنا سامان سمیٹ کر چلے گئے، دوپہر کے بعد واپس آئے اور کہا۔" مولانا! آپ کے پاس اندر میری کتابیں پڑی ہوئی ہیں انہیں لا دیجئے تاکہ میں آج ہی اس گھر سے چلا جاؤں۔"

مولانا اسی وقت اندر گئے اور کتابیں لا کر ان کے حوالے کر دیں، پوچھا۔" آخر آپ کو یہ کیا سوجھی ہے؟ آپ یہاں سے کیوں جانا چاہتے ہیں؟"

شیخ حمید نے جواب دیا۔" میں نے بتا تو دیا آپ کو کہ میں سرہندی شیخ سے دُور دُور رہنا چاہتا ہوں، وہ پڑوس میں آئیں گے تو یہ بھی بُرا ہو گا کہ میں ان سے ملاقات ہی نہ کروں، اور اگر ان سے ملنے جاؤں گا تو یہ اور زیادہ بُری بات ہو گی، اس لیے میری بہتری اسی میں ہے کہ میں ان سے ملوں ہی نہیں، اور دوسرے محلے میں چلا جاؤں۔"

مولانا کو ان کی یہ باتیں بہت ہی گراں گزریں۔ انہوں نے کہا "حضرت ایک بزرگ اور عالم مرد صالح ہیں، ان سے اتنی زیادہ ناخوشی مناسب نہیں ہے۔"

شیخ حمید نے جواب دیا "میں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں۔"

مولانا نے کہا "جیسی آپ کی مرضی۔ میں بھی آپ کو مجبور نہیں کروں گا کہ آپ میرے ہی مکان میں رہیں۔"

شیخ حمید نے اپنا سامان اٹھایا اور اسی وقت دوسرے محلے میں منتقل ہو گئے۔

تیسرے دن شیخ حمید نے اپنی کتابوں اور رسائل کا جائزہ جو لیا تو معلوم ہوا، ایک کتاب مولانا کے پاس ہی رہ گئی۔ یہ اپنی کتاب لینے مولانا کے گھر چلے گئے۔ مولانا نے انہیں دیکھتے ہی خوشی کا اظہار کیا، بولے "شیخ صاحب! خوش آمدید، کہیے، کیسے آنا ہوا؟ میرے لائق کوئی خدمت؟"

شیخ حمید نے جواب دیا "مولانا! ایک کتاب اب بھی آپ کے پاس موجود ہے میری، براہ کرم اسے عنایت فرمادیں۔"

مولانا نے کتاب کا نام پوچھا، انہوں نے نام بتایا، مولانا نے اندر جاتے ہوئے کہا "حضرت! آپ کچھ دیر میرا انتظار فرمائیں، میں ابھی لاتا ہوں وہ کتاب تلاش کر کے، غالباً کہیں اِدھر اُدھر ہو گئی ہے۔"

مولانا اندر چلے گئے۔

اس دوران کوئی اور صاحب آ گئے۔ شیخ حمید نے ان سے پوچھا۔ "حضرت! کیا آپ یہیں کہیں رہتے ہیں؟"

ان صاحب نے جواب دیا۔ "ہاں میں سامنے والی قطار میں رہتا ہوں۔"

آپ کا مجھ سے کوئی کام ہے؟ فرمائیں انشاء اللہ ہو جائے گا۔"

آپ نے کہا "میرا کام کوئی نہیں، بلکہ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ سرہندی شیخ جو پڑوس میں آنا چاہتے تھے وہ آئے یا نہیں؟ کچھ پتہ ہے آپ کو؟"

اس نے جواب دیا "وہ آچکے ہیں۔ کیا آپ ان سے ملنا چاہتے ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا "نہیں، میں ان سے ملنا نہیں چاہتا، بس میں اتنا ہی جاننا چاہتا تھا کہ وہ آئے یا نہیں؟"

اتنے میں مولانا بھی اندر سے کتاب لے کر آ گئے، اور کہا "حضرت! مجھے افسوس ہے کہ آپ کی یہ کتاب یہیں رہ گئی تھی۔"

شیخ حمید نے کتاب لے لی اور کہا "اس میں افسوس کی کیا بات ہے اکثر ایسی غلطی ہو جاتی ہے۔"

مولانا ان سے بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ بولے "حضرت! آپ کا یہاں سے چلے جانا مجھے بے حد گراں گزر رہا ہے لیکن میں آپ کو یہاں قیام پر مجبور نہیں کر سکتا تھا، یہ افسوس زندگی بھر رہے گا کہ میں آپ کو شیخ سرہندی کی عظمت اور بزرگی کا قائل نہیں کر سکا۔"

شیخ حمید نے جواب دیا "اس میں افسوس کی کیا بات ہے۔ یہی بات میں اپنے لیے بھی کہہ سکتا ہوں کہ افسوس میں آپ کو شیخ سرہندی کے خلاف اپنا ہم خیال نہیں بنا سکا۔"

اس کے بعد شیخ حمید واپسی کے ارادے سے کھڑے ہو گئے، بولے۔ "اچھا اب میں چلا۔"

مولانا نے جواب دیا۔" ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ کچھ کھا پی کر جایئے گا۔"

انہوں نے کہا۔" نہیں، اب میں نہیں ٹھہروں گا، پھر کبھی دیکھا جائے گا۔"

اسی وقت حضرت مجدد الف ثانی کی آواز سنائی دی۔" کیا ہم اندر آسکتے ہیں؟"

مولانا کو اس آواز نے از خود رفتہ کر دیا۔ وہ شیخ کے استقبال کو دیوانہ وار آگے بڑھے اور نیاز مندانہ عرض کیا۔" حضور! کیا آپ کو بھی اندر آنے کی اجازت لینی پڑے گی؟"

حضرت مجدد الف ثانی اندر داخل ہوئے۔ اس وقت مولانا کا حال ہی کچھ عجیب تھا، انہیں اپنا ہوش تک نہیں تھا۔ پروانہ وار شیخ سرہندی کے چاروں طرف گھوم پھر رہے تھے۔

حضرت مجدد الف ثانی نے شیخ حمید کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور مولانا سے کہا۔" مولانا! میں اس وقت آپ کے پاس ایک مسئلہ لے کر آیا ہوں، آپ جو کچھ فرمائیں گے وہ میرے لیے سند ہوگا۔"

مولانا نے عاجزی وانکساری سے عرض کیا۔" یہ آپ کیا فرما رہے ہیں کیا آپ کی علمیت اور دقیقہ سنجی کا کوئی اور مقابلہ کر سکتا ہے؟"

حضرت مجدد سرہندی نے جواب دیا۔" یہ بات نہیں ہے مولانا۔ آپ مفتی ہیں، آپ جو کچھ کہیں گے وہ سند ہوگا اور لوگوں کو اس کے ماننے میں کسی قسم کا تامل نہیں ہوگا۔"

مولانا بچھے جا رہے تھے قربان ہوئے جا رہے تھے، بولے۔" حضرت!

آپ تشریف لائے ہیں تو میں آپ کے لیے کھانے کا انتظام کرتا ہوں، میں آپ کو کھائے پیے بغیر نہیں جانے دوں گا۔"

حضرت مجدد نے کہا: "نہیں اس تکلّف کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں ایک مسئلہ لے کر آیا تھا اس کا جواب پاتے ہی واپس چلا جاؤں گا۔ بس، زندگی رہی تو پھر کبھی کھا پی لیں گے۔"

اس کے بعد حضرت مجدد اچانک شیخ حمید کی طرف گھوم گئے اور حیرت سے کہا: "ہائیں شیخ حمید ایں جا بودہ اند (ہائیں شیخ حمید یہاں موجود ہیں!")

شیخ حمید نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا۔ دونوں کی ایک دوسرے سے نظریں ملیں اور شیخ حمید کا حال غیر ہو گیا۔

حضرت مجدد نے مولانا کے سامنے ایک مشہور مسئلہ پیش کیا، مولانا نے اس کا جواب دیا۔ لیکن مولانا کو اس بات پر حیرت تھی کہ یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ اور اہم تو نہیں تھا، جس کے لیے حضرت مجدد ان کے پاس چل کر آئے تھے۔

حضرت مجدد بکمال بے نیازی سے اٹھے اور واپس جانے لگے۔

مولانا کو اچانک شیخ حمید کا خیال آگیا ان کا خیال تھا کہ شیخ حمید اپنی جگہ پر ادب اور بزرگی کا خیال کیے بغیر بیٹھے ہوں گے لیکن یہاں توجہ منظر دیکھنے میں آیا وہ عجیب و غریب اور چونکا دینے والا تھا، شیخ حمید حضرت مجدد کے روبرو مؤدّب سر جھکائے کھڑے تھے، انہیں کسی بات کا ہوش ہی نہ تھا۔

حضرت مجدّد باہر نکل گئے، شیخ حمید کسی معمول کی طرح ان کے پیچھے پیچھے چلے، لیکن شیخ سرہندی نے ان پر کوئی توجّہ نہیں دی، مولانا کو

اس حیرت انگیز منظر نے دم بخود اور متحیّر کر رکھا تھا، ان کے پیچھے پیچھے مولانا بھی چل پڑے۔

حضرت مجدد جہاں ٹھہرے ہوئے تھے وہاں داخل ہو گئے اور شیخ حمید دروازے ہی پر کھڑے رہ گئے۔ مولانا نے ان کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا وہ بھیگی ہوئی تھیں یہاں تک کہ ان کے دونوں گال بھیگ گئے تھے۔

کچھ دیر بعد اندر سے ایک آدمی آیا اور اس نے پوچھا "آپ دونوں میں شیخ حمید کس کا نام ہے؟"

مولانا نے شیخ حمید کی طرف اشارہ کیا "ان کا۔ کیوں؟ کیا کام ہے ان سے؟"

اس آدمی نے جواب دیا "حضرت شیخ سرہندی انہیں اندر بلا رہے ہیں۔"

مولانا نے شیخ حمید کو شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا، کہا "حضرت آپ کہاں ہیں، جائیے، خوش نصیبی آپ کو اندر بلا رہی ہے آپ یہاں کھڑے کیا سوچ رہے ہیں؟"

لیکن شیخ حمید اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھے کوئی جواب نہیں دیا اور بدستور آنسو بہاتے رہے۔

مولانا نے اس آدمی سے کہا "یہ اپنے حواسوں میں نہیں ہیں، انہیں اندر لے جا اور حضرت شیخ کی خدمت میں پیش کر دے۔ اس کے علاوہ دوسرا کوئی طریقہ نہیں۔"

اس شخص نے شیخ حمید کو شانے سے پکڑ لیا اور انہیں اندر لے گیا، مولانا خود بھی اندر چلے گئے۔

شیخ سرہندی نے شیخ حمید سے پوچھا "ہم نے سُنا ہے تو نے بہت زیادہ پڑھ لیا ہے اور اس وافر علم نے تجھ میں چناں چنیں پیدا کردی ہے۔"

شیخ حمید کی قوت گویائی سلب کی جاچکی تھی، ان سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ چنانچہ وہ خاموش رہے۔

شیخ سرہندی نے پوچھا "شیخ حمید! تم سوچ کیا رہے ہو؟"

شیخ حمید کو ایک جھٹکا سا لگا اور انہیں ان کی قوت گویائی واپس مل گئی وہ جواب دینے کے بجائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

شیخ سرہندی نے انہیں اپنے سامنے بٹھالیا اور کہا "کیا بات ہے شیخ حمید! یہ تم رو کیوں رہے ہو؟"

شیخ حمید کی ہچکیاں بندھ چکی تھیں، انہوں نے بمشکل جواب دیا "حضرت! میں انتہائی گستاخ اور سرکش انسان ہوں۔ میں نے آپ کو کتنا غلط سمجھا تھا، اس وقت میں پھُنکا جا رہا ہوں۔ میرے پورے جسم اور دل و دماغ انگارے کی طرح دہک رہے ہیں، میں اُبلا جا رہا ہوں، براہ کرم ادھر توجہ فرمائیں ورنہ میں کہیں کا بھی نہیں رہ جاؤں گا۔"

سرہندی شیخ نے انہیں اپنے پاس بُلایا۔ "شیخ حمید! دور کیوں کھڑے ہو، میرے پاس آجاؤ، میرے قریب۔"

شیخ حمید تعمیل حکم میں جیسے ہی ان کے قریب گئے ان کی انتشاری کیفیت دور ہو گئی، انہیں سکون آگیا۔

سرہندی شیخ نے انہیں سمجھانا شروع کر دیا۔ "شیخ حمید! تصوف ایک سایہ دار درخت کے مثل ہے۔ زمانے کی کڑی دھوپ یہاں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی اور جس چیز کی بابت تمہیں کچھ معلوم ہی نہ ہو اس کے بارے

میں اظہارِ خیال کیا معنی رکھتا ہے۔ مجھے تمہاری بابت معلوم ہو چکا تھا مجھے تم پر ذرا بھی غصہ نہیں آیا۔"

شیخ حمید پر غشی سی طاری ہو چکی تھی، وہ جہاں پر کھڑے تھے، بیٹھ گئے اور پھر بیٹھے ہی بیٹھے وہ زمین پر دراز ہو گئے، ان کی ایک ہفتہ تک یہی کیفیت رہی کہ وہ نہ تو کسی سے بولتے تھے، نہ بات کرتے تھے نہ ہنستے تھے نہ روتے تھے۔ انہیں اپنی کتابوں تک کا ہوش نہ تھا۔

ایک ہفتہ بعد شیخ مجدد سرہندی نے کہا۔" اب میں سرہند جا رہا ہوں تمہارے کیا ارادے ہیں؟"

شیخ حمید نے جواب دیا" میں آپ کے ساتھ سرہند چلوں گا۔"

حضرت مجددؒ نے کہا۔" تمہارے گھر تمہارا انتظار ہو رہا ہو گا۔"

شیخ حمید نے جواب دیا۔" لیکن میں آپ کے ساتھ سرہند چلوں گا۔"

حضرت مجدد نے کہا۔" اور تمہاری کتابیں اور رسائل انہیں تو لے لو۔"

شیخ حمید نے جواب دیا۔" اب وہ میرے لیے بیکار ہیں میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔"

حضرت مجدد الف ثانی سرہند روانہ ہو گئے ان کے ساتھ یہ بھی چل پڑے۔ ان کے چلنے میں دیوانگی پائی جاتی تھی۔

ان کے جانے کے کئی دن بعد مولانا عبدالرحمٰن مفتی لشکرِ سلطان نے بھی سرہند کا رُخ کیا اور وہاں پہنچ کر انہوں نے حضرت مجددؒ سے درخواست کی کہ انہیں مرید بنا لیا جائے۔

حضرت مجدد نے پوچھا۔" تم اگر مرید ہی ہونا چاہتے تھے تو جب میں آگرے میں تھا، اسی وقت ہو جاتے۔"

مولانا نے جواب دیا "اسے میں اپنی بدنصیبی سمجھتا ہوں، میں جو آپ کا مدت دراز سے عقیدت مند اور پرستار چلا آرہا ہوں اب آج مرید ہونے جا رہا ہوں، حالانکہ یہ کام بہت پہلے بھی ہو سکتا تھا، اور ایک یہ شیخ حمید ہیں کہ انہیں آپ کے نام تک سے چڑھ تھی لیکن آج انہیں آپ کا تقرب حاصل ہو گیا ہے۔"

حضرت مجدد نے جواب دیا "یہاں جو کچھ ہوتا ہے توفیق ایزدی سے ہوتا ہے۔"

مولانا نے شیخ حمید کو مخاطب کیا "کیا حال ہے بھائی شیخ حمید؟"

شیخ حمید نے جواب دیا "میں حیران ہوں کہ میں سرہندی شیخ سے فوراً ملا کیوں نہیں تھا۔"

جب مولانا یہاں سے مل ملا کر باہر نکلے تو راستے میں ان کی ملاقات ایک نہایت مشہور عالم سے ہو گئی، اس عالم نے پوچھا "مولانا! آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟"

مولانا نے جواب دیا "حضرت شیخ احمد سرہندی کے پاس سے۔"

عالم نے حیرت سے پوچھا "خیریت تو ہے، اس صوفی کے پاس کیا لینے گئے تھے؟"

مولانا نے جواب دیا "ان کا مرید ہونے۔"

عالم نے ہنس کر ان کا مذاق اڑایا "وہ صوفی۔ حضرت مولانا! آپ تو گروہ علماء اور عقلا سے تعلق رکھتے ہیں آپ نے اس پُر جوش صندی میں وہ کون سی کرامت دیکھ لی کہ مرید ہو گئے۔"

مولانا نے جواب دیا "ان میں سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ وہ

عالم با عمل ہیں متبع سنت ہیں اور ان کی ان دونوں خوبیوں میں ان کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے۔"

اس کے بعد مولانا نے اس عالم کو شیخ حمید کا واقعہ سنایا اور کہا۔ "وہ بھی آپ ہی کی طرح شیخ سرہندی کا مذاق اڑایا کرتے تھے مگر اب ان کا یہ حال ہے کہ وہ سب کچھ بھول چکے ہیں اور انہیں صرف یہ یاد ہے کہ حضرت شیخ کی صحبت اس دنیا کی قیمتی ترین چیز ہے۔"

عالم نے کہا۔ "میں شیخ حمید سے ملنا چاہتا ہوں اور ان سے پوچھوں گا کہ انہوں نے اس درویش میں آخر کیا دیکھ لیا جو اپنا سب کچھ بھول گئے۔"

جب یہ عالم شیخ حمید سے ملا تو اسے دیکھ کر اور زیادہ تعجب ہوا کہ اتنا بڑا عالم شیخ سرہندی کے آستانے کا دربان بن کر رہ گیا ہے۔"

شیخ حمید نے اس عالم کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "اندرونی باطن روشنی کے بغیر علم بے کار ہے، حضرت عالم مشہیر کو چاہیئے کہ پہلے وہ اپنے فضول عقائد اور تکبر سے پیچھا چھڑا لیں پھر کچھ سوچیں گے۔"

عالم حیرت سے مولانا کی شکل دیکھنے لگا۔ مولانا نے کہا۔ "یہ حال تو حضرت مجدد سرہندی کے مریدوں کا ہے۔"

لیکن عالم پر ان باتوں کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

شیخ حمید دو سال تک حضرت مجدد الف ثانی کی صحبت میں رہے اور منازل سلوک طے کرتے رہے۔ اب ان میں وہ کمالات پیدا ہو چکے تھے جن کی سالہا سال ریاضت کرنے والے تمنا کیا کرتے تھے۔

حضرت مجدد نے انہیں اجازت دے دی۔ "شیخ حمید! اب تم اپنے

وطن جا سکتے ہو۔" اس کے بعد آپ نے ایک خرقہ دیا اور کہا " یہ میری خلافت کا خرقہ ہے۔"

شیخ حمید نے درخواست کی "حضرت! مجھے خرقہ نہیں آپ کی کفش مبارک درکار ہے۔"

حضرت مجدد نے انہیں اپنی کفش مبارک عنایت کر دی۔

آپ نے اسے اپنے دانتوں سے اٹھایا اور الٹے قدموں واپس ہوئے۔ بعد میں اسے دستار میں لپیٹ کر سر پہ رکھ لیا اور اپنے وطن واپس چلے گئے۔

وطن والوں نے شیخ حمید کو عالم باعمل جیسے صوفی کو اپنے قصبہ میں دیکھا تو بہت متاثر ہوئے۔ آپ نے دین کی تطہیر اور تبلیغ میں شب و روز گزارنے شروع کر دیے دور دور سے لوگ آپ کے پاس آتے اور فیض حاصل کرتے۔

۱۰۵۰ھ میں آپ نے وصال فرمایا اور اس شان سے کہ آپ کا آستانہ مرجع خاص و عام بن گیا۔ لاہور کا وہ بنگالی طالب علم جو محض عالم بننے گیا تھا، وہاں سے واپس ہوا تو اتفاقاً اسے وہ دولت حاصل ہو گئی جو ان کی شہرت دوام کا باعث بن گئی۔ ان کے ساتھ کتنے ہی طلباء نے علوم حاصل کیے ہوں گے لیکن ہم ان میں سے ایک کو بھی نہیں جانتے لیکن شیخ حمید سے ہم سب واقف ہیں، یہ اس دانے کی طرح زندہ ہیں جو چکی کی کیلی سے لگ کر بچ جاتا ہے نہ

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

خواجہ محمد صادق

حضرت مجدد الف ثانی کے ہاں ۱۰۰۰ھ میں پہلی اولاد نرینہ کی ولادت ہوئی آپ نے اس کے کان میں اذان دی اور خدا سے دُعا مانگی کہ خدایا میرے بیٹے کو حال وقال کا حامل بنا اور وہ صالحین میں سے ہو۔

آپ نے اس بچے کا نام محمد صادق رکھا۔ یعنی سچا، راست گو، حق پرست، بچے کی تربیت خود ہی فرمانے لگے۔

جب بچہ چلنے پھرنے کے لائق ہوا تو اس میں بعض باتیں غیر معمولی نظر آئیں۔ یہ بچہ کچھ عجیب سا تھا، لوگوں سے الگ تھلگ کسی گوشے میں بیٹھا گھنٹوں کچھ سوچتا رہا۔ گھر والے جب انہیں تلاش کرتے ہوئے اس گوشے میں پہنچ جاتے تو بھی وہ ہوش میں نہ آتے۔ حضرت مجدد الف ثانی پوچھتے "بیٹے! یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟"

بیٹا انہیں سرسری نظروں سے دیکھ کر اپنی باہیں پھیلا دیتا اور مجدد الف ثانی انہیں اپنی گود میں اٹھا کر خوب پیار کرتے۔

گھر کا ہر فرد نہایت صاف ستھرا اور مستعد رہتا تھا، خواجہ صادق کو بھی اسی طرح رکھا جاتا لیکن باوجود صغر سنی خواجہ صادق کسی کے قابو میں نہیں

آتے تھے۔ انہیں لباس اور جوتوں کی ذرا بھی پرواہ نہ تھی، لباس درست نہیں ہے تو کوئی بات نہیں ہے، جوتے نہیں پہنے تو کیا ہے ننگے پاؤں گھومنے پھرنے میں کیا مضائقہ ہو سکتا ہے۔

گھر میں مہمان آنے والے تھے۔ پورے گھر کو حکم دیا گیا کہ ہر کوئی صاف و ستھرا اور چاق و چوبند رہے۔ اور گھر کے ہر فرد نے اس حکم کی تعمیل بھی کی۔ سہ پہر کو خواجہ صادق کی تلاش ہوئی تو وہ گھر میں کہیں نظر ہی نہ آئے۔ باپ نے بیٹے کی تلاش میں گھر سے باہر کا رُخ کیا، کسی لڑکے نے پوچھا "قبلہ بزرگوار! آپ کسے تلاش کر رہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "اپنے صادق کو دیکھ رہا تھا وہ کہیں بھی نظر نہیں آ رہا۔"

کسی لڑکے نے ہنس کر پوچھا "آپ اپنے بیٹے صادق کو تلاش کر رہے ہیں؟"

آپ نے فرمایا "ہاں میں اسی کو تلاش کر رہا ہوں، تم نے دیکھا ہے اسے کہیں؟"

لڑکے نے کہا "بزرگوار! آپ لوگ اپنے بچے کا خیال نہیں رکھتے۔"

آپ نے پوچھا "کیوں کیا ہو گیا میرے بچے کو؟"

لڑکے نے کہا "میں نے آپ کے بیٹے کو ننگے پاؤں، ننگے سر، اور یوں ہی بوسیدہ لباس میں ویرانے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ہے۔

آپ فوراً ہی اسی طرف روانہ ہو گئے جدھر کی نشاندہی لڑکے نے کی تھی۔ کافی دیر بعد وہ امرودوں کے ایک باغ میں درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھے ملے۔ وہ آنکھیں بند کیے کچھ سوچ رہے تھے۔

باپ نے وفورِ جوش میں انہیں گود میں اٹھا لیا اور پوچھا "بیٹے! یہ تم اتنی

دور کیا لینے آ گئے تھے؟"

بیٹے نے جواب دیا" باوا جان! مجھ سے روحیں باتیں کرتی ہیں۔"

باپ بذاتِ خود بہت بڑا ولی تھا، سمجھ گیا کہ بیٹا بعید از قیاس بات نہیں کر رہا، انہوں نے خواجہ صادق کو سمجھایا" بیٹے روحیں کسی خاص جگہ کی پابند نہیں ہوتیں، پھر ان کے ساتھ یا ان کے لیے گھر سے اتنی دور چلے آنا کیا مناسب ہے؟"

بچے نے جواب دیا" باوا جان! میں نہیں جانتا کہ کیا مناسب ہے اور کیا مناسب نہیں ہے۔ مجھے روحیں بتا رہی تھیں کہ دنیا چند روزہ ہے، یہاں کے تکلفات درخورِ اعتنا نہیں ہیں۔ وہ مجھے ویرانے کی طرف لیے جا رہی تھیں کسی قبرستان میں۔ وہ مجھے انسانی انجام سے روشناس کرانے لے جا رہی تھیں۔"

آپ نے بیٹے سے زیادہ باتیں نہیں کیں، گود میں لیے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تو ممتا کے جوش میں بے تاب ماں نے انہیں اپنی گود میں لے لیا اور پوچھا" میرا صادق کہاں سے ملا آپ کو؟"

آپ نے جواب دیا" آبادی کے باہر امرودوں کے ایک باغ میں۔"

ماں نے نہایت درد و اضطراب میں بیٹے کو سمجھانا شروع کیا" بیٹے! یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے تم نے۔ کہیں اس حال میں نکلا جاتا ہے گھر سے اور پھر ابھی تمہاری عمر کیا ہے ساڑھے سات آٹھ سال۔ گھر میں چند مہمان آنے والے ہیں، جب تک تم ملے نہیں تھے ہم سب کا بہت بُرا حال تھا۔ اب آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا۔"

بیٹے نے ماں سے بھی وہی بات کہی جو باپ سے کہی تھی۔ کہا" ماں! مجھے

روحیں بلالے گئی تھیں۔"

ماں کی آنکھیں وفورِ حیرت سے اُبل سی پڑیں۔ بولیں۔ "روحیں!" پھر اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ "آپ نے سُنا، یہ صادق کیا کہہ رہا ہے؟ یہ روحوں کی بات کر رہا ہے کیسی روحیں، کس کی روحیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں نے اس کا نام محمد صادق رکھا ہے۔ اس لیے یہ جھوٹ تو بول ہی نہیں سکتا۔ میں روحوں کی بابت معلوم کر کے پھر کسی دن بتاؤں گا۔"

مہمان آئے اور چلے گئے۔ خواجہ صادق پورے گھر کی توجہ کا مرکز بن چکے تھے۔

خواجہ صادق کی تعلیمی ذمہ داری حضرت مجدد الف ثانی کے سر تھی یا پھر مولانا طاہر لاہوری کے ذمہ۔ مولانا کی علمی اور روحانی حیثیت مستند اور غیر مشتبہ تھی۔ ان دونوں حضرات نے خواجہ صادق میں ذہانت، حافظے اور اکتساب کی صلاحیتیں بھرپور محسوس کیں مگر ان خصوصیات اور اوصاف کے ساتھ یہ بھی محسوس کیا کہ وہ اکثر و بیشتر کتابیں کہیں اِدھر اُدھر ڈال دیتے اور پڑھائی میں دلچسپی نہ لیتے۔

ایک دن مولانا طاہر پڑھانے جو بیٹھے تو پتہ چلا، خواجہ صادق نے کتابیں کسی اور کو دے دی ہیں۔ استاد نے پوچھا۔ "بیٹے صادق! اب تم کس طرح پڑھو گے؟"

خواجہ صادق نے جواب دیا۔ "کیا چند روزہ زندگی میں پڑھنا ضروری ہے؟"

مولانا طاہر نے کہا۔ "چند روزہ زندگی؟ بھئی ایسی چند روزہ زندگی میں انسانوں نے بڑے بڑے کام انجام دیے ہیں، پیغمبروں نے جدوجہد کر کے خدا کا پیغام ہم انسانوں تک پہنچایا، عالموں نے علم حاصل کر کے عام کیا، بادشاہوں نے حکومتیں کیں، طبیبوں نے علاج کیے۔ صاحبانِ کشف نے خدائی بھیدوں پر سے پردہ ہٹا دیا۔ چند روزہ زندگی میں عظیم الشان کارنامے انجام دیے۔

لیکن خواجہ صادق کا چہرہ صاف بتا رہا تھا کہ استاد کی باتوں نے ان کے دل و دماغ پر کوئی اثر نہیں کیا۔

مولانا طاہر نے کہا۔ "صاحبزادے! آپ نے میری باتیں سُن لیں؟ پھر جواب کیوں نہیں دیا؟"

خواجہ صادق کے چہرے پر کرب و اذیت کے آثار ظاہر ہوئے اور بڑے دکھ سے جواب دیا۔ "استادِ محترم! میں کیا کروں، مجھے روحوں نے یہی بتلایا ہے، ایں چند روزہ زندگی میں پڑھ لکھ کر کیا کروں گا۔"

مولانا طاہر نے یہ باتیں ان کے باپ شیخ احمد سرہندی کے گوش گزار کر دیں اور کہا۔ "صادق کی یہ باتیں میری سمجھ میں تو آ نہیں رہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اسے قائل کس طرح کروں؟"

شیخ احمد نے جواب دیا۔ "مولانا! آپ فکر نہ کریں۔ میں خود بھی اس قسم کی باتیں اپنے بیٹے صادق کی زبان سے سُن چکا ہوں، اب میں اسے اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں لے جاؤں گا اور دیکھتا ہوں کہ وہ کیا فرماتے ہیں۔"

مولانا طاہر نے فرمایا۔ "میں بھی اس دن کا انتظار کروں گا جب میں صادق میں نمایاں تبدیلیاں محسوس کرنے لگوں گا۔"

اب خواجہ صادق پورے آٹھ سال کے ہو چکے تھے یعنی یہ ۱۰۰۸ھ کی بات ہے۔

شیخ احمد نے اپنی بیوی سے کہا۔ "نیک بخت! آج میں صادق سے ملا ہوں۔"

بیوی نے حیرت سے پوچھا۔ "صادق سے ملا ہوں؟ کیا مطلب؟ وہ تو ہمارا بیٹا ہے اور اسی گھر میں رہتا ہے۔"

باپ نے جواب دیا۔" یہ باتیں تم اور میں کیا ہر کوئی جانتا ہے لیکن یہ بات ہر کوئی نہیں جانتا کہ بیٹے کیا ہوتے ہیں اور میرا صادق کس قسم کا بیٹا ہے۔" پھر بیوی سے کہا۔" آج میں صادق کو حضرت باقی باللہ کی خدمت میں لے جانا چاہتا ہوں، تم اس کے کپڑے بدلوا کر جوتا ٹوپی بھی پہنادو۔"

بیوی نے اس کام میں زیادہ دیر نہیں لگائی اور صادق کو فوراً ہی تیار کردیا۔

راستے میں آپ نے صادق سے کہا۔" بیٹے! کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم کہاں جارہے ہو؟"

بیٹے نے جواب دیا۔" ہاں معلوم ہے آپ مجھے خواجہ باقی باللہ کے پاس لیے جارہے ہیں۔"

آپ نے پوچھا۔" بیٹا تم اتنی باتیں کیوں کرتے ہو؟"

خواجہ صادق نے جواب دیا۔" میں کیا جواب دوں۔ میں وہی کچھ بتا دیتا ہوں جو روحیں مجھے بتا دیتی ہیں اور میں اسی قدر باتیں کرتا ہوں، جتنی روحیں بتاتی ہیں۔"

جب یہ دونوں حضرت باقی باللہ کی خدمت میں پہنچے تو خواجہ نے صادق کی طرف دیکھتے ہی کہا۔" شیخ احمد! ماشاءاللہ! یہ تمہارا بیٹا ہے! خوب! اس سے تو روحیں باتیں کرتی ہوں گی حال وقال اور جذب ومستی کا پیکر۔"

آپ نے پوچھا۔" پیر ومرشد! میں آپ سے چند باتیں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

خواجہ باقی باللہ نے جواب دیا۔" تو پوچھو نا۔ خاموش کیوں ہو، تکلف کیوں؟"

آپ نے فرمایا۔" پیر ومرشد کبھی کبھی صادق کا دل پڑھائی میں بھی نہیں لگتا، ان حالات میں میں کیا کروں؟"

خواجہ باقی باللہ نے جواب دیا۔" اس پر کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالنا، جتنا پڑھنا چاہے پڑھتا رہے۔ جب نہ پڑھنا چاہے تو اس پر بلاوجہ دباؤ نہ ڈالنا۔"

اس کے بعد خواجہ باقی باللہ نے صادق کو اپنے سامنے بٹھا لیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ فرمایا "ہاں صادق! تو تجھے روحیں باتیں بتاتی ہیں؟"

خواجہ صادق نے جواب دیا "جی پیر مرشد!"

خواجہ باقی باللہ نے پوچھا "روحیں اور کیا بتاتی ہیں تمہیں؟"

خواجہ صادق نے جواب دیا "جب میں چلتا ہوں تو مجھے اکثر اپنے آس پاس روحیں نظر آنے لگتی ہیں، پھر وہ مجھے مخاطب کرتی ہیں اور میں انہیں ان کے سوالوں کے جوابات دے دیتا ہوں"

خواجہ باقی باللہ نے فرمایا "اور یہ تم چند روز میں اتنے ماہر اور ہوشیار ہو گئے ہو!"

خواجہ صادق نے کہا "میرے پاس کچھ بھی تو نہیں۔ میں خود کچھ نہیں پھر پتہ نہیں یہ روحیں ....."

خواجہ باقی باللہ نے شیخ احمد کو خوب خوب سمجھایا۔ یہاں تک کہ انہوں نے کہہ دیا کہ شیخ احمد! تم تنہا کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اللہ کے سوا انسان بھی کچھ ہوتا ہے کسی کا؟"

آپ نے سرگوشی میں پوچھا "پیر مرشد! میرے لیے کیا حکم ہے؟"

مرشد نے جواب دیا "تمہارے لیے یہ حکم ہے کہ تم صادق کو پریشان نہ کرنا"

جب یہ دونوں باپ بیٹے واپس آرہے تھے تو راستہ میں بیٹے نے کہا "باوا جان! یہ مجھے کیا ہو گیا ہے، اب میں اپنی ذات میں کچھ زیادہ ہی کیفیتیں محسوس کر رہا ہوں"

باپ نے پوچھا" یعنی ؟"
خواجہ صادق نے جواب دیا" یعنی یہ کہ مجھے اپنا دل پگھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے، دنیا پہلے بھی اچھی نہیں لگتی تھی اب اور زیادہ بُری لگنے لگی ہے اس وقت بھی کہ میں آپ کے ساتھ چل رہا ہوں۔ مجھے اپنے آس پاس روحیں نظر آ رہی ہیں، پہلے سے زیادہ۔"
آپ خاموش ہو گئے۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

اس واقعہ کے چند دن بعد خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں ایک اسّی سالہ درویش نے حاضری دی، اس درویش نے پچاس سال مسلسل محنت اور ریاضت سے بہت کچھ حاصل کر لیا تھا، کسی کامل کی صحبت اور اس کے فیضان نے اس درویش کو بہت کچھ دے دیا تھا۔ اس نے خواجہ باقی باللہ کا بہت زیادہ نام سُن رکھا تھا۔ وہ آپ کی خدمت میں پہنچا اور آنکھیں بند کر کے ایک طرف بیٹھ گیا۔
خواجہ باقی باللہ نے اپنے کشف سے معلوم کر لیا کہ یہ درویش ان کے پاس کیوں آیا ہے؟ انہوں نے درویش سے کہا" درویش زیادہ زعم اچھا نہیں ہوتا۔ جو کچھ مل چکا ہے وہی کافی ہے اسی پر اکتفا کر اور اپنی راہ لے۔"
درویش نے جواب دیا" حضرت! میں نے آپ کا بڑا نام سُنا ہے اور یہاں اسی لیے آیا ہوں کہ اگر مجھ میں کوئی کمی ہو اور آپ اس کمی کو دور کر سکتے ہوں تو میں اسے دُور کر لوں۔"
آپ کو درویش کی بات نے تکلیف پہنچائی، پوچھا" تجھے کیا کچھ آتا ہے؟"
درویش نے جواب دیا" آپ یہ پوچھیے کہ مجھے کیا نہیں آتا۔"

خواجہ باقی باللہ نے فرمایا "پھر بھی۔ جو کچھ تجھے معلوم ہے اس سے آگے تجھے دیا جا سکتا ہے۔ ہمیں یہ تو معلوم ہو کہ تو کہاں تک پہنچ چکا ہے۔"

درویش نے جواب دیا "کشف، مراقبہ، نفس کشی، حبسِ دم، دلوں کا حال جان لینا، نقلی اور عقلی علوم پر دسترس، احادیث، تفسیر، فقہ، دوسروں کی روحانی قوت سلب کر لینا وغیرہ وغیرہ۔"

آپ نے اس وقت خواجہ صادق کو بلوا لیا اور درویش سے کہا۔ میں آٹھ نو سالہ بچے کو بلواتا ہوں اور اس سے یہی سوال کرتا ہوں پھر جو جواب ملے گا اس کی روشنی میں تو کوئی فیصلہ کر سکے گا۔"

کچھ دیر بعد خواجہ صادق آ گئے، درویش نے اس آٹھ نو سالہ بچے کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو ہنسنے لگا۔ پوچھا "کیا اس کو بلوایا تھا آپ نے؟"

آپ نے جواب دیا "ہاں اسی کو بلوایا تھا میں نے اور وہی سوال میں اس سے کرتا ہوں تو جوابات کو غور سے سنے گا۔"

پھر آپ نے خواجہ صادق سے پوچھا "ہاں تو صاحبزادے! ذرا آپ یہ تو بتائیں کہ آپ کو کیا آ گیا ہے اور کیا نہیں آتا؟"

خواجہ صادق نے درویش کی طرف دیکھا اور درویش نے خواجہ صادق کی طرف، دونوں کی نظریں ملیں تو درویش نے اپنے اندر ایک انقلاب، ایک ہلچل، ایک بے چینی سی محسوس کی۔

خواجہ صادق نے جواب دیا "مراقبہ اور نفس کشی، کشف، حبسِ دم، نقلی اور عقلی علوم پر دسترس، دلوں کا حال جان لینا، وہ لوگ جو سینکڑوں سال پہلے مر چکے ہیں اور وہ لوگ جو ماضی قریب میں انتقال کر چکے ہیں۔ میں ان کی روحوں سے باتیں کر سکتا ہوں۔ قبریں میرے سامنے باتیں کرتی ہیں۔ وہ مجھے ہدایات

دیتی ہیں۔"

درویش یہ سب سن کر پریشان ہوگیا، پوچھا" کیا کہا۔ روحیں تجھ سے بات کرتی ہیں اور یہ کہ ماضی بعید اور قریب کے مردہ لوگ تم سے ہمکلام ہوتے ہیں، یہ کس طرح ممکن ہے ؟"

خواجہ صادق نے جواب دیا" یہ تو میں نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے لیکن ایسا ہوتا ضرور ہے۔"

درویش نے پوچھا" میں کس طرح یقین کروں ؟"

خواجہ صادق نے جواب دیا" تم مجھ سے کوئی ایسا یا چند ایسے سوال کرو جن کے جوابات میرے لیے ناممکن ہوں، اگر میں ان کے سچے اور معقول جوابات دے دوں تو میں سچا ورنہ جھوٹا۔"

درویش کچھ سوچنے لگا، پھر پوچھا" اچھا روحوں سے پوچھ کر یہ بتاؤ کہ میں کہاں سے آرہا ہوں ؟"

خواجہ صادق نے قدرے تامل کے بعد جواب دیا" بنگال کے گور سے۔ وہاں تم نے پچاس سال تک ریاضت اور بزرگ کی خدمت کی ہے اس سے تمہیں یہ فیض حاصل ہوا ہے۔"

درویش کو چکر آگیا، پھر پوچھا" اچھا! اب تم یہ بتاؤ کہ میں یہاں کس خیال سے آیا ہوں ؟"

خواجہ صادق نے دیکھا دو روحیں خلا میں لکھ لکھ کر انہیں جواب دے رہی ہیں۔ درویش سے کہا" اگر تم خلا کی اس تحریر کو پڑھ سکتے ہو تو خود ہی پڑھ لو، یہ تحریر میری نہیں ہے کسی اور روح کی ہے۔"

درویش نے اسے پڑھا" وہاں لکھا تھا!

عصرِ حاضر کی الف لیلہ۔ اُردو زبان کی طویل ترین کہانی

ایک ایسے انسان کی داستان، جو سوچ کی انگلیوں سے دوسروں کے
دماغ ٹٹولتا اور لوگوں کو اپنی سوچ کے اشاروں پر نچاتا ہے

ٹیلی پیتھی کے ماہر فرہاد علی تیمور کی داستانِ حیات

سسپنس ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ، جو پچھلے کئی برسوں
سے چھپ رہا ہے اور آج بھی مقبولیت میں پہلے نمبر پر ہے۔

۳۶ حصے
ایک ساتھ
منگوانے پر
رعایتی قیمت
صرف
۱۱۰۰ روپے

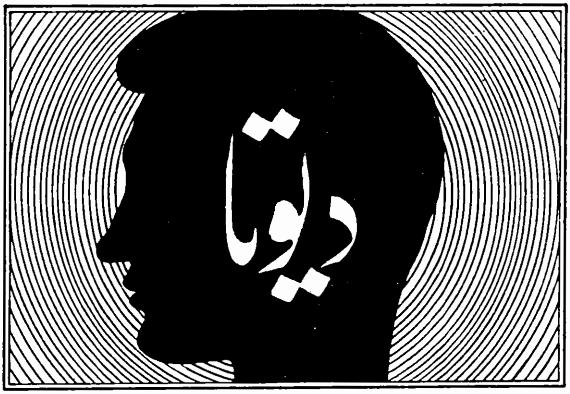

یہ رعایت
صرف
پیشگی رقم
بذریعے منی آرڈر
یا ڈرافٹ
روانہ کرنے پر
مل سکے گی

کتابی شکل میں ۳۶ حصے تیار ہیں

دیوتا نے اپنی طوالت کی بناء پر دُنیا کی طویل ترین
کہانیوں کے ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔ ڈائجسٹ میں
اب تک اس کے ۱۲،۰۰۰ صفحات شائع ہو چکے ہیں،
جو عام کتاب کے ۴۸،۰۰۰ صفحات ہوتے ہیں۔

۴۳

11.1999

قیمت فی حصہ ۵۰/ روپے، ڈاک خرچ فی حصہ ۱۶/ روپے

کتابیات پبلی کیشنز ◎ پوسٹ بکس ۲۳ رمضان چیمبرز بلیمویا اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی

PHONE: 2638517 FAX: 2637960

"یہ شخص یہاں اس لیے آیا ہے کہ اس طرح یہ تیرے مرشد خواجہ باقی باللہؒ کے کمالات ظاہری اور باطنی کا امتحان لینا چاہتا ہے، یہاں آنے سے پہلے اس نے یہ سوچا تھا کہ اس کو جو کچھ حاصل ہے یہ اس میں سے کچھ باقی باللہؒ کو دے دے گا لیکن اب یہ خجالتوں کا شکار ہے۔"

خواجہ باقی باللہ اور صادق نے دیکھا کہ درویش کی حالت غیر ہو رہی ہے۔

خواجہ صادق نے دیکھا، دوسری روح نے بھی خلا میں کچھ لکھ دیا ہے۔

اب درویش کی ہمت بالکل ہی جواب دے چکی تھی، وہ چیخ مار کر کھڑا ہو گیا "حضرت! مجھ سے غلطی ہو گئی، مجھے معاف فرما دیں، جس آستانے کے بچے اتنے باکمال ہوں اس کے بڑوں کا کیا پوچھنا۔ اب میں اس آستانے کو چھوڑ کر کہیں بھی نہیں جاؤں گا۔"

وہ درویش اس آستانے کا ہو رہا۔

خواجہ باقی باللہؒ کو خود بھی بڑی حیرت تھی، وہ صادق کو قبرستان لے گئے اور ایک ٹوٹی پھوٹی قبر کے پاس کھڑے ہو کر کہا "مجھے یہ بتاؤ کہ اس قبر کا مردہ کیا کہتا ہے؟"

خواجہ صادق نے کچھ دیر سکوت اختیار کیا، وہ کچھ سننے کی کوشش کرتے رہے پھر جواب دیا "وہ کہتا ہے میں نے جس دولت اور جائیداد کی زندگی بھر چوکیداری کی، آج اسے میرا نالائق اور عیاش بیٹا دونوں ہاتھوں سے لٹا رہا ہے اور میں کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ عیش و عشرت کے نشے میں مجھے بھی بھول چکا ہے۔ آج کوئی بھی ایسا نہیں جو قرآن پڑھ کر مجھے بخشے۔"

خواجہ باقی باللہ بہت متاثر ہوئے اور گھر واپس جا کے مریدوں سے قرآن پڑھوا کے اس کے نام پر ایصالِ ثواب پہنچایا۔

خواجہ صادق کے چچا شیخ مسعود تجارت کرتے تھے اور سامانِ تجارت لے کر بیرون ملک جایا کرتے تھے۔ اس بار ان کا ارادہ خراسان جانے کا تھا ان کا قاعدہ تھا کہ سفر پر جانے سے پہلے اپنے باپ کے مزار پر ضرور جاتے تھے۔ چنانچہ اس بار بھی ایسا ہی کیا، ان کے ساتھ گھر کے دوسرے لوگ بھی خواجہ صادق کے دادا مخدوم عبدالاحد کے مزار پر گئے۔ ان میں خواجہ صادق بھی شامل تھے۔

شیخ مسعود قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر کہنے لگے "پدرِ بزرگوار! میں اس بار تجارت کی غرض سے خراسان جا رہا ہوں اور میں جب بھی کہیں جاتا ہوں آپ کے پاس حاضری دے کر جاتا ہوں۔ اس بار بھی اجازت لینے آیا ہوں اور دعاؤں کا طالب ہوں۔"

خواجہ صادق بھی آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئے، دفعتاً انہیں کسی نے چھوا، انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور حیرت سے اپنے دائیں جانب دیکھنے لگے۔ انہوں نے اپنے پاس اپنے دادا عبدالاحد کو کھڑے دیکھا۔ خواجہ صادق نے دادا کو سلام کیا دادا نے جواب دیا۔ شیخ مسعود نے پوچھا "بابا صادق! تم کس کو سلام کر رہے ہو؟"۔

آپ نے جواب دیا۔ "دادا جان کو۔"

شیخ مسعود ہنسنے لگے۔ انہیں خواجہ صادق کی بات پر یقین نہیں آیا، طنزیہ پوچھا۔ "اچھا تو تم اپنے دادا کو سلام کر رہے تھے۔"

خواجہ صادق نے جواب دیا۔ "ہاں وہ اس وقت میرے داہنی طرف کھڑے ہیں۔"

شیخ مسعود کو اور زیادہ ہنسی آئی، بولے "یہ اور زیادہ حیرت اور کمال کی

بات ہے کہ تم انہیں اپنے دائیں جانب بھی دیکھ رہے ہو۔ خوب!"

خواجہ صادق نے کہا "چچا جان! آپ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو جائیں۔ میں دادا جان سے باتیں کرنا چاہتا ہوں، وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔"

شیخ مسعود کو ان کی باتوں میں بڑا مزہ آرہا تھا، بولے۔ "خوب تو والدِ بزرگوار تم سے باتیں بھی کرنا چاہتے ہیں، اچھا پھر ایسا کرو کہ ان سے جو باتیں بھی کرو، مجھے بھی سنا دو، میں بھی سننا چاہتا ہوں۔"

خواجہ صادق نے جواب دیا "افسوس کہ میں جدِ بزرگوار کی آواز آپ کو نہیں سنوا سکوں گا۔ کیونکہ شاید وہ اسے پسند نہیں کریں گے مگر آپ ان سے جو کچھ بھی پوچھنا چاہیں میں ان سے جوابات حاصل کر کے آپ تک پہنچا سکتا ہوں۔"

شیخ مسعود نے کہا۔ اچھا تو یہ بات ہے! پدرِ بزرگوار سے پوچھو کہ اس بار خراساں میں میں کتنا نفع حاصل کروں گا؟"

خواجہ صادق نے اپنے دادا کو مخاطب کر کے پوچھا "دادا جان آپ نے اپنے بیٹے کا سوال تو سن ہی لیا اب اس کا جواب مرحمت فرمائیں۔"

دادا نے جواب میں کہا "خواجہ صادق! اپنے چچا سے کہو یہ اس کا آخری سفر ہے، یہ خراساں نہیں پہنچ سکے گا۔"

خواجہ صادق نے دادا کا جواب چچا کے گوش گزار کر دیا۔

شیخ مسعود نے اپنے دوسرے عزیزوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"صاحبان! مجھے یہ لڑکا پاگل معلوم ہوتا ہے!"

کسی بزرگ نے اس سے اختلاف کیا اور کہا "خواجہ صادق کی ایک

خوابوں کی تعبیر، ان کی حقیقت اور ان کی افادیت کے بارے میں ایک نادر کتاب

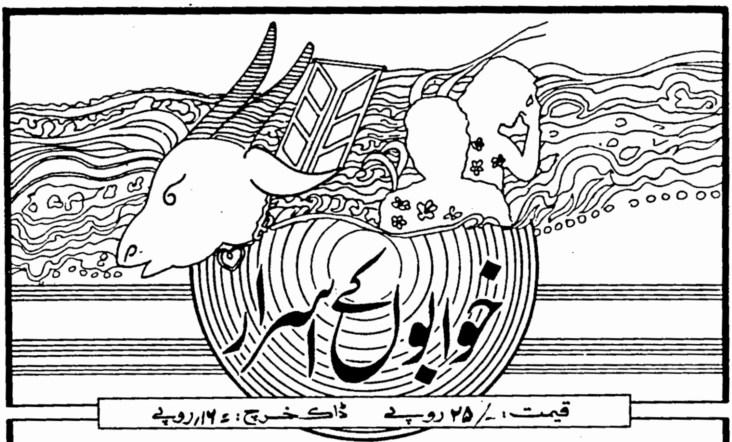

قیمت : -/۲۵ روپے ڈاک خرچ : ۱۲ روپے

- خواب کیا ہوتے ہیں ؟
- ان کی تعبیر کیا ہوتی ہے ؟
- خواب کیوں نظر آتے ہیں ؟

خوابوں کے بارے میں مکمل معلومات

کتاب کے چند عنوانات :

۱۰

- نیند ■ خوابی اصطلاحیں ■ تحلیلِ نفسی کے طریقے
- بچوں کے خواب ■ الہامی خواب ■ رویائے صادقہ
- کثرت سے نظر آنے والے خواب ■ خواب اور الجھنیں ■ خواب اور آدمی
- خواب اور یہودیت ■ خواب اور اسلام ■ خواب اور مستقبل
- خوابوں کی عددی اہمیت ۱ ■ خوابوں کی لغت

خوابوں پر ایک مکمل اور مستند کتاب

مکتبۂ نفسیات : پوسٹ بکس ۹۴۴ کراچی

بات بھی آج تک غلط نہیں ثابت ہوئی اس نے اپنے دادا کے حوالے سے جو کچھ بھی کہا ہے وہ وقت آنے پر سچ ثابت ہو جائے گی۔"

خواجہ صادق اپنے دادا کی روح سے مخاطب تھے۔ انہوں نے پوچھا۔

"دادا جان! آپ دعا فرمائیں کہ عم محترم صحیح سلامت گھر واپس آجائیں۔"

لیکن دادا کی روح نے دُعا کرنے سے انکار کر دیا، کہا۔" بیٹے! جو بات قسام ازل نے قسمت کر دی ہے اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ شیخ مسعود سفر پہ جائے گا ضرور، تم اسے روک کر دیکھو یہ نہیں رُکے گا۔"

شیخ مسعود نے پوچھا۔" برخوردار! پدر بزرگوار کی روح اور کیا کہہ رہی ہے؟"

خواجہ صادق نے جواب دیا۔" دادا جان فرما رہے ہیں کہ اپنے چچا سے کہو یہ سفر مناسب نہیں ہے کیونکہ دوران سفر یہ انتقال فرما جائیں گے، انہیں سفر سے روکو۔"

شیخ مسعود نے بھتیجے کی بات ہنسی میں اڑا دی، بھتیجے تم مجھے گپی معلوم ہوتے ہو، باتیں خوب بنا لیتے ہو۔"

دوسری طرف دادا کہہ رہے تھے کہ "دیکھ لیا پوتے! سُن لیں اپنے چچا کی باتیں۔"

خواجہ صادق نے جواب دیا۔" دادا جان! وہ آپ کی آواز سُن نہیں سکتے پھر میری بات پر یقین کس طرح کریں۔"

دادا نے کہا۔" بیٹے! یہ یقین نہیں کرے گا، یہ دنیا دار کاروباری آدمی ٹھہرا اور پھر قسمت کا لکھا نہ یہ بدل سکتا ہے، نہ میں نہ کوئی اور۔"

شیخ مسعود نے ہنس کر پوچھا۔" پدر بزرگوار کی روح اب کیا کہہ رہی ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔" دادا جان فرما رہے ہیں کہ قسمت کے لکھے کو کوئی

بھی نہیں بدل سکتا۔"

خواجہ صادق نے دادا سے اجازت طلب کی۔" دادا جان! میں جانا چاہتا ہوں۔"

دادا نے کہا۔" بہتر ہے خدا حافظ۔"

واپسی میں خواجہ صادق نے ایک بار پھر اپنے چچا سے کہا۔" عم محترم! کیا آپ اس سفر کو ملتوی نہیں کر سکتے؟"

چچا نے جواب دیا۔" بھتیجے! جب یہ بات طے ہے کہ قسمت کا لکھا بدلا نہیں جا سکتا۔ تو جو کچھ ہونا ہے اسے ہو جانے دو۔"

شیخ مسعود یہیں سے اپنے سفر پر روانہ ہو گئے اور اسی سفر میں ہلاک ہو گئے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

خواجہ صادق پر اکثر و بیشتر کیف وجذب اور مستی طاری رہتی، خواجہ باقی باللہ کو ان کی بڑی فکر رہتی، وہ اکثر فرمایا کرتے کہ" مجھے خواجہ صادق سے زیادہ کوئی بھی عزیز نہیں۔"

خواجہ صادق کے سلسلے میں حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ جذب ومستی کی فراوانی کے باوجود حصول علم میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ آپ نے اٹھارہ سال کی عمر میں وہ سب علم حاصل کر لیا جو اساتذہ کو حاصل تھا۔ آپ نے تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔

انہی دنوں شیراز کا ایک فاضل ہندوستان آیا ہوا تھا۔ معقولات میں اس کا کوئی جواب نہ تھا، اس کا خیال تھا کہ ہندوستان میں اس جیسا معقول دوسرا نہیں ملے گا۔ ہندوستانی علما اس کے پاس جاتے اور نیازمندی سے

سے پیش آتے۔

خواجہ صادق بھی اس سے ملنے گئے اور اس ہیئت اور حکمت پر باتیں کرنے لگے۔ خواجہ صادق اس سے جو باتیں کر رہے تھے۔ ان کا کہیں کتابوں میں ذکر نہیں تھا۔ اس نے حیرت سے پوچھا" صاحبزادے! یہ جو تم بیان کر رہے ہو، اس کا کہیں کتابوں میں بھی ذکر ہے یا نہیں ہے"

خواجہ صادق نے جواب دیا" جب بات معقولات پر ہو رہی ہو تو کتابوں کے حوالے سے کیوں ہو؟ یہ باتیں طبعزاد ہیں۔ میری اپنا طبعزاد"

شیرازی فاضل نے حاضرین مجلس سے کہا" صاحبان! ابھی کچھ دیر پہلے تک میرا خیال یہ تھا کہ ہندوستان میں ایک بھی میرا جیسا معقول نہیں ملے گا لیکن آج اس نوجوان نے مجھے شرمندہ کر دیا۔ جس ملک میں خواجہ صادق جیسا نوجوان معقولی موجود ہو اس کی ہم سری کا دوسرا کوئی ملک کیا دعویٰ کرے گا"

خواجہ صادق نے ایک سرد آہ بھری اور کہا" لیکن صاحبان میں یہاں کی کسی چیز سے بھی مطمئن نہیں۔ چند روزہ زندگی میں آدمی کیا کرے گا اور کیا خوشی حاصل کرے گا"

مجلس کے ایک شخص نے کہا" محترم نوجوان! مجھے یاد پڑتا ہے آپ اپنے بچپن میں بھی یہی چند روزہ زندگی کی بات کیا کرتے تھے۔

خواجہ صادق نے جواب دیا" ہاں میں چھ سات سال تک یہی کہتا رہوں گا"

مجلس کے ہر شخص نے یہ بات سنی مگر یہ نہیں پوچھا کہ چھ سات سال کا آخر مطلب کیا ہے؟

آپ نے علمی مہارت کے ساتھ ہی سلوک کے مراتب بھی طے کیے

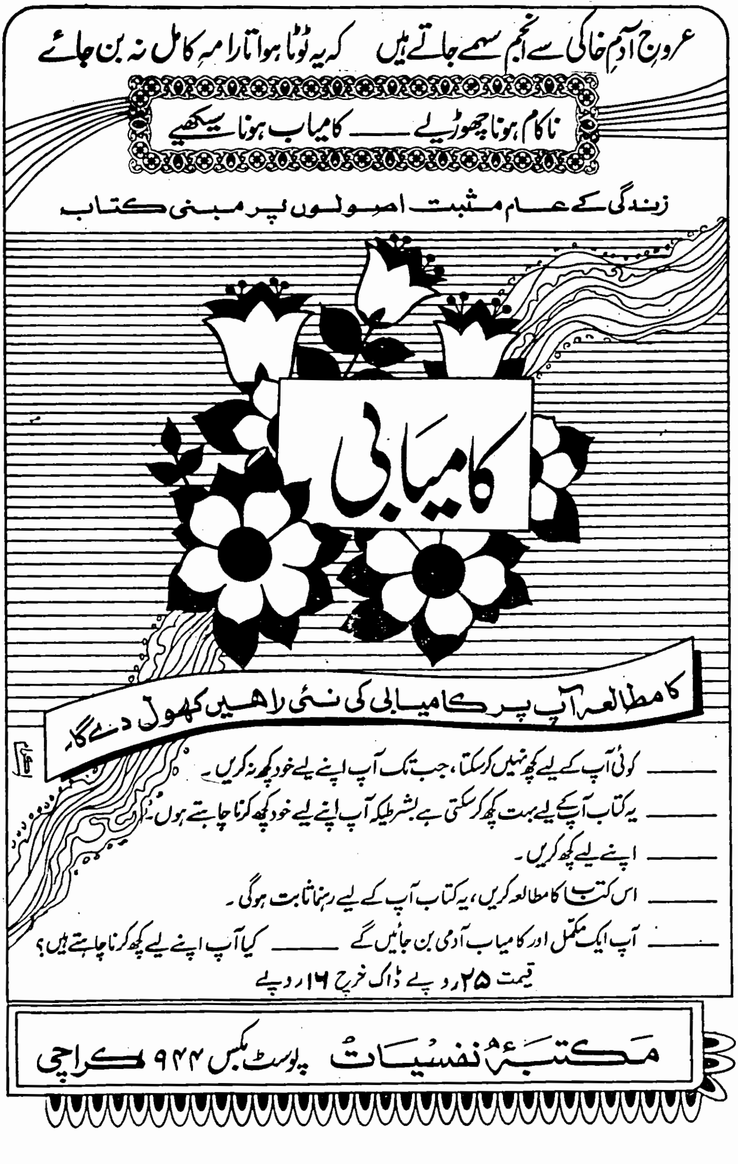

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے
ناکام ہونا چھوڑیے ـــــ کامیاب ہونا سیکھیے
زندگی کے عام مثبت اصولوں پر مبنی کتاب
کامیابی
کا مطالعہ آپ پر کامیابی کی نئی راہیں کھول دے گا۔
ـــــ کوئی آپ کے لیے کچھ نہیں کرسکتا، جب تک آپ اپنے لیے خود کچھ نہ کریں۔
ـــــ یہ کتاب آپ کے لیے بہت کچھ کرسکتی ہے بشرطیکہ آپ اپنے لیے خود کچھ کرنا چاہتے ہوں۔
ـــــ اپنے لیے کچھ کریں۔
ـــــ اس کتاب کا مطالعہ کریں، یہ کتاب آپ کے لیے رہنما ثابت ہوگی۔
ـــــ آپ ایک مکمل اور کامیاب آدمی بن جائیں گے ـــــ کیا آپ اپنے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں؟
قیمت ۲۵ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے
مکتبۂ نفسیات پوسٹ بکس ۹۴۴ کراچی

تھے۔ چنانچہ اکیس[۲۱] سال کی عمر میں آپ نے اپنے والد حضرت مجدد الف ثانی سے خلافت حاصل کر لی۔ آپ نے اپنے والد سے کہا "پدرِ بزرگوار! یہ خلافت کسی اور کو آپ کیوں نہیں دیتے۔"

باپ نے جواب دیا "بیٹے! تو اس کا ہر اعتبار اور ہر لحاظ سے اہل ہے۔"

خواجہ صادق نے کہا "پدر بزرگوار! اس چند روزہ زندگی میں آدمی کیا کیا کرے۔ میں تو یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو جاتا ہوں۔"

حضرت مجدد الف ثانی نے جواب دیا "بیٹے! تو ایسی بات کیوں سوچتا رہتا ہے۔ زندگی چند روزہ ہی سہی مگر اس چند روزہ زندگی کو کندن بنایا جا سکتا ہے تو بھی اسے کندن بنا سکتا ہے۔"

خواجہ صادق مسکرانے لگے۔ ان کے ہونٹوں پر پھیکی سی مایوس سی مسکراہٹ تھی، فرمایا "پدر بزرگوار! آپ میری بات سمجھ کیوں نہیں رہے۔"

باپ نے جواب دیا "میں تیری باتیں خوب سمجھ رہا ہوں۔"

بات یہیں پر ختم ہو گئی۔

اب خواجہ صادق چوبیس سال کے ہو چکے تھے۔

حضرت مجدد الف ثانی اپنے حجرے میں تشریف فرما تھے۔ دل میں کچھ درد سا تھا، آپ نے اپنے خادم کو حکم دیا کہ اب کسی کو بھی اندر نہ آنے دیا جائے اور نہ ہی کسی کی آمد سے مجھے مطلع کیا جائے۔

رات کا وقت تھا، آپ اپنے رب سے لَو لگائے الحاح وزاری میں مشغول تھے۔ اچانک آپ کو احساس ہوا کہ ایک نور کا ٹکڑا حجرے میں داخل ہوا ہے۔ آپ نے اس نور کی طرف دیکھا وہ متحرک تھا، وہ بار بار حجرے کے باہر نکل جاتا اور پھر

داخل ہو جاتا۔ آپ نے اس سے پوچھا "کیا مطلب ہے کیا تو یہ سے کچھ کہہ رہا ہے؟"
نور اثبات کی صورت میں اوپر نیچے ہونے لگا۔

آپ نے پوچھا" تو کیا کہنا چاہتا ہے؟"

نور حجرے کے باہر نکل گیا اور کچھ دیر بعد پھر واپس آ گیا آپ نے پوچھا۔
"کیا تو مجھے اپنے ساتھ کہیں لے جانا چاہتا ہے؟"

نور ایک بار پھر اوپر نیچے ہونے لگا۔

آپ اٹھ کر نور کے ساتھ ہو لیے پوچھا" چل! تو کہاں لے چلے گا مجھے؟ میں تیرے ساتھ چلتا ہوں۔"

وہ نور آگے آگے چلا اور آپ اس کے پیچھے پیچھے۔ یہ نور حضرت مجدد الف ثانی کے والد بزرگوار کے مزار کے پاس سے گزر کر ایک چبوترہ نما ٹیلے پر ٹھہر گیا۔ آپ نے اس جگہ کو بغور دیکھ کر دریافت کیا" یہ جگہ تو میں نے دیکھ لی، اب؟"

وہ نور آہستہ آہستہ اس چبوترے میں داخل ہو گیا، آپ نے اس جگہ جھانک کر دیکھا، وہاں، اندر نور کا ایک سیلاب تھا جو امنڈا پڑ رہا تھا آپ نے سوچا، اس کا مطلب کیا ہوا؟

پھر باآواز بلند پوچھا" میں اس کا مطلب نہیں سمجھا؟"

وہی نور ایک بار پھر ذرا سا طلوع ہوا اور پھر ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو گیا، وہ اندر چبوترے نما ٹیلے کے اندر غائب ہو چکا تھا۔ آپ نے بے ساختہ اپنی خواہش کا اظہار کیا" اے کاش یہ میری آخری آرام گاہ ہو۔"

حضرت مجدد الف ثانی اپنے حجرے میں واپس پہنچے وہاں آپ کے فرزند خواجہ صادق آپ کا انتظار فرما رہے تھے، باپ کو دیکھتے ہی پوچھا" پدر بزرگوار!

خیریت تو ہے یہ اس وقت آپ کہاں تشریف لے گئے تھے؟"

پہلے تو حضرت مجدد الف ثانی نے یہ سوچا کہ اس عجیب و غریب واقعہ کی خبر بیٹے کو نہیں دینی چاہیئے لیکن پھر مجبور ہو گئے اور آپ نے خواجہ صادق کو سب کچھ بتا دیا اور آخر میں کہا "بیٹے! میں نے اپنے رب سے خواہش کی ہے کہ جس جگہ وہ نور کا ٹکڑا روپوش ہوا تھا، اسی کو میری آخری آرام گاہ قرار دیا جائے۔"

آپ نے جواب دیا "کچھ پتہ نہیں؟ ابھی تک تو کچھ معلوم نہیں ہوا۔"

خواجہ محمد صادق نے ایک بار پھر اپنا وہی فقرہ دہرایا "باوا جان! دنیا چند روزہ ہے۔ کیا میں ہمیشہ سے یہی نہیں کہہ رہا ہوں، میں نے اپنے لیے ہمیشہ زمین کے اوپر سے زیادہ اندر کو پسند کیا ہے، وہ جگہ میری ہے۔"

باپ کو حیرت ہو گئی، انہوں نے سوچا' بیٹا یہ کیا کہہ رہا ہے؟

وہ اپنے بیٹے سے اتنے متاثر تھے کہ اس دوران اپنے کسی جاننے والے کو خط لکھا تو اس میں خواجہ صادق کی بابت لکھا!

میرا یہ بیٹا میری معارف کا مجموعہ اور مقامات جدید و سلوک کا نسخہ ہے وہ محرم اسرار اور خطا و غلط سے متعون و محفوظ ہے۔"

اسی دوران سرہند میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی، پورے پورے گھر اور خاندانوں کا صفایا ہونے لگا۔ لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے لیکن جو کسی وجہ سے نہیں بھاگ سکتے تھے وہ لرزاں و ترساں تھے۔ لوگوں کا آپ کے در پر ہجوم رہنے لگا، وہ آپ سے درخواست کر رہے تھے کہ اس وبا سے بچنے کی دعا فرمائیں۔"

حضرت مجدد الف ثانی نے فرمایا "میں دعاؤں میں مشغول ہوں۔"

لیکن خواجہ صادق نے مسکرا کر فرمایا "یہ بلا یوں نہیں جائے گی، اسے لقمۂ تر کی ضرورت ہے۔"

اپنے اندر مقناطیسی قوّت پیدا کریں اور دوسروں کو اپنے طابع کریں

کتاب

مقناطیسیت

کا مطالعہ کریں

قیمت : -/۲۰ روپے　　ڈاک خرچ -/۱۶ روپے

کتاب کے چند عنوانات

- مقناطیسیت کیا ہے ؟
- بے اثر شخصیت کے اسباب ۔
- قوت کے خزانے
- مخفی مقناطیسی توانائیاں
- انسانی مقناطیسیت
- زندگی مقناطیسیت سے
- بنیادی خواہشات
- تصنع اور بناوٹ
- حرص و طمع ۔
- ذہنی توسیع
- ذہنی توسیع کا نظام ۔
- مقناطیسی تفصیلات
- جسمانی اور ذہنی توانائیاں اور ان کی حفاظت
- آپ بھی اپنے اندر مقناطیسیت پیدا کر سکتے ہیں ۔

ہر شخص میں ایک مقناطیسی قوت ہوتی ہے جو کہ ناواقفیت کی بنا پر ضائع ہوتی رہتی ہے ۔

اس قوّت سے فائدہ اٹھانے کے لیے کسی قسم کی مشق یا ریاضت کی ضرورت نہیں ہوتی ۔

صرف چند اصول اپنا لیجیے اور ان کے مطابق زندگی بسر کیجیے پھر آپ کے لیے کامیابیاں ہی کامیابیاں ہیں اور دوسرے بھی آپ کے حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور ہوں گے ۔

اس کتاب کا مطالعہ کیجیے اور اپنے آپ کو بہترین شخصیت بنائیے

مکتبۃ الطیبات پوسٹ بکس نمبر ۷۷ کراچی

اسی شب کو حضرت مجدد الف ثانی کے ایک مرید نے نیم بیداری اور نیم خوابی کی حالت میں ایک عجیب منظر دیکھا۔ وہ خود بھی مرضِ طاعون میں مبتلا ہو چکا تھا، اس نے دیکھا، بہت ساری مہیب شکلیں لوگوں کو چمٹی ہوئی ہیں اور وہ لوگ بُری طرح چیخ چلا رہے ہیں۔ وہیں پر خواجہ صادق بھی تشریف فرما ہیں۔ آپ نے ان مہیب شکلوں کو دونوں ہاتھوں سے دھکیلنا شروع کر دیا اور ان سے کہا۔" جب میں خود کو تمہارے حوالے کر رہا ہوں تو پھر یہ خلق خدا کو تنگ کرنے کا مطلب۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اب چلی جاؤ۔ تمہارے لیے میں ہی کافی ہوں۔"

اور پھر اس مرید نے خود کو پہلے سے بہتر محسوس کیا، صبح ہوتے ہوتے اس کی جانگھوں کی گلٹیاں غائب ہو چکی تھیں، اب وہ صحت مند ہو چکا تھا۔

وہ بھاگا بھاگا خواجہ صادق کے پاس پہنچا، اس نے رات کو نیم بیداری اور نیم خوابی میں جو کچھ دیکھا یا سنا تھا حضرت مجدد الف ثانی کے گوش گزار کرنا چاہتا تھا۔ یہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ خواجہ صادق کی طبیعت ناساز ہے اور حضرت مجدد الف ثانی کے گوش گزار کرنا چاہتا تھا۔ یہاں پہنچ کر اسے حضرت مجدد الف ثانی ان کے پاس بیٹھے ہیں، یہ اجازت حاصل کر کے وہاں بھی پہنچ گیا۔ خواجہ صادق نے اسے دیکھا اور مسکرا کر پوچھا۔" تُو تو ٹھیک ہو گیا نا؟"

اس نے جواب دیا۔" ہاں جب یہ بات طے پا گئی کہ اس وباء کو لقمۂ ترمل جائے گا اور اس کے لیے میں حاضر ہوں تو پھر مخلوق خدا کو ستانے سے حاصل۔"

حضرت مجدد الف ثانی نے فرمایا۔" مشیت ایزدی سے کون لڑ سکتا ہے لیکن بیٹے تو نے اپنے لیے جو بات ہمیشہ پسند کی ہے خدا اسے آج پورا کر رہا ہے۔"

خواجہ صادق نے ایک بار پھر اپنا فقرہ دہرایا۔" دنیا چند روزہ ہے اور مجھے

زمین کے اوپر سے زیادہ اس کا اندر پسند ہے۔"

حضرت مجدد الف ثانی کو ان کلمات سے قلبی اذیت پہنچ رہی تھی مگر وہ دَم نہیں مار سکتے تھے۔

آخر اس مرض میں آپ نے انتقال فرمایا۔

جب آپ کی تدفین کا مسئلہ زیرِ بحث آیا تو خاندان والوں نے کہا "ان کے لیے دادا کا قرب بہتر رہے گا کیونکہ وہ بچپن ہی سے خواجہ صادق سے محبت فرماتے تھے اور گفتگو فرمایا کرتے تھے۔"

لیکن حضرت مجدد الف ثانی کو اس سے اتفاق نہیں تھا۔ انہوں نے فرمایا "میں مراقبے میں جا کر معلوم کرتا ہوں کہ خواجہ صادق کی آخری آرام گاہ کہاں ہے؟"

اس کے بعد آپ مراقبے میں چلے گئے۔ انہوں نے دیکھا، وہی نور کا ٹکڑا آپ کو چبوترہ نما ٹیلے کی طرف لیے چلا جارہا ہے اور پھر وہ اس ٹیلے میں روپوش ہو گیا جہاں سیل نور جاری تھا، نور کا سمندر، بحرِ ذخار۔

آپ نے مراقبے سے نکل کر فرمایا "خواجہ صادق کی آخری آرام گاہ کا مجھے پتہ ہے۔"

آپ نے اپنے ہاتھوں سے بیٹے کو غسل دیا، تلقین فرمائی اور پھر اسی چبوترے نما ٹیلے میں اتار دیا، انہوں نے ایک بار پھر زمین کے اندر ہر طرف نور ہی نور پانی کی طرح بہتے دیکھا۔

کچھ عرصہ بعد حضرت مجدد الف ثانی نے مولانا صالح کو خط لکھتے ہوئے خواجہ صادق کی بابت یوں تحریر فرمایا!

"میرا فرزند حق جلّ وعلا کی آیتوں میں سے ایک آیت اور ربّ العالمین کی رحمتوں میں سے ایک رحمت تھا چوبیس سال کی

میں اس نے وہ حاصل کیا کہ کسی نے کم حاصل کیا ہو گا۔

آٹھ سال کی عمر میں ایسا مغلوک الحال ہو گیا تھا کہ ہمارے حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ جو محبت مجھے صادق سے ہے وہ کسی سے نہیں۔ فرزند موصوف نے ولایت موسوی کو نقطۂ آخر تک پہنچا دیا تھا اور اس ولایت علیہ کے عجائب و غرائب بیان فرمایا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ فروتن، تواضع، ملتجی، متضرّع اور متذلل و منکسر رہا کرتا۔ وہ فرمایا کرتا کہ اولیا میں سے ہر ایک نے حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ سے ایک چیز مانگی ہے میں نے التجا و تضرّع مانگی ہے۔"